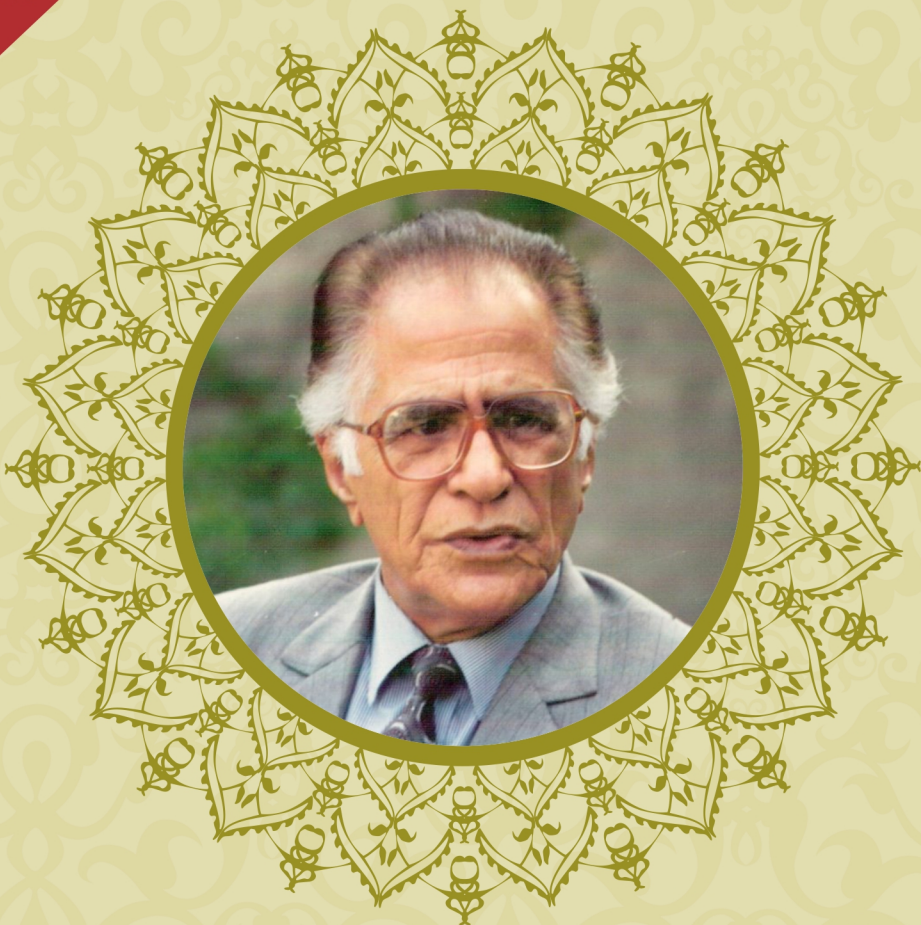


ترتیب و اضافہ شدہ ایڈیشن

پاکستانی ادب کے معمار



احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر ناہید قاسمی

اکادمی ادبیات پاکستان

# پاکستانی ادب کے معمار

احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن  
(ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن)



# پاکستانی ادب کے معمار

احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن  
(ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن)

ڈاکٹر ناہید قاسمی



اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر 1/H-8، اسلام آباد



کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی محفوظ ہیں۔

اس کتاب کے متن کا کوئی بھی حصہ نقل یا استعمال نہیں کیا جاسکتا، سوائے حوالے کے۔  
خلاف ورزی پر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا استحقاق رکھتا ہے۔

نگران اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
نگران منصوبہ و طباعت	:	علی یاسر
تحریر	:	ڈاکٹر ناہید قاسمی
نظر ثانی	:	ڈاکٹر محمد قاسم
اشاعت اول	:	2009
اشاعت دوم	:	2018
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد:-/440 روپے
	:	غیر مجلد:-/420 روپے

**ISBN: 978-969-472-316-7**

Pakistani Adab Kay Maimar  
**Ahmed Nadeem Qasmi : Shakhsiyat-aur-fun**

Written By  
**Dr. Naheed Qasmi**

Publisher  
**Pakistan Academy of Letters**  
Islamabad, Pakistan

## فہرست

9	• پیش نامہ	ڈاکٹر محمد قاسم بکچو
11	• پیش لفظ	ڈاکٹر ناہیدہ قاسمی
19	• باب اول — غر حیاتِ ندیم	
49	• باب دوم — ندیم آئیے	
49	☆ یومِ پیدائش	
49	☆ نام	
51	☆ پرورش	
52	☆ سراپا	
55	☆ قبیلہ	
55	☆ مادری زبان	
55	☆ عقیدہ	
57	☆ خاندان	
58	☆ رشتے	
63	☆ تعلیم	
66	☆ شادی	
68	☆ ملازمتیں	
71	☆ ادارتیں	

73	☆	قید و بند
75	☆	استاد و رہنما
77	☆	دوست
78	☆	پسندیدہ شخصیت
79	☆	اختلاف
93	☆	اخلاق و کردار
94	☆	مزاج
96	☆	سلیقہ
97	☆	عفتگو
99	☆	محفل
100	☆	محبت
103	☆	انسانیت و آفاقیت
105	☆	افکار
107	☆	نظریہ فن، نظریہ حیات
112	☆	سعی و کامیابی
114	☆	جرات و حق گوئی
118	☆	رجائیت
119	☆	وطنیت
123	☆	تحریک پاکستان
125	☆	ترقی پسندی
131	☆	عوام نمائندگی
132	☆	ادبیت
137	☆	مقام انفرادیت و اہمیت (شخصی و ادبی)
143	☆	کمی اور فروگزاشت



☆	غزل-----جیسے ہی تو جدا ہوا، وقت کا وار چل گیا	269
☆	غزل-----تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے	270
☆	غزل-----روشنی کا افق شب پہ اشارہ کیوں ہے؟	271
☆	غزل-----میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا	272
☆	غزل-----مداوا جس کا ہونے لگا آہستہ آہستہ	273
☆	غزل-----تکھے کھو کر بھی تکھے پاؤں، جہاں تک دیکھو	274
☆	غزل-----جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی	275
☆	نظم-----نیا سال	276
☆	نظم-----چوگا	277
☆	نظم-----ایک درخواست	278
☆	نظم-----یہ کیا گونج ہے؟	279
☆	نظم-----دائرے	280
☆	نظم-----بولنے دو	281
☆	نظم-----وہ جو اک چیز ہے	282
☆	نظم-----مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا	283
☆	افسانہ-----پریش سرنگھ	284
☆	فکاہی کالم----- (چند اقتباس)	303

☆	حواشی	307
☆	کتابیات	326
☆	پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی فہرست	329

## پیش نامہ

پاکستانی ادب کے معمار، اکادمی ادبیات پاکستان کا اہم اشاعتی منصوبہ ہے۔ اس سلسلے کے تحت ان شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت اور فن پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں جنہوں نے ساری زندگی پاکستانی ادب کے فروغ میں بسر کی اور ادب پر دائمی اثرات مرتب کیے۔

پاکستانی ادب کے معمار اشاعتی منصوبے کی ایک کتاب ”احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن“ اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر ملک کی معروف ادیبہ و شاعرہ ڈاکٹر ماہد قاسمی نے لکھی تھی جو ۲۰۰۹ء میں شائع کی گئی۔ یہ کتاب اسٹاک میں موجود نہیں تھی اور اس کے تراجم و اضافہ جات پر مشتمل نئے ایڈیشن کی بہت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ محققین اور طالب علم خصوصی طور پر اس کتاب کا تقاضا کر رہے تھے، یہ اس کتاب کا تراجم و اضافہ جات پر مشتمل نیا ایڈیشن ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ ڈاکٹر ماہد قاسمی نے انتہائی محنت سے اضافہ جات کیے ہیں۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری احمد ندیم قاسمی کی فن و شخصیت سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

احمد ندیم قاسمی پاکستان کے عہد ساز شاعر، افسانہ نگار، ادیب، نقاد اور مدیر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بطور ادیب ان کی کئی جہتیں ہیں۔ شاعر کے طور پر انہوں نے ادب کو گراں قدر شاعری کے کئی مجموعے دیے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے متعدد مجموعے افسانوی ادب میں مسلم اہمیت رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحب اسلوب کالم نگار کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں ان کی ایک اور انفرادیت بطور مدیر ”فتون“ کی ہے، وہ نہ صرف ”فتون“ کے مدیر

رہے بلکہ ”ادب لطیف“ اور ”نقوش“ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کے لیے بھی گراں قدر تصنیفی خدمات انجام دیں۔ ان کے کالم ہماری معاشرتی زندگی کے بھرپور عکاس ہیں اور ان سے پاکستان کی معاشرت اور سیاست کی عمدہ تصویر کشی ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سرکردہ لکھاری کے طور پر انھوں نے ہمیشہ عام آدمی کے حقوق اور فلاح کے لیے قلم اور آواز اٹھائی۔

کتاب کی تحریر اور تراجم و اضافہ جات کے لیے ہم ڈاکٹر ماہید قاسمی کے شکر گزار ہیں۔ معروف دانش ور اور محقق ڈاکٹر محمد قاسم نے اس کتاب کی نظر ثانی کی ہے جس پر ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔ ہمارے رفیق کار، اشاعتی منصوبے پاکستانی ادب کے معمار کے نگران اور افسر مطبوعات علی یاسر بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے کتاب کی تکمیل و اشاعت میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ یہ کتاب احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ”پاکستانی ادب کے معمار“ کی کتاب ”احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن“ کے تراجم و اضافہ جات پر مشتمل ایڈیشن کو بھی بہت پسند کیا جائے گا۔

**ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو**

چیئر مین اکادمی ادبیات پاکستان



## پیش لفظ

میں درج ذیل آراء سے متفق ہوں  
ڈاکٹر طاہرہ اقبال کہتی ہیں:

”احمد تیم قاسمی نے عمر بھر میں جو کچھ لکھا اس سے کہیں بڑھ کر وقت، ریاضت، ادراک  
ذہنی و ادبی افق کی کشادگی، اُن کے لکھے پر لکھنے کے لیے درکار ہے۔ احمد تیم قاسمی کے  
فن پر کچھ کہنا بھی اک عمر کی ریاضت مانگتا ہے۔ ان کا ہر جملہ، ہر سطر ایک مضمون کی  
گنجائش چاہتا ہے۔ اُن کی لکھی ہر کہانی میں ایک ان لکھی کتاب موجود ہے اور ہر کتاب  
کے اندر وہ جہانِ فن، جس کی سیاحت کے لیے نقدِ عمر کم پڑتی دکھائی دیتی ہے۔“

(”ادبیات“۔ دسمبر 2006ء۔ ص: 178)

بقول افتخار نسیم:

”احمد تیم قاسمی کے بارے میں لکھنے کے لیے احمد تیم قاسمی جیسا CALIBRE چاہئے۔“  
جب کہ تیم صاحب نے جو کچھ سالک صاحب کی شخصیت پر لکھتے ہوئے محسوس کیا۔ خود اُن کے  
بارے میں لکھتے ہوئے میری بھی وہی کیفیت ہے:

”شروع ہی میں بتا دوں کے میں سالک صاحب کی شخصیت کو ان چند صفحات میں  
سمیٹنے سے قاصر رہوں گا۔ اس عجز کے اعتراف ہی میں خیریت ہے کیوں کہ جس  
شخصیت میں مشرق کا کلچر مجسم ہو گیا ہو، اس کا کما حقہ احاطہ کرنا میرے بس کی بات  
نہیں اور جس طرح ایشیائی کلچر کی ان گنت، ایک سے ایک دل آویز اور موتیوں کی  
طرح جگمگاتی ہوئی پرتیں ہیں، اسی طرح سالک صاحب کی شخصیت کے بھی بے شمار

پہلو ہیں اور اگر میں ان سب کا ذکر کرنے بیٹھوں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کر رہا ہوں۔“

(”میرے ہم سفر“۔ اساطیر 2002۔ ص: 17)

اور نامور نقاد و محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ:

”اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل ادب اُن کے سارے تخلیقی و تنقیدی کاموں کا جائزہ لے کر معرضی انداز میں، تاریخ ادب اردو میں اُن کا مقام متعین کریں۔ احمد ندیم قاسمی بڑے ادیب، بڑے شاعر اور بڑے افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے اردو ادب کو زندہ رہنے والی کہانیاں دی ہیں۔ انھوں نے شاعری میں بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اب انھیں پھر سے دُہرانے اور سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے کاموں ہی سے زندہ رہے ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔“

(”معاصر“۔ مارچ 2008۔ ص: 47)

ایسے میں حقیقت یہ ہے کہ پورے ندیم سمندر کو ڈیڑھ سو، ڈھائی سو صفحات میں سمیٹنا میری ہمت سے بڑھا ہوا تقاضا تھا جو اکادمی ادبیات نے مجھ سے کیا کہ میں 90 برس کے ایک طویل سفر حیات اور 75 سالہ تخلیقی ادبی ہمہ جہت شخصیت کی خدمات اور کارہائے نمایاں کا جائزہ کم سے کم الفاظ اور تھوڑے سے تھوڑے وقت میں لوں۔

اپنے ابا جی (احمد ندیم قاسمی) کے اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقلی کے بعد مجھے تین تین صدموں کا سامنا تھا۔ ایک اپنے نہایت شفیق والد گرامی سے جدائی کا دکھ، دوسرے میں اُن سے اپنی امی جی کا پیار بھی پائی تھی۔ جس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ اور تیسرے اپنے نہایت پسندیدہ شاعر اور ادیب اور بہت ہی پیارے انسان کے ساتھ کی محرومی۔ اپنے ابا جی مجھے جب یاد آتے ہیں میں اُن کی تصاویر دیکھ لیتی ہوں اور اُن کے انٹرویو پڑھ کر محسوس کرتی ہوں کہ وہ اپنی گہمیر آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ جب کہ اپنے شاعر ادیب ندیم کی کتابیں ایک بار بھر اور زیادہ توجہ سے پڑھنے لگی لیکن میں ان صدموں سے نکل نہیں پائی تھی کہ ایسے میں مجھے ان پر کتاب لکھنے کا کہا گیا۔ میں سمجھتی تھی ابھی فوری طور پر میں ایسا نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے اس کے لیے ابھی مناسب وقت چاہئے تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے اصرار پر سوچا، جتنا اب تک اُن کے بارے میں لکھا گیا اور جو لکھا جا رہا ہے اُس میں سے مدد لیتی

ہوں۔ میں نے کوئی بھی اہمیت یا یونہی رواروی میں نہیں چنا بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اسے بہت اہم محسوس کر کے ہی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

میں ابھی سوچ میں تھی کہ اکادمی کی طرف سے کتاب کا طے شدہ FORMAT اور ابواب کا خاکہ بھجوا دیا گیا۔ اس کے مندرجات دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ تنقید اور تجزیے سے زیادہ یہ تو ”پاکستانی ادب کے معمار کا تعارف اور خدمات کی تفصیل“ ہے۔ اکادمی کا بھجوا دیا ہوا خاکہ پیش ہے:

”پاکستانی ادب کے معمار کا خاکہ

ابواب :- حالاتِ زندگی - تاریخِ پیدائش - تعلیم، ضروری زندگی نامہ.....

2۔ ادبی خدمات..... 3۔ تصانیف..... 4۔ مطبوعہ کتب اور فکروفن پر مبنی کام کی تفصیل

5۔ تصانیف کے حوالے سے مختصر تبصرہ یا تنقیدی جائزہ..... 6۔ ناقدین کی آرا

7۔ کتابیات..... 8۔ حواشی“

اکادمی نے 1990 سے ”پاکستانی ادب کے معمار“ کے عنوان سے اس کتابی سلسلے کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلے کی کچھ کتب کے مطالعے اور دینے گئے خاکے پر خوب غور کرنے کے بعد میں لکھنے پر آمادہ ہو گئی۔ کیوں کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میں اپنے لبا جی کا تعارف بخوبی کروا سکتی ہوں اور یہ بھی کہ حُسنِ انتخاب اور حُسنِ ترتیب کے لیے اچھی کوشش کر سکتی ہوں.....

تب سوچا کہ اپنی رائے کی تائید میں، اُن سب نے جنہوں نے ندیم پر اور اُن کے فن پر لکھا ہے، اہم شعرا، ادبا، ناقدین، محققین، اہل ذوق قارئین شعر و ادب اور سچے طلباء کی آرا کے ذریعے دینے گئے خاکے کے تقاضوں کے مطابق یہ تعارف پیش کروں..... اب مجھے ندیم صاحب کی شائع شدہ پچاس سے زائد کتاب اور بچپن سے زائد شائع ہونے کے قریب کتب کے میٹریل اور ”فنون“ کے 126 شمارے اور ہزاروں کالم..... ان سب کے بارے میں ریسرچ اور پھر اس کے جائزے اور ندیم پر کیے گئے تحقیقی کاموں کی پرکھ کو سمیٹنا تھا ایسے میں میری خواہش بقول سلطان باہو یہ تھی کہ ”لوں لوں میرا چشماں ہووے۔ ہک کھولاں ہک کجاں ہو۔“ بہر حال اس سب کا اتنے کم وقت اور اتنے تھوڑے صفحوں میں سمانا مشکل ہی نہیں کچھ ناممکن سا لگتا تھا لیکن جب ارادہ کر لیا تو کوشش بھی جاری رکھی اور اب پانچ ماہ میں اپنے پیارے والد کی جدائی کے صدمے کو ہمراہ لیے اپنی جاب، اپنے اہل خانہ اور اپنے گھر کی ضروری مصروفیات کے ساتھ ساتھ، وقت کو بے تکلف نگل جانے والی بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے باوجود، یہ کتاب

مکمل کر لی ہے۔ الحمد للہ۔

کتاب آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اس کے چار ابواب طے کیے ہیں اور ان میں اپنی طرف سے بہت کچھ سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ باب اول میں ندیم صاحب کے سفر حیات کے بارے میں اختصار سے لکھا ہے۔ باب دوم میں ندیم کی شخصیت اور ان کے فکرو فن کے بارے میں اہم اہم مقابلات، مختلف ذیلی عنوانات کے تحت درج کیے ہیں۔ باب سوم میں ندیم کے کام کی کچھ تفصیل اور اس پر کچھ تنقید ہے۔ اور باب چہارم میں تخلیقات ندیم کا ایک مختصر سا انتخاب بھی شامل ہے۔ آپ کو یہ معمول کی تنقیدی کتاب کے برخلاف مختلف انداز کی کتاب محسوس ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میں با ذوق قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے مختلف ہموار راستے اور واضح پگھلاؤ یاں ضرور ہیں۔ جن میں سے ہر ایک پر آگے سے آگے چل کر آپ ندیم نگری کے کسی بھی گوشے کو مزید گہرائی تک اور خود اپنی مرضی اور دانش کے ذریعے پرکھ سکیں گے۔

ندیم صاحب پر یہ کتاب ایک طرح سے پوری دنیا کے اردو دانوں کی آرا پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں چند اہم مقابلات کسی نہ کسی وجہ سے اور موقع کی مناسبت سے ڈہرائے بھی گئے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں صرف نامور لوگوں کا ہی حوالہ نہیں دیا بلکہ نقادوں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ طلباء اور قارئین کی اہمیت رکھنے والی آرا (بہت سی آرا میں نسبتاً زیادہ مختلف سی دل کو لبھا جانے والی، سوچنے پر مائل کر دینے والی اور وزن رکھنے والی آرا) کو بھی شامل کیا ہے، کیوں کہ ندیم صاحب کسی ایک مخصوص طبقے میں محدود نہیں ہیں۔ وہ تو سب ہی کے ندیم ہیں۔ خواص کے بھی اور عوام کے بھی، پاکستان کے بھی اور ملک سے باہر کے خوش ذوق لوگوں کے بھی۔ اسی لیے ان کے بارے میں اپنی رائے رکھنے کا حق ہر پڑھنے والے کو حاصل ہے۔ جب کہ نامور ادیب اور دانشور شفاق احمد کا کہنا ہے:

”میں سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب کو خدا نے ایسی برتری و دیعت کی ہے جو بڑی مشکل سے اور خال خال ہی لکھنے والے کو..... کری ایڈیو آرٹسٹ کو نصیب ہوتی ہے۔ ہر ملک، ہر بستی، ہر معاشرہ اور ہر قوم کا ایک ادیب ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس قوم، اس معاشرے میں بڑے بڑے کام کرنے والے، بڑے بڑے نام والے، منفرد حیثیت رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں قوم، معاشرہ ایک ادیب کو، ایک شاعر کو طے کر لیتا ہے کہ ”یہ ہمارا نمائندہ ہے۔“ تو ہمارے ملک کا نمائندہ ادیب جو ہے اور اس



میں نمائندہ شاعر بھی شامل ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کی ذات، اُن کا کلام، اُن کی شخصیت، اُن کی تحریر ہے۔ من حیثیت المجموع سب کچھ اس میں شامل ہے۔ پھر ایک اور خصوص نصیبی اُن کے حصے میں آئی ہے کہ اللہ نے اُن کو طبیعت ایسی دی ہے جو ایک کری ایٹیو آرٹسٹ کا طرہ خاص ہے۔“

(اے ٹی وی۔ 10 جولائی، 2008 کی شب کو دکھائے جانے والے ندیم پروگرام کے دوران دی گئی رائے جو پہلے سے ریکارڈ شدہ تھی۔)

ندیم پر کیے جانے والے کام کا جائزہ بھی ایک وسیع موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ندیم کے بارے میں لکھی کتب پر تبصرے کی ذیل میں ہر کتاب پر مناسب تبصرے کے لیے بھی کئی صفحات چاہئیں۔ جب کہ اس کتاب میں تو صرف چند جھلکیاں، چند لہریں سمیٹنا ہیں اس قابل قدر کام کی جو ندیم نے کیا اور جو اہم کام ندیم پر ہوا۔ اب یہ دعوت ہے اہل ہنر ماقدین، محققین کے لیے کہ وہ اس ندیم سمندر کی وسعت اور گہرائی کو اپنی قابل لحاظ صلاحیتوں کے ذریعے پالیں۔ کیوں کہ مجھے یہ نہیں چننا کہ کیا بہت اچھا ہے اور کیا کم اچھا ہے۔ مجھے تو صرف یہ بتانا تھا کہ کتنا اہم کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ یوں بھی جیسا کہ پہلے کہا کہ یہ تنقیدی کتاب نہیں بلکہ تعارفی کتاب ہے اور میں اس میں اہل اور نامور نقادوں کا حق چھیننے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ جنہوں نے ندیم کے فن پاروں کو پرکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ ان میں کیا کیا اور کیسے کیسے نہیں پیش کیا گیا بلکہ ان کی انفرادیت کو جانچتے ہوئے یہ طے کرنا ہے کہ ندیم نے اردو ادب کے سرمائے میں کیا کیا اضافے کیے ہیں۔ یہ اہم کام ان ہی کے سپرد ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ ندیم شناسی کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کے انٹرویو بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ ان میں سے بیشتر ریکارڈ کر لیے گئے تھے اور محفوظ ہیں، جب کہ بہت سوں کو ندیم صاحب نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر جوابات دیئے۔ یوں وہ بھی مستند ہیں۔ آخری دنوں میں ویڈیو انٹرویو بھی ریکارڈ ہوئے..... سو یہ سب کے سب انٹرویو اس لیے اہم ہیں کہ یہ ندیم صاحب کی HIGHLY ALERT دانش اور بے تکلف گفتگو پر مشتمل ہیں۔ ان میں اُن کے اصل بے ساختہ خیالات اور اُن کے بات چیت میں برتے اپنے دوست الفاظ ہیں جن میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی گئی۔ ان انٹرویوز میں ذہانت، تہذیب، حاضر دماغی، بذلہ سخی، خوش گفتاری، حقائق کا بیان اور جرأت اظہار ہے۔ مسائل پر غور و فکر اور ان کے حل تجویز کرنے کا رجحان ہے۔ غرض یہ کہ ان پر کشش انٹرویوز میں سب کچھ ہے۔

ندیم صاحب واقعی درویش صفت انسان تھے۔ وہ زندگی اور اُس کے حُسن کے قدردان تو تھے لیکن انھیں زیادہ کا حرص اور عیش و آرام کا لالچ نہیں تھا، جب کہ وہ ضرورت زندگی خود اپنے دستِ محنت سے پوری کر لیتے۔ وہ کبھی چھینٹے نہیں تھے لیکن اپنا کچھ چھیننے بھی نہیں دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہا بانٹ دیا۔ چاہے وہ ان کا قیمتی وقت ہی کیوں نہ تھا، کیوں کہ ان کا پختہ یقین اس میں تھا کہ سکھ سب میں برابر تقسیم ہونا چاہئیں۔

یہ درست ہے کہ ندیم صاحب نے اُردو ادب کو اپنی تخلیقات اور تحریروں اور ادواتوں کا قیمتی خزانہ دیا ہے۔ اس سب کے پہلو بہ پہلو میرے نزدیک انھوں نے کچھ ”زندہ جیتے جاگتے مقالے“ بھی تیار کیے ہیں۔ مثلاً تسنیم سلیم چھتاری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ادا جعفری، پروین شاکر، منصورہ احمد، نیلو فر اقبال، رفعت مرتضیٰ، فرحت پروین اور کئی مشہور قلم کار خواتین کے ساتھ ساتھ محمد خالد اختر، محمد کاظم، ساقی فاروقی، شکیب جلالی، احمد فراز، امجد اسلام امجد، خالد احمد، علی تنہا، سبط علی صبا، نجیب احمد، گلزار، ایوب خاور اور دیگر کئی نامور فن کار اس طویل فہرست میں شامل ہیں۔

ندیم صاحب نے اپنے پہلے شعری مجموعے ”جلال و جمال“ کا دیباچہ وادی سون سکیر (ضلع خوشاب) کے اپنے گاؤں انگلہ میں بیٹھ کر 13 ستمبر 1946 کو مکمل کیا۔ اُس کے ساٹھ برس بعد اپنے آخری مجموعہ کلام ”ارض و سما“ کا دیباچہ بھی غالباً انھوں نے انگلہ ہی میں بیٹھ کر ستمبر 2006 میں لکھنا چاہا تھا۔ اپنی اس طرح کی تمنا کا ذکر انہوں نے بارہا کیا کہ کاش آخر عمر میں انگلہ کے اپنے چھوٹے سے پرسکون مکان کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر، جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، لکھوں مثلاً کم از کم ایک ناول، ایک طویل تر نظم اور اپنی سوانح اور اس کھڑکی کے پار سامنے دور تک پھیلی سرسبز وادی، تہہ در تہہ کھیت، سرمئی پہاڑوں کی قطاروں کے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہوں اور مہکتی ہواؤں کے صاف ستھرے ہر دم تازہ دم جھونکے لہراتے ہوں۔ لیکن۔۔۔ (کاش ہم ان کا جسدِ خاکی ہی انگلہ کی زمین کے سپرد کر سکتے!)

مولانا غلام رسول مہر صاحب کا یہ جملہ ندیم صاحب کے فنی اور فکری کمال کے حق میں دی جانے والی آرا کا نچوڑ ہے کہ: ”ندیم کی شاعری میں ایسی زندہ ہڑپ پائی جاتی ہے جو دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر روح کے عمل میں ہنگامہ پیدا کر دیتی ہے۔“ واقعی ایسا ہی ہے۔ مجھے بھی ندیم کے کبھی شہ پاروں میں جس منفرد نمایاں ترین خصوصیات نے بے حد متاثر کیا وہ اُن کی سچی تڑپ ہے اور ہمدردانہ رویہ جو ندیم کی خلوص نیت کی وجہ سے ہی نمایاں تر ہے اور میرے نزدیک فن کی اثر انگیزی کے لیے اعلیٰ ترین صفت خلوص نیت ہی

ہے..... باقی سب کچھ اس کے بعد آتا ہے۔ کچھ اہم شعرا کا کلام محبت کے نغموں اور انقلاب کے جذبے سے دلوں کو گرمادیتا ہے جب کہ ندیم کے تہہ دارا شعرا و افکار دل و دماغ کی انتہائی گہری بہت حساس تہوں کو چھو آتے ہیں۔ ایک چنگی سی بھر لیتے ہیں اور اس کا درد سہنا تو اہل دل و احساس اور اہل فکر و نظر ہی کے حصے میں آتا ہے۔ وہ اس درد کی ثروت مندی سے بھی محروم نہیں رہتے، جو انھیں ہر دم جگائے رکھتا ہے اور باخبر و باشعور رہنے میں مدد دیتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اگر کوئی بیدار رہنا چاہتا ہی نہ ہو تو.....!

اس کتاب کے لیے میں نے جن کتب و رسائل و جرائد سے اور جن محترم ہستیوں کی گفتگو اور تحریروں سے امتیازات کی مدد لی ہے، میں ان کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس کتاب کے تشکیل پالینے کے سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین اور دیگر متعلقہ معززین اراکین کے تعاون کی بھی شکرگزار ہوں۔ میں نور آپا، سلیم بھائی، نعمان بھائی، حیات صاحب، سلمیٰ صدیقی صاحبہ، پروفیسر سجاد شیخ صاحب اور ڈاکٹر محمود ناصر ملک صاحب کی ممنون ہوں کہ میری درخواست پر ندیم معلومات کے سلسلے میں مجھے اپنا قیمتی وقت دیا۔

میں خاص طور پر اپنے بیٹے نیر حیات قاسمی کی شکرگزار ہوں کہ اُس نے اس دوران جب بھی مجھے ہمت ہارتے دیکھا یا میرا حوصلہ ٹوٹا یا محسوس کیا تو فوراً میری ہمت بھی بڑھائی اور مجھے حوصلے کا سہارا بھی دیا۔ یہ کتاب میں نیر بیٹے کے نام کرتی ہوں۔ جیتے رہو میرے بیٹے! سدا سکھی رہو۔ میں اپنی بیٹیوں نصیبہ، نلیم اور ناموس کی پیار بھری ان تھک مدد سے بھی سرشار ہوں۔ میری اچھی بیٹیو! شاد رہو آبا درہو!! آمین

میرے اپنے ابا جی!..... آپ کی بھرپور شفقت، تربیت اور ہمیشہ ساتھ دینے والی رہنمائی کا بے حد شکریہ..... اور سب سے بڑھ کر میں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے مجھے احمد ندیم قاسمی کی بیٹی ہونے کا رتبہ عطا فرمایا..... اللہ ہمیشہ ہم سب کا حامی و ناصر اور رہبر و رہنما ہو۔ آمین ثم آمین۔

**ڈاکٹر نازہ ہید قاسمی**

نمن آبا دلاہور

نومبر 2007



## پیش لفظ (طبع دوم)

”احمد ندیم قاسمی“ صدی (1916-2016) کے سلسلے میں اکادمی ادبیات پاکستان اس کتاب کے اس نئے ایڈیشن کا اہتمام کر رہی ہے (میں نے ضروری ترمیم و اضافہ کر دیا ہے۔) اس کتاب کا بنیادی مقصد نسل نو اور نئی ریسرچ کرنے والوں کو پاکستانی ادب کے ایک معمار احمد ندیم قاسمی کے فن و شخصیت سے متعارف کروانا ہے۔ میں نے اس میں اپنی تحقیق و تنقید، معلومات اور اپنے کچھ اقتباسات بھی دیے ہیں جب کہ ترجیحاً صائب الراءے اور ندیم فہم مستند اہل قلم کے اہم، قابل اعتبار و قابل قدر اور منفرد اقتباسات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ دیگر با ذوق اور علم و ادب دوست افراد کی آراء بھی شامل کی ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی کے ہمہ جہت فن پاروں میں سے ایک مختصر سا انتخاب بھی اس ایڈیشن میں شامل ہے۔) مزید معلومات کے لیے دیے گئے حوالہ جات کے مطابق، متعلقہ کتب و رسائل کے تفصیلی مطالعے اور احمد ندیم قاسمی کی ویب سائٹ ([www.ahmednadeemqasmi](http://www.ahmednadeemqasmi)) سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اُمید ہے پہلے کی طرح اب بھی یہ کتاب مفید رہے گی۔ اس کتاب کی طباعت دوم کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان کے خوش ذوق چیئرمین ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو، جناب علی یاسر اور دیگر متعلقہ معزز اراکین کی بے حد شکرگزار ہوں۔

ڈاکٹر ناہیدہ قاسمی

F2-251۔ واپڈ اناؤن لاہور

## باب اول

### سفرِ حیاتِ ندیم

سفرِ حیات کے موڑ پر میں یہ سوچ کر بھی رُکا نہیں  
کہ پاؤں میرے چلے ہوئے، مرا راستہ ہے تپا ہوا

(ندیم)

صرف بائیس برس کی عمر میں ندیم کا پہلا افسانوی مجموعہ ”چوپال“ (1939) شائع ہوا تھا۔ جب کہ 1941 میں چوبیس برس کی عمر میں ندیم کا پہلا شعری مجموعہ ”دھڑکنیں“ (قطعات) شائع ہوا۔ اسی کو اضافے کے بعد 1944 میں ”رم جہم“ (قطعات و رباعیات) کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ اپنے عہد کی نامور ادیبہ تسنیم سلیم چغتاری ”رم جہم“ پر رائے دیتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

”تاثر کہتے ہیں کہ جو پڑھا لکھا آدمی ندیم کو نہیں جانتا، اس کا ادبی ذوق محلِ نظر ہے اور جو اردو دان اُن کے نام سے واقف نہیں اُس کی معلومات ناقص ہیں۔ لہذا مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ سب ندیم کو جانتے ہیں۔“ (1)

جب کہ 2006 میں ڈاکٹر جمیل جالبی تحریر کرتے ہیں کہ:

”10 جولائی 2006 کو اردو زبان و ادب کے عظیم شاعر و افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی ہم سے جدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُس وقت اُن کی عمر نوے برس تھی۔ وفات سے چند دن پہلے تک وہ پوری طرح زندہ تھے۔ چہرے پر وہی مسکراہٹ، بات میں وہی مٹھاس، لہجے میں وہی شائستگی، وضع داری اور رکھ رکھاؤ میں وہی خلوص اور سلیقہ جو ساری عمر اُن کی پہچان رہا، پوری طرح موجود تھا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کا وجود اُن کے چاہنے والوں کے لیے ایک ایسا بینارہ نور تھا جو نہ صرف ان کی زندگیوں کی رہنمائی کرتا تھا بلکہ ظلمتوں میں تیز اجلی روشنی بھی فراہم کرتا تھا..... ساری عمر شعر و ادب

ہی اُن کا اُوڑھنا بچھونا بنا رہا۔ اس سطح پر اُنہوں نے کبھی کبھوتہ نہیں کیا۔ انسان، انسان دوستی اور انسانیت کا احترام ساری عمر اُن کا مسلک رہا۔ اسی انداز نظر نے اُنہیں ہمیشہ تازہ دم رکھا..... احمد ندیم قاسمی کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی بڑے تھے اور شاعر بھی بڑے تھے۔ تخلیق ادب کا یہ ایسا کرشمہ ہے کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔“ (2)

احمد ندیم قاسمی صاحب کو طویل عمر حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُنہوں نے آخری لمحے تک شادابی ذہن کے ساتھ تخلیق فن کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن کی زندگی ہی میں اُن کی ادبی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا اور اُن کی عظمت کو تسلیم کر لیا گیا۔ یوں اُنہیں بھرپور احترام اور قدر افزائی بھی ملی۔ یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ اُنہوں نے آخر تک روزگار اور معاش اپنی محنت سے کمایا۔ اس طویل سفر حیات کے متعلق اس مختصر کتاب میں جائزہ سمینے کے لیے، اپنی سہولت کی خاطر، ندیم صاحب کے عرصہ حیات کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ (1916 تا 1935)۔ 20 ویں برس تک:

(بچپن سے نوجوانی۔ تعلیم و تربیت۔ شاعری و افسانہ نگاری کا آغاز۔ ابتدائی ملازمتیں۔)

2۔ (1936 تا 1955)۔ 40 ویں برس تک:

(شخصی اور فکری و فنی نکھار کا سلسلہ۔ تحریک آزادی، وطن میں حصہ اور حصول آزادی۔)

ترقی پسند تحریک سے وابستگی۔ شادی اور بیوی بچوں کی ذمہ داریاں۔)

3۔ (1956 تا 1975)۔ 60 ویں برس تک:

(ملک میں اور بیرون ملک منفرد شناخت نمایاں تر ہوئی۔ شاعری، افسانہ، تنقید، کالم نگاری میں)

رواں دواں، رسالہ ”فتون“ کا اجراء و ادارت۔ سقوط ڈھاکہ کا صدمہ۔

قومی و بین الاقوامی حالات کا مد و جزر۔ سدابہارا امید باقی۔)

4۔ (1976 تا 1995)۔ 80 ویں برس تک۔

(اعترافِ عظمت، حصول احترام و استحسان۔ بڑے بڑے دکھ سکھ ساتھ ساتھ۔)

5۔ (1996 تا 2006)۔ 90 ویں برس تک۔

(بے حد قدر افزائی لیکن کچھ لوگوں کے بدلتے رویوں اور ریاکاری سے پریشانی۔ ڈائریکٹر

مجلس ترقیء ادب کی پوسٹ کوتاڑے بیٹھے حریص لوگوں کی زیادتیاں۔ ملازمت کے  
 بکھیرے۔ طویل عمری کی آزمائش۔ لیکن اپنے مقام پر ہمت، حوصلے اور وقار کے ساتھ  
 آخر تک ڈٹے رہے۔ انھوں نے جو خم کھایا تھا، سینے پر کھایا تھا)  
 آئیے! اب اس طویل سفر حیات کے مختلف روشن سنگ میل دیکھتے ہوئے مدحیم صاحب کے ساتھ  
 ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

صدیوں پہلے تبلیغ اسلام کے لیے عرب سے روانہ ہونے والے علما کے خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ،  
 ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا ملتان آکر بس گیا۔ اُن میں سے کچھ منتخب افراد کی ایک تبلیغی جماعت  
 شہری آبادیوں سے دور، وسیع میدانوں کے پار، اونچے نیچے ٹیلوں سے آگے، کوہستان نمک کے سلسلے کے  
 ایک تنکھی چوٹی والے بلند و بالا پہاڑ ”ساکی سر“ کی گود میں کھٹی وسیع جھیل کے کنارے وادی میں بچنی۔

عالمی محققین کے مطابق:

”وادی سون سکیر“ پانی سے باہر آنے والی دُنیا کی پہلی خشکی ہے۔ یعنی دُنیا کی قدیم  
 ترین وادی ہے۔ روئے زمین پر پھیلے سمندر کے اس پہلے اور واحد کنارے کا  
 ثبوت ”کوہستان نمک“ ہے..... بتایا جاتا ہے کہ مہا بھارت کی جنگ بھی یہاں ہی لڑی  
 گئی تھی۔ یہ وادی بدھ مت کی تہذیب کا مرکز رہی ہے اور سکندر اعظم نے اپنی پہلی  
 چھاؤنی بھی یہاں ہی ڈالی..... یہاں کی چٹانیں اپنی عمر کم از کم پچپن کروڑ سال بتاتی  
 ہیں اور ان پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ ماہرین ارضیات نے اس وادی کو ارضی علوم کا عجائب  
 گھر قرار دیا ہے۔“ (3)

بقول احمد مدحیم قاسمی، یہ وادی سون سکیر:

”کوہستان نمک کے اس پست مگر زرخیز و شاداب سلسلہ کوہ میں واقع ہے، جو مغرب  
 میں دریائے سندھ کے کناروں سے ابھر کر مشرق میں پنجاب کے اضلاع میانوالی، شاہ  
 پور (سرگودھا)، جہلم اور کجرات میں سے گزرتا ہوا کوہ ہمالیہ کے جنوب مغرب میں ایک  
 نیلی قوس کی طرح ایستادہ ہے اس پہاڑ کے جو حصے آبادیوں سے کچھ دور ہیں وہ پست  
 قد (مگر خوشبودار) درختوں سے پٹے ہوئے ہیں۔“ (4)

”جب باہر ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو ملتان کے چند بزرگوں کو علاقہ سون سکیر کے صنم پرستوں کو تدریس و حید کے لیے منتخب کیا۔ ان حضرات میں میرے ایک بزرگ بھی شامل تھے۔ سکیر پہاڑ کے قدموں میں ایک بہت بڑی جھیل آئینے کے فرش کی طرح چمکی ہوئی ہے اور اس کے آس پاس منحنی منحنی ڈھیریاں کھڑی ہیں۔ ان بزرگوں نے جھیل کے مشرق میں ایک پہاڑی پر ”اسلام آباد“ کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مغلوں کے زمانے میں نہایت وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد نادر شاہ درانی کی یلغار کے دنوں میں انھیں (اپنے افراد خانہ کے ہمراہ) یہ گاؤں خالی کرنا پڑا اور وہ شمال مغربی پہاڑوں کی گچھاؤں اور جنگلوں میں چھپ گئے۔ جب درانی واپس ہوا تو یہ اپنی پناہ گاہوں سے نکلے۔ اسلام آباد وائٹ چکا تھا۔ اس لیے اس کے شمال مشرق میں ایک اور پہاڑی پر موجود گاؤں انگلہ (آں گاہ) آباد کیا۔“ (5)

”..... تا کہ آئندہ کوئی حملہ آور اس طرف متوجہ ہو تو فوراً پھیلی پہاڑیوں میں منتقل ہو کر اس کا مقابلہ کیا جاسکے.....“ ”انگلہ“ اب ضلع خوشاب میں وادی سون سکیر کا ایک پہاڑی گاؤں ہے۔“ (6)

پہاڑی گاؤں انگلہ تک پہنچنے کا راستہ تنگ دروں میں سے تیز موڑ کے ساتھ مل کھانا گزرتا ہوا اور خاصا دشوار اور پیچیدہ سا تھا۔ اسی لیے محفوظ تھا۔ دور دراز سے مختلف لوگ انگلہ (اور اُس جیسے ارد گرد کے پہاڑوں میں دیگر محفوظ گاؤں) میں آکر رہنے بسنے لگے۔ ان میں کچھ بدھ، ہندو اور سکھ بھی تھے جو انگلہ کے مسلمان علما کی فراخ دلی سے متاثر تھے۔ بزرگوں کے مشورے سے نیچے منسلک میدانی تختوں میں بارانی کھیت اُگا لیے گئے اور کنویں کھود لیے گئے۔ انگریزوں کی حکومت سے قبل جب بھی حملہ آوروں کی اس سمت آمد کی اطلاع ملتی، سب گاؤں والے پہاڑ کے پیچھے چلے جاتے جب کہ مردو ہیں مورچے سنبھال لیتے اور خطرہ مل جانے کے بعد سب واپس گھروں کو پلٹ آتے۔ ملکی حالات بدلے تو یہ لوگ مستقل طور پر گاؤں میں رہنے لگے۔ پر امن، سادہ اور مطمئن زندگی کا یہ سلسلہ نسل در نسل جاری رہا۔ بڑے سے پیا لے نما اس پہاڑی سلسلے میں محفوظ انگلہ سمیت یہ سب گاؤں شہری سہولتوں اور آسائشوں سے آشنا نہیں تھے لیکن پتھر پٹی گلیوں کے ارد گرد تعمیر کردہ ان سادہ سے گھروں میں زندگی سادگی اور سکون کے ساتھ برس ہا برس کا سفر طے کر کے 1916 کے سال میں داخل ہوئی۔ نئی صدی کے آغاز سے قبل ہی



ان گھرانوں کے سپوت دور دراز تک جاتی پکڈنڈیوں اور کچے راستوں کے ذریعے شہری آبادیوں سے رابطے قائم کر چکے تھے۔ اسی لیے یہاں کی کھیتیوں کے مالک خا سے خوشحال گھرانے ہو چکے تھے اور باہر کی دنیا سے اس وادی کا کچھ کچھ تعارف بھی ہو چکا تھا۔

اس وادی کے گاؤں اگلہ کے کھاتے پیتے خوشحال خاندان کے ایک نسبتاً غریب (کہ گھر کے سربراہ نے صرف اللہ سے لو لگائی تھی) گھر کی پاکیزہ فضا میں ایک شہدرنگی چمکتی آنکھوں اور سیاہ گھٹکر یا لے بالوں والے گورے چٹے صحت مند بچے نے اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا۔ اس سے پہلے اس گھر کے دو لڑکوں کے نام اللہ بخش اور محمد بخش رکھے گئے تھے۔ اس بچے کا نام اس کی والدہ نے چوکھنڈی (ضلع چکوال) میں آباد اپنے نضیال کے ایک قابل احترام بزرگ کے نام پر احمد شاہ (شاہ بمعنی بادشاہ) رکھا۔ گھر والے اسے پیار سے ”شاہ“ یعنی بادشاہ کہتے تھے۔ ایک تو یہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ تھا اس لیے بھی سب کا بے حد لاڈ لاکھا۔ پھر اس کی ذہانت، خوش مزاجی اور پسندیدہ عادتیں بھی محبتیں کھینچ لیتی تھیں۔ احمد شاہ سے پہلے اس گھر میں چار بچوں نے جنم لیا تھا (دو بھائی، دو بہنیں) ان میں سے دو حیات تھے۔ ایک بڑی بہن سعیدہ بانو اور ایک بڑے بھائی محمد بخش جب کہ ننھا سا احمد شاہ ان کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ یہ بچہ بہت شریر اور ذہین تھا لیکن مزاج میں سادگی اور ہم دردی تھی۔ احمد شاہ کے بے حد حسین و جمیل اور نیک عبادت گزار والد پیر غلام نبی جن کو تصور میں لا کر ندیم نے اپنا مشہور افسانہ ”چھپن“ لکھا تھا، علاقے کی اہم صاحب کرامت بزرگ شخصیت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کی شہرت پھیلی تو سیالکوٹ، کشمیر اور کجرات کے لوگ ان کے مرید ہو گئے لیکن انھیں دنیاوی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ کسی صلے سے سروکار تھا۔ لوگ انھیں پیارا اور احترام سے پیر نبی چن (چن بمعنی چاند یعنی بہت خوب صورت) کہتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

”جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے مرحوم و مغفور والد گرامی ریاضت کی افراط سے فحاشی اللہ ہو چکے تھے..... انھیں یہ احساس تک نہ تھا کہ دنیوی حیثیت بھی کوئی چیز ہے۔ میرا گھر افلاس اور بد حالی کا ایک عجیب مرقع تھا کہ پختہ مکان اور کھلے صحن..... مگر پہننے کو مونا کھدر اور کھانے کو جنگلی ساگ اور آگ تا پنے کو اپنے ہی ہاتھوں سے پختے ہوئے اُپلے..... آس پاس اکثر تمام رشتہ دار لڑکے (ندیم کے دس چچا اور ایک پھوپھی بھی جب کہ پانچ خالائیں اور دو ماموں تھے) امیر اور خوش لباس تھے ان کی کتابیں نئی تھیں، ان کی

سلیٹوں کے ساتھ موٹے موٹے سنہری آئینے لٹکتے تھے اور ان کی سلیٹوں پر ہتھیلیاں  
 تھرک جاتی تھیں اور یہاں تو بے کی کا لک سے روشنائی تیار ہوتی تھی۔ ان گنت کناروں  
 والے سلیٹ کے ٹکڑوں پر سوالات حل ہوتے تھے۔ ایک ہی قلم کو ”ڈبرے فرائض“ کے  
 لیے دونوں طرف سے تراش لیا جاتا تھا۔ مٹی کی دوات میں روشنائی سے زیادہ صوف  
 ہوتا تھا مگر ان کے باوجود ہونٹ سرخ اور چہرہ روشن تھا اور اس اطمینان کا حقیقی سبب  
 والدہ تھیں جن کے وجود گرامی کی برکت سے مجھے اب تک ہر مصیبت میں مسکرانا اور ہر  
 پہاڑ سے ٹکرانا آتا ہے۔“ (7)

احمد شاہ کی والدہ غلام بیوی عمر میں اپنے شوہر سے خاصی کم تھیں لیکن سلجھی ہوئی، مہذب، صابر اور  
 حوصلہ مند خاتون تھیں۔ وہ خاصی خوش گفتار تھیں اور پر مزاج گفتگو کرتی تھیں۔ ماحول کو خوشگوار اور پر امید  
 بنائے رکھتیں۔ ان کے سلیقے اور خودداری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ غربت میں بھی پر وقار زندگی  
 گزاری۔ ان کے شوہر کے حصے میں آئی چند ایکڑ زمین سے جو مانج حاصل ہوتا، اسی پر سال بھر کی گزر  
 بسر تھی۔ (تفصیل احمد ندیم قاسمی کے پہلے مجموعہء کلام ”جلال و جمال“ کے طویل ابتدائیہ میں اور مختلف  
 انٹرویوز میں ملاحظہ کیجیے) غلام بیوی صاحبہ نے اپنے بچوں کی نہایت اچھی تربیت کی۔ ننھے احمد شاہ نے  
 تعلیم کا آغاز 1920 میں درس قرآن کے حصول سے کیا۔ یہ درس اپنے گاؤں کی اُس خاندانی مسجد سے  
 لیا جہاں اُن کے خاندان کے بزرگ برسر ہامس سے دینی درس و تدریس کا یہ فریضہ سرانجام دیتے آرہے  
 تھے۔ احمد ندیم قاسمی اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ:

”میں چار برس کا ہوا تو انگہ کی اسی مسجد میں قرآن مجید کے درس میں شامل ہوا جہاں  
 حضرت پیر مہر علی شاہ گلاڑوی نے میرے خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل  
 کی تھی۔“ (8)

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو اور ان کی والدہ بی بی راستی کا تعلق بھی انگہ سے ہے سید احمد  
 سعید ہمدانی لکھتے ہیں:

”حضرت سلطان باہو اعوان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے..... حضرت سلطان باہو کے والد  
 بایزید محمد، دین دار، متقی اور حافظ قرآن تھے..... (انھوں نے) حضرت بی بی راستی سے  
 نکاح فرمایا جو ایک عالی مقام ولیہ تھیں۔ سون سکسیر کے گاؤں ”انگہ“ میں وہ جگہ اب



تک معروف و محفوظ ہے جہاں وہ ایک پہاڑی کے دامن میں چشمے کے کنارے ذکر میں  
مغور ہا کرتی تھیں۔“ (9)

”انگلہ“ کی مسجد اور وہاں درس و تدریس کی اس قدر اہمیت تھی کہ دور دراز سے لوگ اس مسجد کے  
حجروں میں قیام کے لیے آتے اور عالم بزرگوں سے درس لیتے۔ یہ علما کھلے دل و دماغ کے مالک تھے۔  
احمد ندیم قاسمی کے ایک بیہیں سے علم حاصل کرنے والے خالہ زاد بھائی مولوی ضیاء الدین (شر کی  
شریف۔ والد البعد ندیم) کو لاہور کی دو معروف مسجدوں کے لیے خطیب کی پیش کش ہوئی۔ وہ اپنی گھریلو  
ذمہ داریوں کی وجہ سے لاہور نہ جاسکے۔ جب کہ ندیم کے دوسرے خالہ زاد بھائی مولانا غلام مرشد عرصہ  
دراز تک لاہور کی مشہور مسجد وزیر خان اور عالمگیری بادشاہی مسجد میں خطیب رہے۔ وہ روشن خیال مجتہد  
عالم دین تھے۔ (معلومات پیر زادہ محمد سلیم ☆ 1)

بے حد ذہین اور محنتی احمد شاہ نے جب انگلہ کی معروف مسجد سے دس سپارے پڑھ لیے تو ان کے ایک  
تعلیم یافتہ چچا پیر حیدر شاہ نے جو سول سروس میں بہت لائق اور ایماندار افسر تھے، اپنے بڑے بھائی کی  
مذہبی مصروفیات میں انہماک اور ان کے گھر کی صورت حال دیکھی تو والد کی باقاعدہ شفقت اور نگرانی سے  
محروم دونوں لڑکوں کی تعلیم کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ انھوں نے ہدایت کی کہ یہ بچے گاؤں کے سکول سے  
پرائمری پاس کر لیں (اس وقت پرائمری چار جماعتوں پر مشتمل ہوتی تھی)۔ پھر میں انھیں اپنے ساتھ شہر  
لے جاؤں گا اور سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کا درس اور دینی تربیت میں خود دوں گا۔ یوں  
ان کی دینی اور دنیوی تعلیم وتر بیت مکمل ہو سکے گی۔

چنانچہ احمد شاہ 1921 میں انگلہ کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے۔ غالباً داخلے کے وقت  
خاندان کے ان بزرگ نے جو سکول داخل کروانے آئے تھے، اندازاً تاریخ پیدائش لکھوا دی۔ صحیح تاریخ  
پیدائش کے بارے میں محقق ڈاکٹر معین الرحمن نے خاصی تحقیق کی تھی لیکن انھیں بھی کوئی پختہ ثبوت نہ مل  
سکا تھا۔ جب کہ خود ندیم اپنی تاریخ پیدائش 20 نومبر 1916 سے مطمئن تھے۔

1923 میں جب احمد شاہ تیسری جماعت میں تھے۔ ان سے آٹھ برس بڑی بہن سعیدہ بانو (والدہ  
معروف صحافی اور منظر دانہ نگار ظہیر بابر) کا بیاہ ہو چکا تھا۔ وہ احمد شاہ کو بہت عزیز تھیں۔ احمد شاہ سے دو  
برس بڑے بھائی محمد بخش اپنے ہم عمر چچا زاد بھائی محمد حیات کے ہمراہ پرائمری پاس کرنے کے بعد چچا پیر  
حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور (منٹلے انک) جا چکے تھے کہ والد صاحب پیر نبی چن کی طبیعت ناساز ہو

گئی۔ اُن کے آخری وقت میں احمد شاہ اپنی والدہ (جنہیں وہ ”مائے“ کہتے تھے) کے ساتھ اپنے والد (جنہیں وہ ”بابو جی“ کہتے تھے) کے قریب بیٹھے تھے۔ والدہ پیر صاحب کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر رونے لگیں تو پیر نبی چن نے احمد شاہ کو پاس بلا کر اپنی شریک حیات سے کہا ”روتی کیوں ہو؟“ میں دو شیر (محمد بخش اور احمد شاہ) تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں، اس کے بعد اُن کی رحلت ہو گئی۔ آٹھ برس کی عمر میں احمد شاہ نے یتیمی کا سخت صدمہ سہا۔

چوتھی جماعت میں وظیفے کا امتحان ہوا۔ ذہین اور لائق احمد شاہ ضلع بھر میں اوّل آیا۔ (سال بعد کل وظیفہ 60 روپے اپنی پہلی کمائی کہہ کر اپنی والدہ کے ہاتھ پر رکھا تو وہ خوشی سے رو دیں)۔ احمد شاہ اپنی مائے سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے لیکن بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ماں نے اپنی تنہائی قبول کر لی اور احمد شاہ کو بہلا پھسلا کر روانہ کر دیا۔

اندھیری راہوں پر بھاری چھکڑے کے پہیے یوں چر چر رہے ہیں  
کہ جیسے دہقان گونجتی گھاٹیوں میں کچھ گاتے جا رہے ہیں  
میرا وہ ننھا سا گاؤں میری نگاہ سے چھپتا جا رہا ہے  
مرے گھروندے میں جانے اب تک چراغ کیوں ٹمرا رہا ہے  
منڈیر کی آڑ لے کے شاید ضعیف ماں میری روتی ہوگی  
مرے تصور میں آنسوؤں کی کتنی لڑیاں پروتی ہوگی

(نظم ”نوکری پر جاتے ہوئے“۔ جلال و جمال)

احمد شاہ اپنے چچا پیر حیدر شاہ اور چچی شرفاں بیوی اور اپنے بڑے بھائی پیر زاد محمد بخش کے پاس کیمبل پور پہنچ گئے۔ چچا چچی لا ولد تھے لیکن انہوں نے اپنے خاندان کے کئی بچوں کو بے حد پیار دیا اور انہیں ساتھ رکھ کر بہترین تعلیم و تربیت کی۔ احمد ندیم قاسمی اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ جس ہستی کی شفقتوں کا حیرت بھری مسرت کے ساتھ بارہا ذکر کرتے تھے۔ وہ یہی چچی شرفاں بیوی (بیگم پیر حیدر شاہ) ہیں۔ ندیم کہتے ہیں کہ شرفاں بیوی (جنہیں وہ ماسی، یعنی ماں جیسی کہتے تھے) کی سی مہربان، شفیق اور مخلص خاتون انہوں نے کبھی نہ دیکھی جو دوسروں کی اولاد کو بھی اس قدر توجہ اور پیار دے سکے۔

چچا کے گھر میں خوب خوشحالی تھی۔ ہر طرح کی شہری سہولت حاصل تھی۔ آرام دہ نرم صوفوں اور عمدہ فرنیچر اور دبیز قالینوں سے آراستہ کمرے اور خدمت کے لیے ملازمین کی قطار، کھانے کے لیے عمدہ

چیزیں، سواری کے لیے پہلے سجا سجا یا پرائیویٹ ٹانگہ تھا پھر بعد میں پیر صاحب کی کار بھی ان کے تصرف میں تھی۔ یوں ندیم نے تنگ دستی کی تلخ اور سادہ زندگی کے ساتھ ساتھ بے حد خوش حالی کے سکھ کو بھی اچھی تربیت کی وجہ سے توازن اور وقار سے برتا اور تعلیم بھی پوری لگن سے حاصل کی کہ اسی تعلیم کے حصول کے لیے والدہ سے جدائی برداشت کی تھی۔

ندیم صاحب نے ایک انٹرویو میں بتایا:

”میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا لہذا میں نے اپنے چچا پیر حیدر شاہ کی سرپرستی میں ہی تعلیم حاصل کی۔ اگرچہ وہ سول سروس میں تھے مگر انھیں علم و ادب کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں اعلیٰ درجے کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ گھر میں اس زمانے کے معروف رسالے ”نگار“ ”صوفی“ اور ”ہمایوں“ وغیرہ بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے چچا ہمیں صبح سویرے عبدالحق محدث دہلوی کی لکھی ہوئی تفسیر حقانی پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم سے تاریخ اور علم کے بارے میں بھی دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو کیا کرتے تھے جو میرے اور میرے بھائیوں (سگے بھائی اور کزنز) کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی تھیں۔“ (10)

اپنی والدہ کی اچھی تربیت کے بعد انہیں ہمدرد چچا اور چچی نے اپنی نگرانی میں پروان چڑھانا شروع کیا۔ چچا نے کڑی نظر رکھی اور بھرپور توجہ دی جب کہ چچی نے شفقت، پیار اور نرمی سے خیال رکھا۔ یوں دونوں نے ان زبردست تربیت بچوں کو دینی اور دنیوی اعلیٰ معیاروں سے علمی اور عملی طور پر روشناس کیا۔ چچا حیدر پڑھے لکھے، خوش ذوق، حسین اور نفیس انسان تھے۔ وہ میر حسن کے شاگرد تھے۔ احمد شاہ کو اپنے چچا سے علامہ اقبال اور ظفر علی خان کے ساتھ دیگر شعرا (جن میں عربی اور فارسی کے شعرا بھی شامل ہیں) کے اشعار بھی موقع بہ موقع سننے کو ملتے، پھر گھر میں آنے والی ادبی جرائد و رسائل تھے جو مطالعے کے بے حد شوقین احمد شاہ کے لیے انوکھا سرمایہ تھے۔ ان ہی کی بدولت ان کا اچھے معیاری ادب کے مطالعے کا ذوق نکھرنے لگا۔ احمد ندیم قاسمی کے ہم مکتب احمد شفیع لکھتے ہیں:

”اپنی کتابوں کے ساتھ احمد شاہ کی لگن اور گریڈ اُسے دوسرے طالب علموں سے ہمیشہ الگ رکھتی تھی اور اس کی باوقار خاموشی میں مستقبل کا ایک جری دانش ور پرورش پا رہا تھا۔“ (11)

موسم گرما کی تعطیلات میں تین ماہ کے لیے گاؤں جاتے تو اگلہ کے سکول کی مختصر سی لائبریری سے کتابیں لے کر پڑھنے کے لیے ضرور وقت نکال لیتے۔ یہیں پر انہیں پریم چند کے افسانوی مجموعے پڑھنے کا ناموقع ملا۔ 1926 میں جب احمد شاہ چھٹی جماعت میں تھے تو ایک روز سب بھائی چاقو سے گنے چھیل چھیل کر پوس رہے تھے۔ بقول بڑے بھائی بیرزادہ محمد بخش، احمد شاہ نے اپنے حصے کا گناہ چوس لیا تو بڑے بھائی کے گنے پر جھپٹا۔ اُن کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا جو چھینا چھٹی میں احمد شاہ کے گال کو ہونٹ سے گردن تک چیرتا ہوا نکل گیا۔ زخم گہرا تھا، بہت درد ہوا، بہت خون بہا لیکن چچا کو پتہ نہ چلنے دیا، نہ کسی سے شکایت کی۔ بھائی نے زخم میں راکھ بھر دی۔ کافی دنوں تک احمد شاہ کامیابی سے اپنا زخم چھپاتے رہے۔ ایک روز اچانک چچا کی نظر پڑ گئی تو وہ ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھرے۔ زخم مندل ہو گیا لیکن دیر سے علاج شروع کرنے کی وجہ سے نشان رہ گیا جو آخر عمر تک رہا، جب بھائی زخم پر دوا لگاتے تو احمد شاہ (ندیم) ایک شعر کو بدل کر چھیڑ چھاڑ کے لیے یوں پڑھتے:

میرے زخموں پہ مت رکھو مرہم  
میرے بھائی کی یہ نشانی ہے

بیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

”1927 میں جب (احمد شاہ کی عمر دس گیارہ برس اور میری عمر تیرہ چودہ برس تھی) گرمیوں کی چھٹیاں قریب تھیں تو مجھے خیال آیا کہ گاؤں جا کر ایک ”انجمنِ نوجوانانِ اسلام“ بنائیں گے اور اپنے ہم عصروں کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھائیں گے اور انھیں نماز روزہ کی جانب راغب کریں گے۔ میں نے شاہ سے اس کا ذکر کیا تو کہنے لگا کہ اس کا ”منشور“ میں تیار کرتا ہوں! اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر شاہ اپنے ہاتھ میں منظوم منشور لیے میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا (مجھے بے حد افسوس ہے کہ اس کا مسودہ مجھ سے ضائع ہو گیا ورنہ آج اس کا مطالعہ دلچسپ ہوتا) میں نے اس انجمن کے مقاصد کے بارے میں جو کچھ سوچا تھا وہ اس نظم میں بڑی خوبی اور سلاست سے آگیا تھا۔ یہ شاہ کی ابتدائی اردو شاعری تھی۔“

”ان دنوں (یعنی جب شاہ ساتویں جماعت میں تھا) اُس نے اپنی کاپی پر پورا ناول لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔“ (12)



یہ ناول احمد شاہ کے ہم جماعتوں نے بھی بے حد پسند کیا۔ وہ مضمون نویسی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ 1928-29 میں جب وہ آٹھویں جماعت میں تھے تو ریڈ کراس سوسائٹی کے تحت منعقدہ مقابلہ مضمون نویسی میں پنجاب بھر میں اول رہے۔ دراصل احمد شاہ جتنا زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے اتنا ہی زیادہ لکھنے کا شوق بھی تھا۔ لیکن وہ ہر وقت صرف لکھتے اور پڑھتے ہی نہیں رہتے تھے بلکہ کھیل کود سے بھی دلچسپی تھی۔ اس وقت نوجوانوں میں مقبول کوئی کھیل ایسا نہ تھا جس میں انہوں نے حصہ نہ لیا ہو۔ خاص طور پر کبڈی اور والی بال کے وہ نمایاں کھلاڑی تھے۔ ان کی اچھی صحت کا راز یہی کھیلوں میں حصہ لینا بھی تھا۔ پھر وہ خوب جی بھر کر شرارتیں کرتے تو تھے لیکن اپنی تعلیم پر سنجیدگی سے توجہ بھی دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بہت حساس، ہمدرد، مخلص، جرأت مند اور دوست دار نوجوان تھے اس لیے اپنے ہم عمروں میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے گاؤں جاتے تو اپنے بھائی اور دوستوں کے ہمراہ وادی میں دور دور تک گھومتے۔ یوں ان کی معلومات کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدات اور تجربات میں بھی خوب خوب اضافہ ہوا جو بعد میں تخلیق فن کے لحوں میں ان کے لیے مفید رہا۔

جہاں تک شعر و شاعری کی بات ہے تو یہ تو جیسے اُن کی گھٹی میں شامل تھی (بقول نور جہاں عباس ۲۱۲) ننھے احمد شاہ کی مائے جب اپنے گھریلو کاموں کے دوران اپنی سُرِیلی آواز میں علاقے کے پنجابی لوک گیت گنگنائی تھی تو وہ ہر طرف سے توجہ ہٹا کر ان گیتوں کے بولوں کو دھیان سے سنا کرتے تھے اور زیر لب دہراتے رہتے تھے۔ پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

”جب شاہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا، اُس وقت اُس کی عمر یہی کوئی آٹھ نو برس ہوگی۔ ہمارے ایک عزیز کی شادی ہوئی۔ عورتیں ڈھولک، گھڑا اور تھالی بجا کر گیت گانے لگیں، مرد محلے کی چوپال پر چلے گئے اور بچے مکان کی چھت پر جا بیٹھے۔ ہم بھی چھت پر بیٹھے ان دیہاتی گانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک مجھے شاہ کا خیال آیا میں نے ادھر ادھر دیکھا تو مجھے کہیں نظر نہ آیا..... گاؤں بھر میں ڈھونڈ تھا..... میری تلاش کی آخری منزل اُن لڑکیوں اور بڑی بوڑھیوں کی ”مختل سماع“ تھی جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ لڑکیوں کی ٹولی میں بیٹھا ہے۔ وہ گارہی ہیں..... جوں ہی ان کے گیت کی روانی ٹوٹنے لگتی ہے وہ شاہ پر جھکتی

ہیں.....شاہ کی مدد سے یہ لڑکیاں نئے نئے بول گاتی جاتی ہیں۔ اس دن کے بعد شاہ کو باقاعدہ بلاوے آنے لگے.....وہ نئے نئے مایے، ڈھولے اور ٹپے گھڑ گھڑ کر انھیں تھماتا جاتا۔ لڑکیوں کی جس ٹولی سے شاہ نکلتی ہو جاتا۔ اس کا مقابل ٹولی سے شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“ (13)

یوں تو چوتھی جماعت پاس کر کے احمد شاہ شہر چلے گئے تھے لیکن جب بھی چھٹیوں میں انگلہ آیا کرتے تو اسی طرح گیت کہتے۔ یوں وہ اپنے گاؤں اور قریبی علاقوں میں بطور شاعر مقبول ہو گئے۔ وہ علاقائی بولی میں ٹپے، مایے اور بولیاں روانی سے کہہ لیتے تھے اور لڑکیاں ترنجن میں اور شادی بیاہ کے موقع پر انہیں اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے کوشاں رہتیں۔ یہ درست ہے کہ اُن کی پہلی شائع ہونے والی اردو نظم کا سال اشاعت 1931 ہے۔ (جب وہ میٹرک میں تھے) لیکن وہ اس سے پہلے بھی اردو شاعری کرتے رہتے تھے جس کے سامعین ان کے بھائی، کزنز اور قریبی دوست ہی ہوتے تھے۔ اُن کے بھائیوں نے انھیں ”پوئٹ لاریٹ“ کہنا شروع کر دیا تھا۔

احمد شاہ نے دورانِ میٹرک اپنے قریبی عزیزوں میں ایک ہی دن میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ماں بیٹی کے انتقال پر ملال اور دونوں کے جنازے ایک ساتھ اٹھنے پر نظمیں کہیں جو چچا حیدر شاہ کو بھی دکھائی گئیں۔ انہوں نے خوش گوار حیرت کا اظہار کیا کہ وزن اور بحر بالکل درست تھے اور قافیے ردیف کی بھی کوئی غلطی نہ تھی۔ ساتھ ہی تلقین کی کاقابل اور ظفر علی خان کی طرح قومی نظمیں زیادہ کہا کرو۔ اس دوران احمد شاہ نے غزلیہ اشعار بھی کہے لیکن چچا سے چھپ کر صرف اپنے بھائیوں کو سنائے۔ (میٹرک تک کی ان کی یہ تخلیقات محفوظ نہیں ہیں)

1930 میں چچا حیدر شاہ کا تبادلہ شیخوپورہ ہو گیا تھا۔ بچے اُن کے ہمراہ شیخوپورہ کی ایک کونجی میں آ گئے اور یہیں کے ایک سکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں ن م راشد بھی کچھ دن کے لیے انگریزی کے استاد رہے جن کے والد جناب فضل الہی چشتی وہاں کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ چودہ برس کی عمر میں احمد شاہ کو قومی رہنما محمد علی جوہر کی اہمیت کا علم تھا اور وہ اُن کے انگلینڈ میں کہاس قول سے بہت متاثر ہوئے تھے کہ مجھے اپنے ملک کی آزادی کی طلب ہے۔ میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جانا چاہتا..... اور پھر واقعی وہ غلام ملک میں واپس نہیں آئے اور وہیں بیرون ملک فوت ہو گئے۔ احمد شاہ پر اس کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے اپنے احساسات کو نظم کی شکل دے دی۔ یہ پندرہ بیس اشعار کا نوحہ تھا۔ پیر زادہ محمد بخش

اس کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

” (اے) اس نے چچا جان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اسے پڑھ کر دم بخود رہ گئے پھر ضبط نہ کر سکے اور زار زار رونے لگے۔ انھوں نے شاہ کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اُن کے لیے یقیناً یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ شاہ جوان کی ہیبت اور احترام سے اُن کے سامنے ”جی، جی، ہاں“ کہہ سوا کوئی لفظ نہیں بولتا تھا، ایک ایسا مرثیہ لکھ لایا ہے جس کی توقع دسویں جماعت کے ایک طالب علم سے نہیں کی جاسکتی۔ چچا جان کا ذوق شاعری نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس لیے وہ شاہ کے لکھے ہوئے اس مرثیے کے جذبہ احساس کے علاوہ اس کی فنی صحت سے بھی متاثر ہوئے انہوں نے اُسی وقت کارگیراج سے نکلوائی اور لاہور تشریف لے گئے۔“ (14)

چچا نے یہ نظم لاہور کے ایک روزنامے کو دی۔ یہ نظم روزنامہ ”سیاست“ (مدیر سید حبیب) کے سنڈے ایڈیشن کے فرنٹ پیج پر نمایاں کتابت اور مختلف رنگوں کی آرائش کے ساتھ ”پیرزادہ احمد شاہ احمد“ کے نام سے شائع ہوئی۔ اُس وقت اخبارات میں شعرا ادبا کی تحریروں پر اُن کے نام کے ساتھ اُن کے پوسٹل ایڈریس بھی دیئے جاتے تھے۔ احمد شاہ کو بہت سے تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ احمد شاہ کے بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش لکھتے ہیں:

”مگر سب سے اہم داد علامہ اقبال کی تھی۔ چچا جان سیالکوٹ میں علامہ اقبال کے ہم مکتب رہ چکے تھے اور علامہ اقبال سے اُن کے قریبی مراسم تھے۔ ایک روز چچا جان لاہور میں علامہ اقبال سے ملنے گئے تو باتوں باتوں میں مولانا محمد علی جوہر کے ذکر کے ساتھ ہی شاہ کی اس (شائع شدہ) نظم کا ذکر بھی آیا اور علامہ اقبال یہ سن کر حیران رہ گئے کہ یہ نظم چودہ برس کے ایک بچے نے لکھی ہے اور اس میں ایک بھی لفظ کی تصحیح کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔“ (15)

یوں علامہ اقبال کی داد اور دیگر خطوط کے ذریعے حوصلہ افزائی سے نوازا اور نوا آموز احمد شاہ کو جو بے حد خوشی ہوئی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جنوری 1931ء سے شاعری کا ایسا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا جو آخر تک رہا۔ چچا حیدر نے ہدایت کی تھی کہ قومی نظمیں لکھو۔ اس لیے آغاز میں غزلیں اور دیگر شاعری کہہ کر بھی احمد شاہ نے چھپائے رکھی۔ البتہ مشقِ سخن جاری رکھی۔



احمد ندیم قاسمی نے بتایا ہے کہ:

”جب میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، ایک بزرگ نے جن کا اسم گرامی مقبول انور داؤدی ہے جو روزنامہ ”سیاست“ میں کام کرتے تھے، مجھے خط لکھا کہ اُن کے نوجوان دوست شاطر غزنوی سے رہنمائی لوں۔ (وہ بھی ”سیاست“ میں لکھتے تھے) انھیں ایک غزل بھیجی جو انہوں نے پوری کی پوری بدل دی اور مقطع میں اپنی تعریف شامل کر دی۔ مجھے یہ مہربانی اچھی نہیں لگی میں نے کلام بھیجنا بند کر دیا۔ البتہ ان کے ایک احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے شروع ہی میں میرا تخلص ”ندیم“ تجویز کیا۔“ (16)

یوں شاطر غزنوی کے مشورے سے اپنا تخلص ”ندیم“ پنشن لیا۔ 1931 میں چچا حیدر نے سول سروس سے ریٹائر ہونا تھا۔ نواب بہاول پور نے چچا حیدر کو ریاست کے مشیر مال کی حیثیت سے بہاول پور آنے کی پیش کش کر دی تھی۔ اس لیے چچا نے پیر زادہ احمد شاہ ندیم کو بہاول پور کے صادق ایجنٹ کالج میں سال اول میں داخل کروا دیا اور عارضی طور پر کالج کے ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کروا دیا۔ اسی اثناء میں حکومت نے چچا کو ملازمت کے دو سال اضافی دے دیئے۔ اب وہ 1933 سے پہلے بہاول پور میں جوائن نہیں کر سکتے تھے۔ سو پیر زادہ احمد شاہ ندیم ہاسٹل میں ہی رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں اُن کی صلاحیتوں کو نکھار ملا۔ یہیں پراچھے اساتذہ کی رہنمائی اور کچھ خوش ذوق دوستوں کی بدولت فارسی، اردو اور انگریزی کے اہم شعرا اور ادبا کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ادیبوں شاعروں کی تخلیقات بھی پڑھیں اور پڑھیں۔ مطالعہ وسیع تر ہوا۔ مواقع بھی خوب ملے۔ شاعری اور نثر کی تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں (جو ندیم کے کالج فیلو بھی ہیں اور ٹیٹوریل گروپ ”سولجرز“ کے ساتھی بھی):

”ندیم سینئر سٹوڈنٹ اور قابل ہونے کی وجہ سے ہوٹل کا مانیٹر تھا۔ اور اوپر کی منزل پر ایک ATTIC میں رہتا تھا جو مانیٹروں کے لیے مخصوص تھی۔ کھڑکی میں سے ٹینس کورٹ اور کالج کے ہزلان نظر آتے تھے۔ ندیم (وہ ان دنوں پیر زادہ احمد شاہ ندیم قاسمی تھا) دوسرے تیسرے روز ہمیں ایک نئی خوبصورت نظم پڑھ کر سنا تا۔ ان میں سے بعض نظمیں اُس نے اپنے پہلے مجموعہ کلام ”جلال و جمال“ میں چھاپیں..... (مثلاً ”آخری سجدہ“، ”چرواہے“ اور چند ایک اور) ان نظموں کی سادگی اور پرکاری

سے متاثر نہ ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ گہرے گونجیلے لہجے میں اس کی نظمیں سن کر ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ شخص ”ہینس“ ہے۔“ (17)

احمد شاہ نے اپنے لیے تجویز کردہ تخلص ”ندیم“ پسند کیا تھا۔ اب پیر زادہ احمد شاہ احمد نے اپنا ادبی نام احمد ندیم قاسمی رکھا۔ احمد اُن کے نام کا پہلا جزو تھا۔ ندیم تخلص ہوا جب کہ اپنے گاؤں میں قاسم کی آل سے ہونے کی وجہ سے قاسمی اپنایا۔ یوں احمد ندیم قاسمی کے نام کا خوبصورت، خوش آواز جگمگانا ہوا مرکب تیار ہوا جسے دُنیا نے علم و ادب میں حیاتِ جاواں حاصل ہوئی۔

بہاول پور ہی میں اُن کے ایک با صلاحیت اور خوش ذوق دوست محمد خالد اختر نے بھی اُن کے ادبی ذوق کو اجالنے میں اہم حصہ لیا۔ وہ مغربی ادب کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے۔ دونوں نے مل کر خوب کتابیں پڑھیں اور اُن پر بحث مباحثہ کیا۔ خالد ہی کی تجویز پر ندیم نے افسانے لکھنا شروع کیے جن میں سے کچھ اُس وقت کے ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ البتہ یہ بالکل آغاز کے تجرباتی مشقی افسانے تھے۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

”1935 میں (بی اے کے) نتیجے کے دنوں میں وہ گاؤں سے بہاولپور دس پندرہ روز کے لیے ٹھہرنے کے لیے آیا۔ ہم شام کو ملتے۔ لمبی سیروں پر جاتے، ایک خزاں رسیدہ باغیچے میں بیٹھ کر دُنیا جہان کی باتیں کرتے۔ ایک بار اسی بیٹھ پر میں نے ندیم کو ایک کہانی لکھتے دیکھا۔ اُس نے اسے فخر سے پڑھ کر سنایا۔ اس کا عنوان بھی عجیب طور پر میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔ اُس کا نام ”کالا کوٹ“ تھا..... کہانی مجھے پسند آئی اور میں ندیم کے کہانی لکھنے پر بڑا خوش تھا..... یہ ندیم کی زندگی میں ایک نئی روش کی ابتداء تھی۔ ایک فیصلہ کن لمحہ! اس کے بعد اُسے کئی کہانیاں لکھنا تھیں۔“ (18)

حصولِ تعلیم کے دوران قیام بہاول پور میں ندیم نے پہلے بہت خوش حالی اور سہولت دیکھی اور بعد میں اچانک تنگی کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن شروع سے آخر تک اُنہوں نے قدر وانی اور مقبولیت حاصل کیے رکھی۔ خوش حالی اور سہولت اپنے چچا کی وجہ سے تھی کہ وہ ریاست کے افسر بھی مقرر ہو چکے تھے جب کہ انھیں قدر وانی حاصل ہوئی اپنے اساتذہ کی لیاقت اور شرافت شناسی کی وجہ سے اور مقبولیت ملی اپنی زندگی سے بھرپور مہذب شخصیت اور اپنی نوع بہ نوع تخلیقات کی وجہ سے..... وہ یہاں خوش تھے اور مستقبل کے لیے دیکھے گئے خوابوں میں رنگ بھرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ سالِ سوم میں انھیں اپنے سر پرست چچا

کے اچانک انتقال کا اور یک لخت جہی دست ہونے کی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں نے بھی انہیں حیران کر دیا۔ وہ اس چانک تبدیلی سے بے حد دکھی اور مایوس ہوئے۔ اب تعلیم جاری رکھنے کی اُمید بھی ختم ہو گئی۔ بڑے بھائی نے بی۔ اے تو کر لیا تھا لیکن ابھی اچھی ملازمت کی کھوج میں اپنی صلاحیتوں کو مزید نکھار رہے تھے۔ مذہم کو اس باریتیمی کا احساس بہت غم زدہ کر گیا۔ وہ مایوس ہو کر گاؤں چلے گئے اور کسی چھوٹی موٹی ملازمت کا سوچنے لگے۔

مذہم لکھتے ہیں:

”..... اب میرے اقتصادی حالات ایسے نہ تھے کہ میں (ہاسٹل میں رہ کر) اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ جب میں چچا کے انتقال کے بعد گاؤں گیا تو مجھے بتایا گیا کہ چچا تو میرے فور تھائر کے آخری مہینے تک کی کالج فیس ایک عزیز کے پاس جمع کروا گئے ہیں! جس پر میں دوبارہ گاؤں سے واپس آ گیا۔ یوں میں نے گریجویشن کی لیکن مرحوم اگر ایسا بندوبست نہ کرتے تو میں ایف اے سے آگے تعلیم حاصل نہ کر پاتا۔“ (19)

ایسے وقت میں بڑے بھائی نے بھی حوصلہ افزائی کی:

”یہ 1934 کا واقعہ ہے جب چچا جان شیخ پورہ سے ریٹائر ہو کر گاؤں تشریف لائے مگر دراصل انہوں نے والی بہاول پور کی پیش کش منظور کر لی تھی۔ چند روز کے لیے بہاول پور گئے۔ وہاں اُس زمانے کے شیخ الجامعہ عباسیہ کے ہاں قیام فرمایا پھر ایک دن ہاسٹل میں شاہ کے پاس ٹھہرے (باپتا سے محروم نوجوان شاہ کے لیے چچا کی یہ شفقت اور مہربانی بے حد مسرت کا باعث ہوئی۔) امیر بہاول پور سے ملاقات کے بعد دس روز کی رخصت لے کر اور سامان تیار کرنے گاؤں واپس آ گئے مگر ایک صبح کو نماز کے بعد انھیں زندگی میں پہلی بار دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال فرما گئے۔ ہماری زندگیوں کے اس مینارہ نور کے بجھ جانے سے ہماری دنیا پر مکمل تاریکی چھا گئی۔ شاہ بہاول پور میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس سانحہ کی خبر سنی تو فوراً گاؤں پہنچا اور نئے حالات کے پیش نظر تعلیم ترک کرنے پر تمل گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنی تعلیم کو پرائیویٹ طور پر مکمل کر لے گا مگر ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرے گا لیکن میں نے اُسے سمجھا بچھا کر واپس بہاول پور بھیج دیا تا کہ گریجویشن مکمل کر لے۔“ (20)

کالج کے پرنسپل اور انگریزی ادب کے شفیق استاد نے بھی اصرار کر کے انھیں گاؤں سے بلا لیا۔ یوں ندیم نے گریجویشن مکمل کر لی۔ اُن کے بڑے بھائی بتاتے ہیں کہ:

”آخر 1935 میں بی اے پاس کرنے کے بعد وہ میرے پاس آ گیا۔ ان ہی دنوں مجھے لاہور میں ملازمت مل گئی۔ میں لاہور آیا تو شاہ بھی میرے ساتھ تھا میں نے اسے موقع ہی نہ دیا کہ اسے اپنے سر پرست چچا جان کے کچھڑنے کے بعد کی المناک صورتحال کا احساس ہو مگر وہ شاعر اور فنکار تھا اور ان لوگوں کے احساس کی سطح اتنی ذکی الحس ہوتی ہے کہ وہ شاخ سے پتے کے ٹوٹ کر گرنے تک کا شدید تاثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ نا ڈگیا کہ..... لالہ (شاہ مجھے لالہ کہتا ہے اور ہمارے ہاں لالہ بڑے بھائی کو کہتے ہیں) پر جو اندھا دھند بوجھ ہے اسے کسی حد تک تو کم کرنا چاہیے۔ میں جانتا تھا کہ ہم سب کے لاڈوں اور نازوں کا پالا ہوا شاہ کسی کے ماتحت کام نہیں کر سکے گا۔ واضح رہے کہ ہمارے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہیں تھا بلکہ اسے بلا کا خوددار بنایا تھا..... شدید بے روزگاری کا زمانہ تھا..... اس لیے بڑی مشکل کے بعد اسے الیکشن آفس میں محرری کی آسامی ملی۔“ (21)

ندیم کا ارادہ تو تھا کہ وہ انگریزی ادب میں ایم اے کریں گے، انہوں نے لاہور کے دواہم کالجوں میں درخواستیں دیں۔ میرٹسٹوں پر نام بھی آگیا لیکن بر وقت داخلہ فیس کا بندوبست نہ ہو سکنے کی وجہ سے داخلہ نہ لے سکے۔ غیرت اور خودداری نے ہاتھ پھیلائے سے روکا۔ کچھ عرصے بعد اُن کے نہایت عزیز اور امیر ہندو دوستوں منو ہر اور نند کو معلوم ہوا تو انہوں نے گلہ کیا کہ ہم سے کیوں نہیں کہا۔ بہر حال تب تک وقت گزر چکا تھا۔

ندیم گاؤں لوٹ گئے۔ ملازمتوں کے اشتہار دیکھنے اور درخواستیں لکھ لکھ کر بھجوانے سے جتنی فرصت ملتی، وہ اپنی وادی میں گھومنے نکل جاتے۔ انھوں نے اس کے چپے چپے کا گہرا مشاہدہ کیا۔ اپنے آباؤ اجداد کی قدیم بستی اسلام آباد کے آثار، جھیل کھبکی کے کنارے، سیکسر پہاڑ کے دامن میں بکھرے دیکھے۔ قدرت نے ندیم کو مشاہدہ کرنے اور اُسے بہترین یادداشت میں محفوظ رکھنے اور غور و فکر کر کے تجزیہ کرتے رہنے کی بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی تھیں۔ وہ قلب و نظر وایکے، مختلف لوگوں سے ملے۔ پھر پرندوں، پھولوں، کنکروں، پتھروں کا..... مختلف موسموں، روپوں، سوچوں، دکھوں، سکھوں کا غرض کہ



ہر چیز کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کیا جو بعد میں اُن کی عملی، سماجی اور ادبی شخصیت کے نکھار و اظہار میں بہت مفید رہا۔ اس دوران دو تین ناولوں کے پلاٹ بھی اُن کی سوچ نے تغیر کر لیے۔ لیکن معاش کی تلاش نے سکون سے کہیں تک کر بیٹھنے نہ دیا اور وہ خواہش اور صلاحیت کے باوجود ناول نہ لکھ سکے۔ البتہ شعر کہنے، افسانے لکھنا اور انھیں مختلف رسائل میں شائع کروانے کے لیے بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ مناسب ملازمت کی تلاش بھی جاری رہی۔

”جلال و جمال“ میں لکھتے ہیں:

1935 سے 1939 تک تقریباً سارے پنجاب کے چکر لگائے، خاندان کے پرانے مربیوں نے مسکرا کر دیکھا اور اظہار ہمدردی فرماتے سیر کو نکل گئے۔ ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنری، تحصیل داری، نائب تحصیلداری سے لے کر انجمن حیات اسلام میں کلرکی تک کے لیے نت نئے ڈھنگ کی درخواستیں لکھیں۔ ریفارم کمشنر کے دفتر میں بیس روپے ماہانہ پر محرری کا کام کرتا رہا۔ ایک ہندو بزرگ کو (سیرت نبی پاک پر) پانچ سو صفحات کی ایک کتاب کچھ روپے کے بدلے لکھ دی جو کہ اب تک (گیارہ بارہ برس بعد بھی) ان ہی کے نام سے شائع ہو رہی ہے (ماشاء اللہ) میں راولپنڈی میں نائب سیکرٹار ہا۔“ (22)

اسی قیام انگہ کے دوران انیس بیس برس کی عمر میں مذہم کو ایک معصوم سا جذبہ باقی لگاؤ بھی ہوا۔ اس کا دورانیہ مختصر لیکن اثر نادر رہا۔ وہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

”37-1936 کے درمیانی عرصہ میں میری الم ناک زندگی کے تاریک اُفق پر اچانک ایک کوندا سالپکا اور عام کوندوں کی طرح بجائے چمک کر گھل جانے کے، اندھیروں کا ایک سنہری عنوان بن کر وہیں جم کر رہ گیا۔ احساسات میں بالیدگی پیدا ہونے لگی، دُکھ شکھ کے معیار بدلنے لگے، زندگی پر سے گرد و غبار کی تہیں اکھڑنے لگیں اور میری ذہنی کلہبیت ایک خوش گوار، نرم اور معصوم تبسم میں گھل کر کھو جانے لگی۔ یہی وہ دور ہے جب مجھے شاعری کی نازک ترین گہرائیوں کا احساس ہوا ہے، اور یہی وہ دن ہیں، جن سے میرے فن کی ہر رنگینی عبارت ہے۔“ (23)

(یوں اُن کے دل میں تو ایک دریچہ وا ہو گیا لیکن حقیقت کی تلخی بھی اُٹھ آئی)

”1937 کے اواخر میں یہ کوندانا باں رہنے کی ایک دردناک اور مایوسانہ کوشش کے بعد



بجھ کر رہ گیا اور میرے خیالوں کے گلابی گہرے میں ایسی سرمئی لہریں دوڑا گیا جن کا آغاز کوندے کا غروب تھا اور انجام ہنوزنا پیدا ہے۔“ (24)

یوں اپنی عمر کے اکیسویں برس میں اُن کے دل کو یہ صدمہ بھی سہنا پڑا جس کی وجہ بھی اقتصادی صورت حال کی خرابی تھی۔ ابھی تک کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہ تھیم کے دل کو متاثر نہ کر سکی۔ دنیا بھر کی تناؤ بھری کیفیت میں ملازمتیں ملنا دشوار ہو گیا تھا لیکن بہر حال تلاش جاری رہی۔ 1937 سے 1939 کے دوران ندیم اکثر لاہور میں بھی قیام پذیر رہے۔ ادبی رسائل میں اُن کی شاعری اور افسانوں کی باقاعدگی سے اشاعت نے اُنہیں ادبی حلقوں میں پہچان دے دی۔ وہ اختر شیرانی اور حامد علی خان کے خلوص سے بھی متاثر ہوئے۔ بالآخر پیاسا کنویں کے پاس اس طرح پہنچا کہ:

”ہمدرد گرامی حضرت مولینا غلام مرشد صاحب (خالہ زاد بھائی) کے توسط سے مولانا عبد المجید سا لک مدیر روزنامہ ”انقلاب“ کے ہاں پہنچا اور چاکم میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کی تمام منزلیں متعین ہو گئی ہیں۔ ممدوح کی محبوب شخصیت نے میری ادبی زندگی کے ہر شعبے پر گہرے، پائیدار اور ان مٹ اثرات ڈالے ہیں۔“ (25)

”مجھ پر میری شخصیت اور میری شاعری پر سب سے بھاری احسان، گرامی قدر مولانا عبد المجید سا لک نے کیا..... اگر میری زندگی میں وہ وارد نہ ہوتے تو میں یہاں وہاں ٹھوکریں کھاتا ہوا عملاً ختم ہو جاتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، اُن ہی کی محبت اور حوصلہ افزائی کا ثمر ہوں۔“ (26)

جہاں تک ملازمتوں کی بات ہے تو ندیم جیسے ہمہ وقت فن کار کے لیے غیر تخلیقی ملازمتیں انوکھا بوجھ تھیں۔ ندیم ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

”ملازمت کا پہلا تجربہ نہایت تلخ تھا۔ میں ریفا رزمز کمشنر کے دفتر میں بطور ”محرر“ بھرتی ہوا (1937 میں) بیس روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ دفتر گلاب سنگھ پریس کے قریب ایک نکلون سی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ افسر ایک پٹواری تھا جو پلنگ پر بیٹھتا تھا اور ہم محرر لوگ نیچے فرش پر پچھی ہوئی چٹائیوں پر ووڑوں کی فہرستوں کی چیکنگ کرتے تھے۔ دن بھر فلاں ولد فلاں سکنہ فلاں کی رٹ لگی رہتی تھی۔ ایک روز پٹواری نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ پریس میں جا کر روشنائی بھر لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اس کام کے لیے چپڑا سی

موجود ہے جو باہر آمدے میں بیٹھا ہے۔ میں مخرر ہوں، میں مخرری کا ہی کام کروں گا..... اور اُس نے میری چھٹی کر دی۔“

”ٹیلی فون آپریٹر کے امتحان میں کامیاب ہونے پر مجھے اوکاڑہ میں ٹیلی فون آپریٹر مقرر کر دیا گیا۔ مگر میں اس ملازمت کو نوڈن سے زیادہ ہمداشت نہ کر سکا۔“ (27)

(تفصیل ہاجرہ سرور کے مضمون ”ندیم اور غم روزگار“ ”ندیم نامہ ملتان 1991ء ص: 54)

1939ء میں ایک محترم اور مشفق پھوپھی زاد بھائی کیمپٹن ملک امیر حیدر خان صاحب نے بڑے جان جوکھوں کے بعد محکمہ آب کاری میں میرا نام بطور سب انسپکٹر منظور کروا لیا.....

3 جولائی 1939ء کو میں نے ملتان کے دفتر آب کاری میں کام کرنا شروع کیا، بھائی کرشن چندر نے پیغام بھیجا.....

”بے کاری سے آب کاری بھلی.....“

حضرت جوش ملیح آبادی نے تحریر فرمایا.....

”جناب قبلہ و کعبہ کی آب کاری ہے..... شراب جو نہ پیئے آج کل وہ ماری ہے۔“ (28)

(سعادت حسن منٹو نے اپنے اخبار ”مصور“ میں سرخی لگائی ”شاعر محتسب بن گیا“)

”میں خانیوال اور ملتان میں بھنگ، چرس، افیون اور شراب کے کیس پکڑتا پھرا، ظاہر ہے یہ میرے ذوق کا ماحول نہیں تھا۔ محترم سالک صاحب کو لکھا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ استعفیٰ دے کر لاہور آؤ۔ بھائی جان (پیر زادہ محمد بخش) سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بھی فوراً اجازت دے دی اور میں لاہور آ گیا۔“ (29)

پیر زادہ محمد بخش اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

”یہ شاید 1941ء کا ذکر ہے جب اُس نے مجھے ملتان سے لکھا کہ ”لالہ! اسلام جن نشوں سے ہمیں منع کرتا ہے، ان ہی کے ٹھیکوں کی نگرانی میرے ذمے ہے۔ پھر مجھے بے حد غریب..... ماتم کی حد تک تلاش لوگوں پر چھاپے مارنے پڑتے ہیں اور وہ میری وجہ سے چھ مہینے، سال سال بھر جیل چلے جاتے ہیں اور ان لوگوں کا قصور صرف اتنا ہوتا ہے کہ انہوں نے افیم کی ایک گولی یا بھنگ کا ایک گلاس کیوں فروخت کیا جب کہ

اس فروخت کا حق تو صرف حکومت انگلشیہ کو پہنچتا ہے۔ میں ہر چھاپے، ہر استغاثے اور ہر مقدمے کے فیصلے کے بعد اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے اس دوزخ سے نکالے اور مجھے مستثنیٰ ہونے کی اجازت دیجیے۔ آج میرے انسپکٹر صاحب نے اپنے کمرے سے مجھے آواز دی۔ میں مصروف تھا سن نہ سکا انہوں نے جلتے ہوئے سگریٹ کا ٹرا انگوٹھے پر چڑھا کر میری طرف پھینکا جو میرے گال پر لگا۔ پلٹ کر میں نے پوچھا کہ یہ حرکت کس کی ہے؟ انسپکٹر صاحب نے جواب دیا میرے پکارنے پر آپ نے کوئی جواب نہ دیا اس لیے میں نے آپ پر سگریٹ پھینکا (آپ شاعر ہیں نا) کہ شاید آپ اس طرح متوجہ ہو سکیں۔ میں نے سامنے پڑے ہوئے قلم دان میں سے ایک دوات اٹھا کر، یہ کہتے ہوئے، انسپکٹر صاحب کے سینے پر دے ماری کہ جواب عرض ہے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انسپکٹر اپنی آلودہ شيروانی کے ساتھ ایکسائز آفیسر کے ہاں پہنچے۔ مجھے بلایا گیا اور میں نے ساری صورت حال بتا کر عرض کیا کہ میں آئندہ بھی ایسی پکار کا یہی جواب دوں گا۔ ایکسائز آفیسر معقول آدمی ہے۔ اس نے انسپکٹر صاحب کو خاصا ڈانٹا ہے مگر اب میں اس ملازمت میں نہیں رہنا چاہتا۔ میرے لیے مولانا سالک صاحب نے لاہور میں ہفت روزہ ”پھول“ اور ہفت روزہ ”تہذیب نسواں“ کی ادارت کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ بس آپ کی اجازت کا منتظر ہوں“..... ظاہر ہے کہ میں نے اُسے فوراً اجازت دے دی۔“ (30)

ندیم کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ کیجیے۔ ندیم محکمہ آب کاری جیسا ”مفید“ سمجھا جانے والا محکمہ چھوڑ کر پھولے نہیں سمائے:

”آج میری زندگی کا زریں ترین دن ہے۔ آج میں احمد شاہ ایکسائز سب انسپکٹر کی بجائے صرف احمد ندیم قاسمی ہوں! تجربات کا ایک انبار سمیٹے میں اپنے ماضی کے کھنڈروں سے رخصت ہو رہا ہوں..... 20 ستمبر 1942۔“ (31)

ندیم کو اپنی پسند کا کام تو مل گیا لیکن ان سے قلم کی اور محنت کی بہت زیادہ مشقت لی گئی۔ وہ اب کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں:

”وہ ہفت روزے اور ایک ماہنامہ مرتب کرنے کے علاوہ انہوں نے جی بھر کر نظمیں،

غزلیں، قطعات اور افسانے لکھے۔ اسی زمانے میں راجہ مہدی علی خان نے ندیم بھیا کی  
بسیار نویسی پر لطیفے گھڑے تھے۔ وہ دن رات محنت کرتے اور کم سے کم آرام کرتے۔ اس  
کا نتیجہ نروس بریک ڈاؤن کی صورت میں نکلا۔“ (31)  
جب کہ ندیم لکھتے ہیں:

”1943 میں مشہور ترقی پسند رسالہ ”ادب لطیف“ (لاہور) کی ادارت سنبھالی۔  
1944 میں سالنامہ ”ادب لطیف“ کے ایک مضمون سے خفا ہو کر حکومت پنجاب نے  
گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ ایک برس چلتا رہا۔ مئی 1945 میں مقدمہ سے بری ہو کر گاؤں  
گیا اور فروری 1946 میں علالت کے مد نظر ادب لطیف کی ادارت  
چھوڑ دی۔“ (33)

دریں اثناء احمد ندیم قاسمی کے بڑے بھائی پیر زادہ محمد بخش جب لاہور آئے تو سخت محنت، کڑی  
مشقت، مقدمات کے سلسلے کی الجھن اور سب سے بڑھ کر ایک نام تمام محبت کے شدید الم سے نبرد آزما  
ندیم کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میں اور عزیز می ظہیر باہر اُسے دیکھنے لاہور آئے تو وہ اتنا کم زور ہو گیا تھا کہ پہچانا ہی  
نہیں جاتا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ ان دنوں اس کے ذہن پر کوئی بو جھ تھا اور اُسے کوئی شدید  
جذباتی صدمہ پہنچا تھا اور وہ اس قسم کے شعر کہنے لگا تھا کہ:

جہاں پناہ مجھے بازوؤں میں لے لیجیے  
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

بہر حال وہ شاعر جو کافی عرصہ تک سگریٹ بھی مجھ سے چھپ کر پیتا رہا، مجھے کیا بتانا۔ میں  
ڈاکٹر سے دوائیں لے کر اور سب داتیں چھڑوا کر اسے گاؤں لے آیا۔“ (34)

حالات کی اس کٹھالی سے ندیم کا سونا کندن بن گیا لیکن سب سے پہلے محمد خالد اختر کا ایک شکوہ بھرا  
بیان پڑھیے:

”ندیم حد درجہ مخلص ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو بت برستی کی حد تک پوجنے لگتا  
اور آسانی سے متاثر ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں شدید جذباتی دوستیاں بنانے  
کی کوشش کی ہے۔“ (35)



جب کہ میں سوچتی ہوں کہ آخر کار ندیم کی نمایاں انفرادیت اپنی ان گنت خوبیوں اور اکاؤ کا خامیوں سمیت یہی انتہائی شدتِ اخلاصِ محبت اور غیر مشروط جرأت اظہار ہی ٹھہرتی ہے لیکن انہوں نے ہر حال میں اور ہمیشہ اپنے منفرد رکھ رکھاؤ، ناقابلِ مقابلہ مہذب رویے، صاف ستھری شرافت اور لامحدود برداشت کو بھی تو اپنائے رکھا..... تو کیا یہ سبھی چراغِ جنہیں انہوں نے مسلسل اپنے خونِ جگر سے روشن کیا اور سو سو جتن جھیل کر جن کی لووں کو ہر طرح کی آندھیوں اور بارشوں سے محفوظ رکھا..... کیا یہ سب غلط کیا؟..... کیا اچھی نیت اور سچے خلوص کے سے کم یا ب ہیرے ایک شاعر کو، ایک فن کار کو وزن نہیں دے سکے؟ کیا نیکی اور شرافت اچھی شاعری اور اچھے فن کی راہ میں رکاوٹ ہیں؟..... میں جو ایک عام انسان ہوں، میں اس سلسلے میں جوشِ صاحب سے متفق ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

”جہاں تک اربابِ نظر کا تعلق ہے وہ تو ایک نظر میں پہچان جاتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، وہ متشاعر۔ اب رہی عامۃ الناس کی بات..... سو اس باب میں یہ عرض کروں گا کہ جب وہ کسی مدعی شاعری سے دوچار ہوں تو سب سے پہلے اس بات کی تحقیق کریں کہ اس کا کردار کیا ہے..... اس کا اقارب و احباب سے برتاؤ کیا ہے اور اس کھوج میں اگر ان کے علم میں یہ بات آجائے کہ وہ دروغ گفتار، خلوص بیزار، جفا شعار، زر پرستار، فریب کار اور غدار ہے تو آنکھیں بند کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ہرگز شاعر نہیں ہے۔ شاعری و انسانیت کے اس پیہر نہ معیار پر نگاہ کر کے جب قاسمی کی جانب نظر اٹھاتا ہوں تو بلا خوفِ ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر اور انسانیت اور شعریت کا ایک ایسا دل کشا سنگم ہے جس کا اور چھوڑ نہیں مل سکتا۔“ (36)

بہر حال مجھے ذکر کرنا تھا اس صحیح معنوں میں اکلوتی اور سچی محبت کا جس کے پاس خلوص کا سرمایہ تو لا محدود تھا لیکن جو مادی و طبقاتی تفاوت کی سرحدیں عبور نہ کر سکی۔ میرے تجزیے کے مطابق معروف معنوں میں جسے ”محبت“ کہتے ہیں تو ایسی سچی میچور محبت ندیم کو ایک ہی بار اس وقت ہی ہوئی تھی اور اس کا دورانیہ غالباً 1942 سے 1946 کے درمیان کا عرصہ رہا۔ اُن کی یہی محبت ایک روشن مہربان اور حیات بخش سورج میں ڈھل کر آفاق ندیم پر ہمیشہ کے لیے تاباں رہی اور سورجوں کی سات رنگوں میں ڈھلی جگمگاتی کرنیں ان گنت ہوتی ہیں۔ سو 1942 میں ندیم کی عمر 26 برس تھی، جب کہ اگلے 64 برسوں میں اسی ایک کبھی نہ بھولنے والی محبت کی طاقت سے وہ بے شمار دوست احباب میں بزرگوں



بچوں، بھائیوں، بہنوں اور بیٹے بیٹیوں میں یہ روشنی آمیز اور روشنی آموز ست رنگی جھللاتی کر نہیں بانٹتے رہے اور اس دنیا میں اپنی زندگی کے طویل سفر کی تکمیل پر، اُس پار اترنے تک یہ سورج اُن کے ساتھ ساتھ رہا اور پوری طرح توانائی سے جگمگاتا رہا۔ یہ اسی گہری محبت کا کمال تھا کہ ان کی انسان دوستی، انسانوں سے بے پناہ محبت میں تبدیل ہو گئی:

ایک چہرہ سبھی چہروں میں نظر آتا ہے  
اس بھروسے پہ ہر انسان ہے دل بر اپنا

(ندیم)

مختصر یہ کہ درحقیقت ندیم کو ایک پرہی لکھی، سلجھی ہوئی، دانا اور خوش مذاق و خوش مزاج اور ایک اچھی فیملی سے وابستہ ہم ذوق لڑکی کی محبت میسر تو ہوئی لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک طرح سے چھین لی گئی، تب ندیم اپنے بڑے بھائی اور بھانجے کے ہمراہ اُداس اور مایوس گاؤں چلے گئے۔ اپنی مائے کی بھر پور توجہ اور دوستوں سے طویل خط و کتابت کے ذریعے وہ دکھ کے سمندر کی تہ سے ابھر آئے۔ اُن کی شعور پسندی اور حقیقت شناسی نے بھی انھیں زیادہ دیر گم سم نہ رہنے دیا۔ یوں بھی ندیم کے مزاج میں رجائیت اور اُمید سے وابستگی شروع ہی سے مستحکم تھی:

گہرے میں تڑپتے ہوئے اے صبح کے تارے  
احسان ہے شاعر پہ تری چارہ گری کا

وہ ڈوب کر بھی، اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر، پھر سے ابھر آیا کرتے رہے۔ اسی لیے 1945 کے آخر اور 1946 کے شروع میں جب ندیم نے اس غم کی گہری ظلمت سے سر اٹھایا تو ارد گردِ تحریکِ آزادی کی روشنی کو ابھرتے پایا۔ تب انہوں نے تمام توجہ اس کے لیے وقف کر دی اور:

”..... 1946 میں ”ادب لطیف“ کی ادارت سے بھی سبکدوشی کے بعد مسلم لیگ کے

پلیٹ فارم سے تحریکِ پاکستان کی عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔“ (37)

اس طرح احمد ندیم قاسمی کے عملی کردار کا ایک توانا، پُر حوصلہ اور جری رُخ ابھر کر نمایاں تر ہوا۔ پیرزادہ محمد بخش گواہی دیتے ہیں کہ:

”اس کی آدھی ”علاقت“ تو امی کے سینے سے لگ کر ہی ختم ہو گئی اور باقی علاقت کو تحریکِ پاکستان اڑا کر لے گئی (وہ پھر سے پہلے کی طرح صحت مند توانا اور پُر جوش تھا) قائد

اعظم کی رہنمائی میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ شاہ جس نے انسان دوستی، اسلام دوستی کے راستے سے حاصل کی ہے۔ اس تحریک کے نظریات سے متفق تھا۔ اسے اختلاف تھا تو یہ کہ اس کی صوبائی قیادت صد فی امراء کے ہاتھ میں تھی مگر وہ ایک بڑے مقصد کے لیے اس اختلاف کو پی جانے پر تیار ہو گیا۔ مسلم لیگ کا سبز جھنڈا کاندھے پر رکھا اور اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا جلوس لیے علاقہ سون سیکسر کے گاؤں گاؤں میں گھومنے لگا اور یوں وہ ضلع سرگودھا کے اس کوہستانی علاقے میں ایک ”خطرناک“ مہم کا لیڈر بن گیا۔“

”ہمارا علاقہ تو ویسے ہی پسماندہ اور راضی بہ ضاقسم کا علاقہ تھا۔ یہاں تو پولیس والے ہر اُس شخص کو حوالات میں بند کرنے کو تیار رہتے تھے جو مسلم لیگ، قائد اعظم اور پاکستان کا نام بھی لیتا تھا۔ لیکن شاہ کو نہ تو جھکڑیوں اور بیڑیوں کی ہر طرف سے اُٹھتی ہوئی جھنکار خوف زدہ کر سکی اور نہ اپنے خاندان کے بزرگوں کی شدید ناراضی اس کے قدموں کو جکڑ سکی۔ وہ بے دھڑک اس میدان میں کودا۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس دوران نہ صرف اس نے جلوس نکالے اور جلسے کیے بلکہ ان گنت نظمیں لکھیں اور ترانے کہے اور اپنے علاقے کی بولی میں ٹپے تصنیف کیے۔ لوگ گیتوں کی غیر فانی صنف ”ماہیا“ تک کو اس نے تحریک پاکستان کو آگے بڑھانے اور چلانے کے لیے استعمال کیا..... وہ اپنے فن کو قیام پاکستان اور آزادی وطن کے لیے مؤثر طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے لاہور کے اخباروں کو اُس علاقے کی سرگرمیوں سے باقاعدہ طور پر آگاہ رکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ یوں سمجھیں کہ اس کی صحافت کا آغاز تھا۔ ان ہی رپورٹوں سے متاثر ہو کر حمید نظامی صاحب نے شاہ کو ”نوائے وقت“ کے ادارے میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی مگر اُس نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ اس وقت اخبار کے دفتر میں کرسی پر بیٹھنے سے زیادہ مفید اور کارآمد کام کر رہا ہے۔ معروف اخبار نویس میاں محمد شفیع (م۔ش) اور میر نور احمد گواہ ہیں کہ شاہ اور علاقے کے دوسرے کارکنوں کی وجہ سے لیڈروں کے استقبال میں ایک اتنا بڑا جلوس نکلا کہ دیہاتی علاقوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔“

”اس دور افتادہ وادی میں باقاعدہ پنڈال کا نظام اور لاؤڈ سپیکروں کی فراہمی اور کچی دیواروں پر لگے ہوئے بڑے بڑے اشتہاروں اور خوب صورت اردو میں لکھے ہوئے

طویل و عریض سپاس نامے کو کون فراموش کر سکتا ہے؟ اس منظر کی کیفیت میں کیا بیان کروں گا۔ شاہ سے پوچھئے۔“  
(تفصیل مضمون ”شاہ“ ندیم نامہ۔ لاہور ملتان 1976 اور 1991 میں ہے)۔ (38)  
احمد ندیم قاسمی بتاتے ہیں کہ:

”..... میں نے اپنے علاقے میں تحریک پاکستان کے لیے بہت زیادہ کام کیا..... میرا گاؤں وادی سون سکیر میں ہے۔ میں نے وادی میں اپنے دوستوں کے ہمراہ تحریک پاکستان کو بڑے زور سے چلایا۔ بڑے بڑے جلسے کیے اور جلوس نکالے۔ ہم نے ان جلسوں میں اس زمانے کے نامور سیاسی لیڈروں کو بلوایا (علی گڑھ سے مسلم طلباء کے لیڈروں پر مشتمل گروہ بھی تربیت دینے آیا)..... لیڈروں نے بڑی زوردار تقریریں کیں۔ ہم اُس وقت نوجوان تھے اور سمجھتے تھے کہ لیڈر جو کچھ کہہ رہے ہیں، سچ کہہ رہے ہیں لیکن بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لوگ جن کے میں نے لمبے جلوس نکالے تھے، انھوں نے ہی (قیام پاکستان کے بعد) میری گرفتاری کے وارنٹ پر دستخط فرمائے..... ہمیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس ایکٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملزم کوئی ایسا کام کرنے والا ہے جو امن عامہ کے خلاف ہے۔“ (39)  
پیر زادہ محمد بخش کہتے ہیں:

”انہی دنوں برادر محترم سجاد سرور نیازی نے جو اس وقت پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے، شاہ کو پشاور بلوا بھیجا۔ شاہ لاہور واپس جانا چاہتا تھا مگر میرے سمجھانے بچھانے پر وہ مان گیا اور 1946 کے اواخر میں نیازی صاحب کے پاس چلا گیا۔ اُن کی بے پایاں محبت نے شاہ کو مسخر کر لیا۔“ (40)

ندیم ابھی پشاور ہی میں تھے کہ اگست 1947ء کا گشت میں پاکستان بن گیا۔ وہ کہتے ہیں:  
”اسی دوران جب پاکستان بنا تو ریڈیو پاکستان پشاور سے پہلا قومی نغمہ میرا لکھا ہوا نشر ہوا جسے معروف گلوکارناہید نیازی کے والد سجاد سرور نیازی نے گایا تھا۔“ (41)  
ریڈیو سے وابستہ خاطر غزنوی نے کہا:

”14 اگست 1947ء کو پشاور ریڈیو اسٹیشن سے جو سب سے پہلے تین ترانے نشر

ہوئے، وہ احمد ندیم قاسمی کے تھے، جس میں سے ایک ”پاکستان بنانے والے، پاکستان  
مبارک ہو“ بھی تھا۔ (42)

صدر ہمدانی لکھتے ہیں: (سہ ماہی ”فنون“ (گولڈن جوبلی نمبر 2014) لاہور، شمارہ: 134-2013۔  
”اے نگار وطن تو سلامت رہے“۔ ص: 25)

”پاکستان میں قومی اور ملی نغموں کی تخلیق کی عمر بھی پاکستان کی عمر کے برابر ہے اور خالق  
لوح قلم نے یہ اعزاز بھی ہمارے بزرگ اور زندہ جاوید ہمہ جہت قلم کار احمد ندیم قاسمی کو  
دیا کہ 13 اور 14 اگست 1947 کی درمیانی رات کو پشاور ریڈیو سے ٹھیک بارہ بجے  
قیام پاکستان کے اعلان کے بعد جو قومی نغمہ نشر ہوئے وہ احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے  
تھے اور ان کی مکمل تفصیل انھوں نے مجھے ایک ریڈیائی انٹرویو میں لاہور میں ستر کے  
عشرے میں ریکارڈ کروائی تھی، جواب بھی میری صوتی لائبریری میں موجود ہے۔ قاسمی  
صاحب اس وقت پشاور ریڈیو پر سکرپٹ ایڈیٹر تھے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق  
اس وقت پشاور ریڈیو کے سربراہ سجاد سرور نیازی تھے (ناہید نیازی اور ماہ رخ نیازی کے  
والد) جو خود بھی موسیقی جانتے تھے۔ انھوں نے قاسمی صاحب سے تین نغمے لکھنے کو کہا اور  
ان نعمات کی دھنیں بھی سجاد سرور نیازی نے بنائیں اور انھیں اپنی آواز میں گایا۔ ان میں  
سے ایک نغمہ جو مقبول ہوا، وہ تھا ”پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو۔“

پشاور ریڈیو سے منسلک فارغ بخاری اور محسن احسان نے بھی اپنے مضامین میں اس بات کی تصدیق کی۔  
ایک مضمون ”چند یادیں“ میں ندیم بتاتے ہیں کہ:

”میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا جب ایک پروگرام اسٹنٹ نے  
ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوا میں فار کیے اور اسٹیشن ڈائریکٹر  
نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ 13 اگست 1947 کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے  
بارہ بجے تھے۔ دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن  
سے واپس آتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں..... اور پھر  
جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلے کو آگ لگا دی گئی تو میں صدر پشاور میں حواس باختہ بیٹھا  
ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ تب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی مجھ سے چٹ



گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ”چچا جان دیکھئے آسمان جل رہا ہے۔“

”.....ملک کی سیاسی صورت حال نے مجھے قدم قدم پر چکرا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم کہاں جا کر رکھیں گے؟ میں اپنے وطن کی امنگوں اور ولولوں کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر روز نئے سے نئے فیچروں کی ذریعے اپنے رہنماؤں کو ان کے وعدے یاد دلانا رہوں مگر جب میں نے ان امور میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا تو پشاور سے بھاگ آیا اور لاہور میں آ کر میں نے بہت کچھ لکھا.....“ (43)

پشاور سے لاہور آنے کی دوسری وجہ ہندوستان میں یہ بتائی کہ:

”پھر جب میری منہ بولی بہنیں ہاجرہ سرور اور خدیجہ مستور ترک وطن کر کے لکھنؤ سے لاہور آ گئیں تو میں ان کی سرپرستی کی خاطر پشاور سے مستعفی ہو کر (مارچ 1948 میں) لاہور آ گیا۔ یہاں ہاجرہ بہن نے اور میں نے محمد طفیل کے تعاون سے رسالہ ”نفوس“ کا اجراء کیا۔ 1949 کے آخر تک یہ سلسلہ چلا۔ (44)

احمد ندیم قاسمی کی منگنی برسوں پہلے اپنے قریبی عزیزوں میں وادی سون سیکس رہی کے ایک گاؤں سوز کی میں ہو چکی تھی لیکن ہندوستان میں بھی چند برس اور بیاہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ مناسب ذریعہ آمدنی اور ایک اچھے سے چھوٹے سے گھر کے حصول کے بعد شادی کرنا چاہتے تھے۔ آخر والدہ اور بڑے بھائی کے اصرار پر وہ راضی ہو گئے۔ 4 جولائی 1948 کو رابعہ ان کی شریک حیات بن گئی۔ رابعہ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور عمر میں ہندوستان سے تیرہ چودہ برس چھوٹی تھی۔ اُسے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن اُس کے گاؤں میں ایسی سہولت نہ تھی۔ اپنے والد سے ہی گھر پر پڑھنا لکھنا سیکھا۔ اپنے منگیتر کے شعرو افسانے والے رسائل اُس کا سرمایہ تھے اور اُسے امید تھی کہ وہ بیاہ کے بعد ضرور تعلیم حاصل کر سکے گی۔ لیکن بوجہ بیاہ کے بعد بھی اُسے اپنے شوہر سے بہت دور گاؤں ہی میں ہندوستان کی والدہ کے پاس رہنا پڑا۔ سال میں چند دن ہی رابعہ ہندوستان کے پاس لاہور آ پاتی تھی یا ہندوستان آگئے چلے جاتے۔ ازدواجی زندگی کے آغاز کا عرصہ میاں بیوی کے درمیان انڈر سٹینڈنگ کے لیے بہت اہم ہوتا ہے لیکن انھیں کم ہی موقع دیا گیا۔ 1956 میں ہندوستان کی والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد بھی رابعہ لاہور نہ آ سکیں۔ آخر چودہ برس کے بن باس کے بعد 1962 میں رابعہ مستقل طور پر ہندوستان کے ساتھ رہنے کے لیے لاہور آئیں۔ اب وہ تین بچوں کی ماں تھیں۔ وہ سلیقہ مند، باہمت خاتون تھیں اور کڑے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی



جرات رکھتی تھیں۔ ندیم اور رابعہ کے مزاجوں میں فرق تو تھا، اُن میں کچھ باتوں پر اختلاف بھی تھا لیکن دونوں ساتھی ایک دوسرے سے مخلص تھے اور برہنہ ہر سب تک اوروں کی طرف سے کھڑی کی گئی مسلسل رکاوٹوں کے باوجود اپنا گھرانہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ تنگی ترشی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ رابعہ نے گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں بخوبی سنبھال کر ایک طرح سے ندیم کو بے فکر کر دیا۔ ذرائع آمدن محدود تھے جب کہ ندیم کا ہاتھ کھلا تھا۔ وہ دوسروں کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اسی لیے دونوں میں طے پایا کہ مشاعروں کی آمدنی اور انعامات کی رقم ندیم اپنی مرضی سے خرچ کریں گے جب کہ کالم نگاری یا ملازمت کی آمدن زیادہ تر گھر پر خرچ ہوگی اور رابعہ نے کفایت شعاری سے کام لے کر گھر بھی تعمیر کروایا، آہستہ آہستہ اپنے بچوں کو ضروریات زندگی بھی مہیا کرنے کی سبیل نکال لی۔ اسی میں اللہ تعالیٰ نے خوب برکت دی اور پھر انھوں نے آخر تک تنگی نہیں دیکھی۔ وہ دونوں صبر و شکر اور خالص سکون سے رہنے بسنے لگے۔ دونوں نے بچوں کی اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر بہت کچھ سہا۔ محنت بھی کی۔ پھر تینوں بچوں کی شادیاں بھی کیں۔ پوتا پوتیاں، نواسے نواسیاں دیکھیں۔ 1987 میں دونوں نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ غرض یہ کہ دونوں نے تقریباً پینتالیس برس مختلف حالات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود مناسب طریقے سے اور ٹھیک ٹھاک انداز میں گزارے۔ 1980 کی دہائی میں ندیم کے ایک منہ بولے رشتے کی انتہائی خود غرضی اور ناروا سلوک کی وجہ سے رابعہ بہت مضطرب رہیں اور وہ بیمار رہنے لگیں ندیم سمیت سب نے ان کی بہت دلجوئی کی اور ان کا بہت خیال رکھا۔ رابعہ ندیم کا انتقال اپریل 1992 میں ہوا۔

احمد ندیم قاسمی 1944 میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے۔ یہ اُن کی زندگی کا نہایت اہم فیصلہ تھا۔ جس کے دور رس اثرات اُن کی زندگی اور فن پر مرتب ہوئے۔ 1949 میں منعقدہ کل پاکستان کانفرنس میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کے سیکرٹری جنرل بنائے گئے جب کہ بعد میں انھیں جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان منتخب کیا گیا۔ ندیم ایک انٹرویو میں اس تحریک کے بارے میں نوجوانوں کے سوالات کے یوں جوابات دیتے ہیں:

”ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ انسان کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جائے، بنیادی انسانی حقوق کے ساتھ بدسلوکی ختم کی جائے اور ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں استحصال کا نام و نشان نہ ہو۔ ہر شخص معاشی لحاظ سے خود کفیل ہو اور کسی کا محتاج نہ ہو۔“

”ہماری تحریک کے مقاصد ذہنوں میں نفوذ کر گئے تھے اور اب بھی اس تحریک کے

اثرات نظر آتے ہیں۔ بے شک تنظیم ختم ہو گئی مگر تحریک اب بھی جاری و ساری ہے، جو بھی نیا نو جوان لکھنے کی طرف آتا ہے، وہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ نثر، افسانے اور نظم میں انہی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔“

”اس تنظیم (انجمن ترقی پسند مصنفین) کے لیے اتنا کچھ کیا، دوبارہ جیل بھی گیا۔ ایک بار 1951 میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے دور میں اور دوسری دفعہ ایوب خان کے دور میں (1958 میں)۔ ہم نے بے روزگاری بھی دیکھی۔ اس لیے کہ ریڈ یونک میں ہم پر پابندی تھی (ٹی۔وی اُس زمانے میں نہ تھا) نہ تقاریر لکھ سکتے تھے، نہ مشاعرہ کر سکتے تھے۔ ہم نے بہت مشکل وقت بھی گزارے ہیں مگر اس کے باوجود ہم اپنے نظریے پر قائم رہے۔“ (45)

احمد ندیم قاسمی نے حسب معمول ہر تعلق کی طرح اس تعلق کو بھی آخر تک بحسن و بخوبی نبھایا اور ہر کڑے وقت میں بھی اس تحریک کا دفاع کیا۔ 1950 کے بعد کم و بیش 56 برس کا طویل سفر ہے جس کے بارے میں اُن کے بیشتر ہم عصر لکھ بھی چکے ہیں۔ اگر میں اس کا جائزہ لوں تو الگ سے ایک پوری کتاب تخلیق کرنا ہوگی۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ندیم اُن چند لوگوں میں سے ہیں جو اپنے عقیدے، اپنے نظریے، اپنی انسان دوستی، اپنی فن شناسی اور اپنے وطن سے محبت کو ہمیشہ سنبھالے رہے۔ اُنہوں نے اُن کے لیے کسی سے کوئی کجھوتہ نہیں کیا۔ یہی اُن کی جرأت، خودداری، خلوص نیت اور عزت نفس کا ثبوت ہے۔ ندیم تمام عمر نہ صرف دُنیا بھر کے انسانوں کے بارے میں لکھتے رہے بلکہ اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کے ہر دکھ شکھ میں بھی قلم اور عمل کے ذریعے برابر کے شریک رہے۔

مناسب رہے گا کہ اب مختلف ذیلی عنوانات کے تحت اس طویل سفر حیات کے حاصل کے طور پر نمایاں سنگ میل کا مختصر جائزہ سمیٹا جائے۔ یوں بھی بنیادی طور پر اس کتاب کا مقصد پاکستانی اردو ادب کے ایک معمار کی شخصیت اور فن کا تعارف سامنے لانا ہے۔ میں اب بھی اپنے آپ کو ایک طالب علم سمجھتی ہوں۔ جب کہ تحقیق، تنقید اور جائزہ تو جیسا کہ میں ہمیشہ کہتی ہوں، اہل اور لائق محققین، ناقدین اور دانشوروں کا حق اور انہی کا منصب ہے۔ سو اُن کے حصے کا کام تو اُن ہی کے سپرد ہے اور میں اپنے حصے میں آئی تعارف کی ذمہ داری کو بخوبی سرانجام دینے کی اپنی سی کوشش جاری رکھتی ہوں۔

☆☆☆

## باب دوم

### ندیم آئینے (اقتباسات کے دریچوں میں)

#### ندیم یوم پیدائش:

20 نومبر 1916ء۔ جائے پیدائش: گاؤں ”انگہ“ وادی سون سکسر، ضلع: خوشاب، صوبہ: پنجاب،  
ملک: اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ (1)

#### ندیم نام:

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیم  
میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

(ندیم)

والدین نے احمد شاہ نام رکھا۔ چودہ برس کی عمر میں پہلی شائع ہونے والی نظم (روزنامہ: ”سیاست“  
میں جنوری 1931ء۔ لاہور۔ مدیر سید حبیب) پیرزادہ احمد شاہ احمد کے نام سے شائع ہوئی۔ پندرہ برس  
کے احمد شاہ نے روزنامہ ”سیاست“ سے وابستہ مقبول انور داؤدی کے کہنے پر اسی اخبار میں لکھنے والے  
ان کے نوجوان غزل گود دوست شاعر غزنوی کو خط لکھا۔ جنہوں نے تخلص ندیم تجویز کیا۔ یہ احمد شاہ کو بے  
حد اچھا لگا۔ (2) تب نام کا پہلا حصہ ”احمد“ برقرار رکھتے ہوئے ”ندیم“ تخلص کیا اور خاندان کے بزرگ  
قاسم کی آل سے وابستگی کی وجہ سے ”قاسمی“ اپنایا۔ یوں ادبی نام احمد ندیم قاسمی طے کیا۔ اس حسین اور  
خوش قسمت نام کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہمارے یہاں علامہ اقبال کے بعد ندیم کا نام ایسا ہے  
جسے اکثر والدین نے اپنے بچوں کے لیے پسند کیا۔ جب کہ بقول جمیل یوسف:

”احمد ندیم قاسمی کے نام میں ایک طرح کی موسیقیت ہے..... اُن کا نام پڑھاتو محسوس

ہوا جیسے کسی غزل کا مصرع ہے..... مجھے یاد ہے کہ میں نے یہ نام گرامی دو تین بار گنگنانے کے انداز میں دہرایا..... (یہ) نام زبان پر آتے ہی نقش ہو گیا اور میرے شعور کا حصہ بن گیا۔ بہت کم شخصیات یا اُن کے ناموں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اُنہیں دیکھتے ہی یا اُن کا نام سنتے ہی وہ ہمیشہ کے لیے آپ کے شعور کا حصہ بن جائیں“ (3)

ڈاکٹر مسرور احمد زئی لکھتے ہیں:

”احمد شاہ ایک فرد کا نام ہے۔ اس نے ذکاوت سے، ذہانت سے اور استقامت سے کام لے کر احمد تیم قاسمی کا مقام حاصل کر لیا ہے، جو کسی فرد کا نہیں بجائے خود ادارے کا، دبستان کا، نظریے کا اور فکری منزل کا نام ہے، (۸۰) اسی سال میں اس فرد نے ادارہ بنتے بنتے اپنے نقوش ادب و معاشرت سے لے کر صحافت و سماج تک جس طرح مرتسم کیے وہ ایسے ہیں جن کی قدر کی جائے، جنہیں فروغ دیا جائے اور جن کی پاسداری کی جائے۔“ (4)

ڈاکٹر صابر آفاقی کا کہنا ہے:

بابا قاسمی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تحریک کا نام ہے۔ اس نے دنیا بھر کے مظلوموں، غلاموں اور پسے ہوئے لوگوں کے حق میں آواز اٹھائی..... اپنی مٹی سے پیار قاسمی کے خمیر میں شامل تھا..... قاسمی محبت کا نام تھا۔“ (5)

اور افضل تو صیف یوں اظہار خیال کرتی ہیں کہ:

”ایک خوب صورت نام، لاہور کے بڑے ناموں میں ایک نام، اس نام کے ساتھ کتنے اور نام جڑے ہوئے ہیں کتنی ہستیاں اور حیثیتیں لے کر چلتی تھیں، یہ نام کہ ایک شاعر تھا، افسانہ نگار، کالم نویس، دانش اور ایڈیٹر اس نام کے ساتھ جڑے تھے۔ کئی اور نام اور تاریخ کے کئی اور باب، کئی زمانے اس نام کو لکھ چکے، اپنے اپنے ورقوں پر۔ اردو ادب، پاکستانی ادب اور بیسویں صدی کا ادب جہاں دیکھو کئی بڑے ناموں کی سنگت میں ایک چمکیلا معتبر نام احمد تیم قاسمی! کتنا کچھ لکھا، کتنے برس لکھا اور کتنے لکھنے والے پیدا کیے۔ ان کی زندگی وقت کے کئی ادوار سے گزری بہت کچھ بنایا، اک پورا جہان آباد



کیا۔ اس جہان کی اپنی تہذیب تھی۔ اپنا قرینہ تھا، اپنی خوشبو تھی، اپنا رنگ و آہنگ“ (6)  
 ندیم صاحب کو ”بابا“ کہنا سب سے پہلے اُن کی پہلی نواسی نوشین نے 1975 میں اور پہلے نواسے  
 نیر نے 1978 میں شروع کیا۔ اس کے بعد اس نام سے انہیں اوروں نے بھی پکارا۔

### ندیم پرورش:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی  
 یا بندہ صحرائی یا مرد گہستانی

(اقبال)

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

”میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نبانے  
 کے لیے ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ  
 مدر سے جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے  
 محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پر بہہ نکلتے تھے لیکن میرے لباس کی  
 صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی ”گیٹ اپ“ کسی سے کم نہ ہوتی  
 تھی۔ گھر سے باہر احساس برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے  
 آگینے پھو رہو جاتے تھے جنہیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے۔ پیاز، سبز مرچ یا نمک  
 مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت، زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی  
 تھی..... والد گرامی پیر تھے۔ یاد الہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے  
 لگیں کہ مجذوب ہو گئے اور جن عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا، انہوں نے  
 ڈیڑھ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔ تین پیسے روزانہ کی اس آمدن میں اماں مجھے روزانہ  
 ایک پیسہ دینے کے بجائے میرے آنسو پونچھ لینا زیادہ آسان سمجھتی تھی۔ گھرانے کی  
 اس عزت کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے حساس بنا دیا اور ممکن ہے اسی گداز نے  
 مجھے فن کار بنایا ہو۔ اگر بچپن میں مجھے ماں کی محبت نہ ملتی تو ممکن ہے آج میں نہایت کلبی و  
 قنوطی ہوتا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ جب ہم بہن بھائی اپنی اماں کا ہاتھ بٹاتے، وہ چہرہ کاتیں



اور ہم پونیاں بناتے، وہ چکی پیستیں اور ہم مل کر گیت گاتے، وہ کوٹھے کی لپائی کرتیں اور ہم سیڑھی سے چٹے کھڑے رہتے..... وہ زبرد لب کوئی آیت کریمہ پڑھتیں اور ہم تینوں (بڑی بہن، بڑا بھائی اور ندیم) پر ”چھو“ کرتیں اور یہ ”چھو“ ہوتے ہی زندگی کی ڈالیاں پھولوں سے لد جاتیں۔“ (7)

”عمر کے ابتدائی نو برس گاؤں میں گزارے۔ پانچواں سال گاؤں کی مسجد کا درس لیتے گزرا۔ 1924 میں والد گرامی چل بسے۔ 1925 میں ابتدائی چار جماعتیں پاس کر کے اپنے چچا جان خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم کے ہمراہ کیمبل پور (انک) چلا گیا۔ وہ ان دنوں انک میں اسٹرا اسٹنٹ کمشنر تھے۔ وہاں مازوعم میں پلا اور آرام و آسائش سے زندگی بسر ہونے لگی۔ مگر اس نئے پلٹے نے میری ذہنی دنیا پر بجلی گرا دی۔ دس مہینے نہایت ٹھاٹ سے گزار کر جب میں ہر سال گاؤں آتا تو اچانک جیسے سدھری کی بلندیوں سے تخت الڑی میں پٹخ دیا جاتا۔ حالات کا تشاد شدید صورت اختیار کر چلا تھا اور جذبات اتنے گداز ہو گئے کہ معمولی سے معمولی واقعہ بھی ایک ابدی نقش چھوڑے بغیر نہ گزر سکا۔“ (8)

### عہدِ سرِ پاپ:

پیر زادہ محمد بخش اپنے چھوٹے بھائی کے بچپن کا منظر اس طرح دکھاتے ہیں:

”گھر کے صحن میں ایک گول منول ہرخ وسفید بچہ اچھل کود میں مصروف ہے۔ بھرا بھرا جسم، گھنگریا لے بال، مونو مگر معصوم ناک نقش، کبھی اپنی بڑی بہن کو جا کر چھیڑتا ہے اور کبھی اپنے بڑے بھائی کو۔ کبھی امی کی گود میں دھم سے جا گرتا ہے اور کبھی آپا کی سہیلیوں کے چٹکیاں لے کر بھاگ جاتا ہے جب سب خفا ہونے لگتے ہیں تو دور ہٹ کر وہ کوئی ایسی چلبلی حرکت کرتا ہے کہ سب کھکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔ امی اُس کی بلائیں لینے لگتی ہیں، آپا اس کا منہ چوم لیتی ہیں۔ بڑا بھائی سینہ سے لگا لیتا ہے یہ ہے ہمارا ”شاہ“ کہتے شاہ، جو آج کل ”حضرت احمد ندیم قاسمی“ کہلاتا ہے اور جسے ہم پیار سے ”شاہ“ کہتے ہیں۔“ (9)

ندیم کے سکول کے ساتھی احمد شفیع بتاتے ہیں:

”اُس وقت کے ایک مختصر سے شہر (کیمبل پور) میں ایک خاموش طبع، مخنتی اور شریف الطبع بچہ جو بلوغت کے مدارج نہایت ہی دل پذیر اور شریفانہ انداز سے طے کر رہا تھا۔“ (10)

اور نو عمر ندیم کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”احمد شاہ صہب اول کے ڈیک پر بیٹھتا تھا۔ وہ ایک ذہین اور مخنتی طالب علم تھا، اس لیے وہ ساندہ کے بالکل سامنے بیٹھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا اسے صرف اپنے کام سے کام تھا۔ سرپرتر کی ٹوپی، شلوار قمیض اور چھوٹا کوٹ اس کا ملبوس تھا۔ سادہ زندگی، سادہ مزاج، سادہ کھانا، ایک سیدھا سادا مسلمان، دوستوں کا دوست، دشمن کسی کا بھی نہیں..... اپنی کتابوں کے ساتھ احمد شاہ کی لگن اور کرید اُسے دوسرے طالب علموں سے ہمیشہ الگ رکھتی تھی اور اُس کی باوقار خاموشی میں مستقبل کا ایک جبری دانشور پرورش پا رہا تھا۔“ (11)

نوجوان ندیم سے پہلی ملاقات کا تاثر اُن کے دوست محمد خالد اختر اس طرح بیان کرتے ہیں:

”یہ گٹھے جتنے کا فراغ رو دیہاتی نوجوان ایک فطری شاعر تھا اور اس وقت بھی ہم اس سے مستقبل میں بڑی چیزوں کی توقع رکھتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ جلد ہی شعرو ادب کی دنیا میں اپنا مقام حاصل کر لے گا۔ وہ اپنے پروفیسر کا چہیتا طالب علم تھا اور فورٹھائر میں آکر سو لجرز گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا اور کالج میگزین ”نخلستان“ کے اُردو حصے کا ایڈیٹر بھی۔“ (12)

”اب میں سوچتا ہوں۔ کیا یہ وہی ندیم ہے جو پچیس تیس سال پہلے میری زندگی میں آیا تھا؟ وہ کڑیل، تازہ رو، جذباتی دہقانی لڑکا جو اس وقت بھی اپنے گاؤں کی لہرائی پکڑنڈیوں اور ان پر چلتی ہوئی الہڑمبوجیوں کے گیت لکھا کرتا تھا!!“ (13)

اس کڑیل نوجوان کے بارے میں عبداللہ جاوید لکھتے ہیں:

”پنجاب کے دیہاتوں میں پروان چڑھا ہوا جوان ہر سے پاؤں تک قبول صورت، لیکن گبر نہیں۔ گبرواتے سنجیدہ نہیں ہوتے۔“ (14)

ندیم صاحب کے صاحب زادے نعمان ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ:

”ابا جی بے حد حسین جسم کے مالک تھے۔ اُن کے اعضاء کا تناسب اور اپنے آپ پر کنٹرول بے مثال تھا۔ میں گواہ ہوں کہ اُن کا وجود کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، چلتے پھرتے ہوئے، ہستے بولتے ہوئے، غرض ہر لمحہ پر کشش اور پر وقار مردانہ جسمانی وجاہت ظاہر کرتا اور اُن کے چہرے کی رنگت آخری لمحوں میں بھی، زندگی سے بھرپور سفیدی میں جاندار سُرخمی لیے ہوئے تھی۔“ (15)

مجتبیٰ حسین نے تحریر کیا ہے:

”خندہ پیشانی کے ایک معنی تو لغت کے بے جان صفحات میں ہیں دوسرے معنی احمد ندیم قاسمی کا چہرہ ہے۔ کبھی خاموش، کبھی بولتا ہوا مگر ہر صورت میں ”خوش آمدید“ کہتا ہوا۔ کتابی ایسا کہ ہر لفظ، ہر سطر پڑھ لیجیے۔ کہیں گنگناہٹ نہیں، کہیں تنقید نہیں۔ آنکھوں میں وہی روشنی جو پیشانی پر۔ لبوں پر افسانہ، غزل اور اس سوال کا تسکین آمیز جواب جو ابھی آپ کے دل میں ہے۔ ندیم سے مل کر پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ بے گھری، درود یار بنانے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دھوپ ڈھل رہی ہے، درختوں کا سایہ بڑھ رہا ہے۔“ (16)

جب کہ محمد سعید شیخ کے مطابق آخری برسوں میں جب:

”انھیں دیکھتا تو جسمانی کمزوری کے باوجود ان کے چہرے پر عجیب سی روشنی اور رونق دیکھنے کو ملتی۔“ (17)

ندیم صاحب کی آنکھوں کے بیرونی گوشوں میں دو ننھے منے گول ابھارے موتی کی طرح جڑے نظر آتے۔ ان کے بارے میں استفار پر وہ کہتے: ”دراصل یہ وہ آنسو ہیں جو بہہ نہیں سکے۔“  
صلاح الدین حیدر بتاتے ہیں کہ:

”تمام تر مشکلات کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک طمانیت کے ساتھ مسکراہٹ کھیلتی ہوئی ملتی تھی۔ آنکھوں میں زندگی سے لبریز شوخی اور اعتماد کی لہر نظر آتی، اُن کی تھوڑی کے پاس بائیں جانب ہونٹ کے نیچے لمبی لکیر کی شکل میں ایک زخم کا نشان تھا تاہم ہوا نظر آتا تھا جس کے بارے میں استفار کرنے پر معصومیت سے بتاتے کہ یہ زخم

ما دانتکی میں اتفاق سے اُن کے بھائی نے لگایا۔ شاید یہ مشکلات کے ساتھ حوصلہ مندی سے چینے کی ابتدائی تربیت کا اثر تھا کہ اکثر دانتکی سے دُشمن لگانے والے کو بھی بھائی سمجھ کر گلے لگالیتے تھے۔“ (18)

ڈاکٹر مسرور احمد زئی لکھتے ہیں:

”ندیم صاحب سے مل کر اس بات پر ایمان لے آئے کہ جی چاہتا تھا کہ ”شاخ شرباز“ ختم رہتی ہے۔“ اُجلی رنگت، دھیمالہجہ، مشفقانہ برتاؤ، خوش لباس و خوش گفتار، بات کاٹ کر بولنے میں احتیاط، اختلافی بات کاٹ دینے میں کمال!“ (19)

## ندیم قبیلہ:

اعوان

## ندیم مادری زبان:

پہاڑی پوٹھوہاری پنجابی (ہندکو اور سرانگی زبانوں سے ملتی جلتی)

## ندیم عقیدہ:

یہ درست ہے کہ کسی کے اپنے خالق سے مالتے کی نوعیت پر بحث مناسب نہیں اور ایمانیات کے مسئلے کو خدا اور بندے کے درمیان ہی رہنے دیا جانا چاہیے۔“ (20) لیکن یہ تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے کہ کسی کا کوئی عقیدہ بھی ہے۔ دراصل کچھ ترقی پسندوں کو ندیم کی مذہبیت کے بارے میں ذکر سننا پڑھنا پسند نہیں جب کہ کچھ افراد کو ندیم کی ترقی پسندی کے ذکر سے پریشانی ہوتی ہے۔ حالانکہ ندیم کے عقیدے اور ان کے نظریے میں ٹکراؤ نہیں تھا بلکہ ان دونوں نے مل کر انسان دوست ندیم کی شخصیت کو پرکشش توازن دے دیا تھا۔ یوں وہ کسی بھی طرح کی انتہا پسندی سے محفوظ رہے اور اسی لیے انہوں نے شعر ہو یا افسانہ، کالم ہو یا مضمون، ان میں جو بھی بات کی۔ ہمیشہ روشن سوچ اور کھلے دل کے ساتھ بلا جھجک، بلا تردد، بڑی جرأت اور نہایت ہی اعتماد سے کی۔ اس ذیلی عنوان کے تحت یہاں ندیم کے مذہب اور عقیدے کی وضاحت کے سلسلے میں کچھ مقدمات دیئے جا رہے ہیں تاکہ

قارئین اپنی بھی کوئی رائے قائم کر سکیں۔

امجد رؤف خان کو انٹرویو دیتے ہوئے ندیم نے کہا:

”الحمد للہ میں ایک مسلمان ہوں۔ میں نے پیروں کے خاندان میں آنکھ کھولی۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں۔ حضرت محمدؐ کو خاتم النبیین مانتا ہوں۔ مذہب کو ایک قوت، محبت کی روشنی سمجھتا ہوں۔“ (21)

ندیم کے فلسفہ مذہب کی وضاحت میں محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

”قاسمی کی ترقی پسندی دراصل اسلامی انسان دوستی کے جذبہ کا سیکولر رخ ہے۔ وہ مذہب بے زاری اور الحاد سے کوسوں دور ہیں ’جلال و جمال‘ کے دیباچے میں خود ان کے الفاظ میں:

”انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں خدا سے کیوں پیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب ہمیں بد اخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا۔ مادہ کی قوت مسلم، لیکن مادہ کی تکنیکیں تعبیر کے پاس پردہ جو ایک غیر محسوس حسن کا رفرما ہے اس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالم گیر حسن و خیر کا احساس ہے۔ جنس ہو یا انقلاب، مذہب ہو یا الحاد ہم ہر حال میں اپنے دین کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔“ (22)

الطاف حسن قریشی کا کہنا ہے:

”قاسمی صاحب کی عظمت یہ ہے کہ اشتراکی تصورات کے ساتھ ایک گونہ وابستگی کے باوجود دین سے ایک سرشاری اور توانائی حاصل کرتے رہے۔ ان کے ہاں مولویوں کے خلاف تو نفرت کا اظہار پایا جاتا ہے مگر اپنے دین، اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب کے قلم سے ایسی ایسی خوب صورت اور روح پرور نعتیں تخلیق ہوتی ہیں، جو قلوب و اذہان کو ایک نئے انداز کی تازگی اور سرمستی عطا کرتی ہے۔“ (23)



عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

”مہتمم (وہاں کی سب سے بڑی جامع مسجد) میں ہم سب وضو کرتے ہیں اور میں ندیم صاحب سے کہتا ہوں ”آج ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے“ ندیم صاحب تیار ہو جاتے ہیں اور امام کے مصلے پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور پھر اس روز ہم نے ندیم صاحب کی امامت میں نماز عصر ادا کی!“ (24)

جب کہ گلزار جاوید کو انٹرویو دیتے ہوئے ندیم صاحب کہتے ہیں:

”میں کٹر مذہبی تو کسی صورت نہیں ہوں۔ میں تو بڑا فراخ دل مسلمان ہوں اور ہر اس نیک آدمی کو سینے سے لگانے کو تیار ہوں جو چاہے کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو مگر عملاً نیک ہو۔ پکا ”ترقی پسند“ یقیناً ہوں۔ میرا مذہب میری ترقی پسندی سے کسی طرح بھی مزاحم نہیں ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ خود اسلام بے حد ترقی پسند مذہب ہے۔“ (25)

### ندیم خاندان:

بقول ندیم:

”میرا خاندان علاقہ سون سکیسر کے معزز ترین گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ احترام دنیوی دولت سے زیادہ مذہبی بزرگی کا منت کش ہے۔“ (26)

احمد غزالی اپنی کتاب ”وادئ سون سکیسر“ میں لکھتے ہیں:

”ان کا خاندان علمی فضیلت اور تقویٰ کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ حضرت چن بیر (والد ندیم) نے اس خاندانی روایت کو زندہ رکھا۔ 1924 میں جب حضرت چن بیر نے رحلت فرمائی تو علم دوستی اور پرہیز گاری کا یہی ترکہ اپنے پسماندگان کو دے گئے۔“ (27)

عبدالقادر حسن کا کہنا ہے:

”قاسمی صاحب کے اپنے آباؤ اجداد رہنے والے تو وادی سون کے تھے اور ان کا گاؤں ”مگنہ“ حضرت سلطان بابو کا گاؤں بھی تھا۔ لیکن ان کی عادات و اوصاف، گفتگو اور

رہن سہن میں مجھے وادی سون کا ان گڑھ اور کرخت کلچر کبھی دکھائی نہیں دیا..... قاسمی صاحب ایک تعلیم یافتہ اور وادی سون سکیم کے معیار سے ایک خوش حال خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پوری وادی میں ان کے خاندان کا احترام رہا تھا۔ پیروں کی اولاد تھے اور ایک پیرزادہ کہلاتے تھے قاسمی صاحبان کا خاندان ایک شوقین اور نفیس خاندان ہے یہ چائے میں شہد ملاتے تھے..... ان لوگوں کا لباس صاف ستھرا اور قیمتی ہوا کرتا تھا قاسمی صاحب میں اس خاندان کی ثقافت بھرپور انداز میں دکھائی دیتی تھی۔“ (28)

بارون رشید لکھتے ہیں:

”بابا جیسے نفیس اور بے نظیر لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں اور بڑے دین دار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مذہب سے ان کی کمٹمنٹ ان کے حمدیہ اور نعتیہ کلام میں بدرجہ اتم نظر آتی ہے وہ خود ایک تہذیب تھے، جو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہے وہ بہت محنت کرتے تھے، سیلف میڈ انسان تھے، ساری انسانیت کے لیے بلانڈ ہب قوم درد رکھتے تھے۔“ (29)

### مدتیم رشتے:

مدتیم آٹھ برس کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ (1924 میں) جب کہ اپنی والدہ کے بارے میں مدتیم کا کہنا ہے کہ:

”میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری ماں کا ہے۔“ (30)

یہ وہی عظیم ماں ہیں کہ جب 1951 میں مدتیم سینٹی ایکٹ کے تحت جیل گئے تو چند قریبی عزیزوں نے ان کے والدہ صاحبہ کی طرف سے معافی نامہ لکھ کر انھیں جیل سے رہائی دلوانا چاہی۔ ایک بزرگ درخواست لکھ کر ”انگہ“ ان کی والدہ صاحبہ کے پاس حمایت حاصل کرنے کے لیے گئے۔ والدہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ کاغذ چھو کر اپنے بھانجے سے پوچھا: ”کیا لکھا ہے اس میں؟“ انھیں معافی نامہ کی تجویز بتائی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر انگوٹھا لگانے سے انکار کر دیا کہ:

”میرے بیٹے نے کبھی کوئی ایسا غلط کام نہیں کیا جس پر اسے یا مجھے معافی مانگنی پڑے۔“ (31)

مدتیم کے دوست خالد اختر اپنے نو عمر دوست کے بارے میں یہ بتاتے ہیں کہ:

”باہر کی دنیا کی مہربانی اور بے دردی نے اس خام دہقانی نوجوان کے حساس دل کو

بری طرح مجروح کیا اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے میں ایمان نے اسے انتہائی قدم اٹھانے سے روکا۔ ہر خط میں وہ اپنی بوڑھی ماں کا ذکر ضرور کرتا جو اس کے نزدیک ساری دنیا کی عظیم ترین عورت تھی۔ ندیم اپنی ماں کو ہینتینا پوجتا تھا۔“ (32)

ندیم کی منہ بولی بہن خدیجہ مستور رکھتی ہیں:

”ندیم کبھی یہ نہیں بھولتے کہ ان کی زندگی میں جو سب سے پہلی عورت آئی وہ ان کی ماں تھی اور ماں کے وجود سے انھیں عورت کی عظمت اور تقدس کے احساس کا سبق ملا۔“ (33)

ندیم کی ایک اور منہ بولی بہن ہاجرہ سرور کا کہنا ہے:

”احمد شاہ بے حد خوش نصیب تھے جو اس گھر میں پیدا ہوئے، کیوں کہ اس گھر میں ایک بڑی بہادر اور محترم ماں رہتی تھیں۔ یہ ماں زندگی کی مسدود راہوں کو دیکھ کر ہمت نہ ہارتیں اور وہ پگڈنڈیاں تلاش کر لیتیں، جن پر چل کر اپنے بچوں کی خوشیوں کے پھول جنم لاتیں۔ کیا ہوا جو وہ اپنے بچوں کے لیے ولایتی کھلونے خریدنے کی سکت نہ رکھتی تھیں مگر وہ ان کے کھیلنے کے لیے روٹی اور چھینٹ کے کپڑوں سے خوب صورت گیند تو بنا سکتی تھیں۔“ (34)

ندیم کی اکلوتی بہن سعیدہ بانو کا ذکر پیرزادہ محمد بخش اس طرح کرتے ہیں:

”آپا نے تو شاہ (ندیم) کو باقاعدہ اپنی چھوٹی بہن بنا رکھا تھا۔ دونوں بیٹھے دیر دیر تک گڑیاں کھیلتے رہتے تھے۔ ویسے شاہ محلے بھر کے لیے ایک تھفہ تھا جس کے بغیر نہ لڑکوں کو آرام آتا نہ لڑکیوں کو چین۔ کبھی لڑکوں میں رلہ بنا بیٹھا ہے اور کبھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ان کے ساتھ اپنے گڈوں کے بیاہر چا رہا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے شاہ سے ندیم بن جانے کے بعد کہا تھا:

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں (35)

کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں“

ہاجرہ سرور بیان کرتی ہیں:

”گھر میں ننھے احمد شاہ سے آٹھ سال بڑی ایک بہن بھی تھیں، جن کا دامن پکڑ کر انہوں نے چلنا سیکھا اور یہ تھیں سعیدہ آپا۔ بہنیں تقریباً ہر گھر میں ہوتی ہیں مگر ننھے احمد شاہ کی

بہن ایک ایسی غیر معمولی شخصیت کی مالک تھیں، جن کے وجود نے ننھے احمد شاہ کے دل میں بہن کے رشتے سے والہانہ محبت اور احترام کا بیج کچھ اس طرح بویا کہ وہ بڑھ کر چھتنا درخت بن گیا۔ ایک ایسا چھتنا درخت جس کی چھاؤں میں بیٹھی میری جیسی کئی بہنیں فخر کرتی ہیں۔“ (36)

(انہوں نے تسنیم سلیم چھتاری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور ان کی بہنوں کو اور ادا جعفری اور دیگر کو منہ بولی بہنیں کہا اور بھائی کی شفقت دی)۔

ندیم صاحب اپنے بڑے بھائی کے نام ایک کتاب کے انتساب (افسانوی مجموعہ ”بگولے“ 1941) میں لکھتے ہیں:

”میرا بزرگ پیر زادہ محمد بخش صاحب قاسمی کے نام جنہوں نے میرے بچپن کی نیم شگفتہ، نیم پڑ مردہ گھڑیوں، سن بلوغ کے احساس کی آنچ سے تپتے لمحوں اور شباب کی دھڑکتی اور بھڑکتی ساعتوں میں متنبہم چہرے اور پر خلوص ولولے سے میرا ساتھ دیا اور بارہا مجھے نا اُمیدی اور تذبذب کے غاروں میں گرنے سے بچایا۔“ (37)

اور بڑے بھائی بہت پیار سے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

”1925 میں پرائمری امتحان پاس کر کے شاہ کیمبل پور میں مجھ سے آ ملا۔ یہاں آ کر بھی اس کی شادیوں اور شرارتوں میں کوئی افادہ نہ ہوا۔ حد یہ کہ چچا کے سے سنجیدہ بزرگ اور چچی جان کی سی باوقار خاتون بھی شاہ کی معصوم شرارتوں میں دلچسپی لینے لگے۔“ (38)

ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں:

”یہ چچا اور چچی نیکی کی ایک مثال تھے۔ انہوں نے محسن کی طرح نہیں، ماں باپ بن کر ان بچوں کو اپنے زیر سایہ رکھا۔ یہاں یہ بچے ٹھاٹ سے ہنگلے میں رہتے اور موٹر میں گھومتے۔“ (39)

ندیم اپنی والدہ، بڑی بہن اور بڑے بھائی کا بہت احترام کرتے۔ ان کا کہنا کسی صورت میں نہ مالتے۔ وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کا بھی بے حد خیال رکھتے۔ انھیں اپنے اکلوتے بھانجے ظہیر باہر سے بے حد محبت تھی۔ انہوں نے منہ بولے رشتوں کو بھی بہت خلوص اور نیک نیتی سے نبھایا۔ بہنیں بھائی، بیٹیاں اور بیٹے کہہ کر مکمل شفقت اور رہنمائی دی۔ ندیم کے مجموعہ کلام ”دوام“ 1979 کے

امتناب میں سے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اپنے اُن اہل خاندان کے نام  
جن سے میری حیاتِ فن کو دوام  
رابعہ۔۔ وہ میری شریک حیات  
میرے دکھ سکھ میں میرے ساتھ رہی  
میرا نعمان۔۔ میرا نورِ نظر  
روح کا چین، آنکھ کا تارا  
فن انھی سے ہے معتبر میرا  
جن سے جنت بنا ہے گھر میرا  
میری ناہید اور میری نشاط  
مجھ کو یہ بیٹیاں خدا نے دیں  
خیر کی مشعلیں بلند کیے  
وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہیں  
میری دو اور بیٹیاں ہیں جنہیں  
منتخب میرے قلب و جاں نے کیا  
میری اولاد کی طرح میری  
ایک پروین، ایک منصورہ

اب ندیم کی نظم ”آخری فیصلہ“ کا ایک حصہ جس میں انہوں نے اپنے افرادِ خاندان کا اپنے قریبی  
رشتے داروں اور احباب کا ذکر یوں کیا ہے کہ:

مری معصوم بیٹی کا اُجلا تہنم  
جیسے شبنم کے قطرے میں خورشید کا اولیس لمس گھل جائے!  
میری بہنوں کی آنکھوں میں پاکیزگی کی چمک  
جیسے برفوں سے آراستہ پرتوں میں ستارے اُتر آئیں!  
میری بیوی کے چہرے پہ تخلیق کے ولولے، پرورش کے عزائم



جیسے دھرتی کے شاداب سینے پہ گندم کے اکھوے  
 میرے بھائی کے ہاتھوں کی مانوس گرمی  
 جیسے سرما کی بھیگی ہوئی صبح میں دھوپ مل جائے  
 میری ماں کا بڑھاپا خلوص اور محبت کا بارِ مانت اٹھائے ہوئے  
 ڈوبتے چاند کی چاندنی، سوکتے گلشنوں کا تعطر!  
 میرے ہا کی تربت پتا ور میں ڈوبی ہوئی  
 جیسے اُمدے ہوئے بادلوں میں نہاں مہرتا ہاں!  
 میرے احباب کی دنداتی ہوئی محفلیں  
 جیسے دریا چٹانوں سے ٹکرا کے بٹتے ہوئے، گھوم جاتے ہوئے، گنگناتے ہوئے  
 آج دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں ایک انسان ہیں  
 اور آدمیت کا یہ آخری فیصلہ ہے  
 کہ ہم اپنی دنیا کو ویران ہونے نہ دیں گے  
 ہم نئی جنگِ عالم کا اعلان ہونے نہ دیں گے

(”آخری فیصلہ“ 1950)

منہ بولے رشتوں کے ساتھ ندیم صاحب کے غیر معمولی نباہ کرنے کے سلسلے میں فریدہ حفیظ  
 بتاتی ہیں کہ:

”نسبت روڈ پر جس گھر میں قاسمی صاحب مدقوں رہے اس کے پڑوس میں میں بھی رہتی  
 تھی ہاجرہ آپا اور خدیجہ آپا کو بہنیں کہا تو خود اُن کا اور اُن کے سارے خاندان، والدہ،  
 بہنوں اور بھائیوں کا خیال رکھ کر بھائی ہونے کا عملی مظاہرہ کیا تھا میں نے وہ کمرہ اور صحن  
 بھی دیکھا جہاں قاسمی صاحب اور اُن کے بیوی بچوں نے زندگی کے کئی سال  
 گزارے۔ یہ کمرہ دیکھ کر ہی قاسمی صاحب کے صبر و استقلال، ہمت اور درویشانہ  
 طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذرا سوچئے لاہور کی گرمی میں منی جون کا تپتا مہینہ اور  
 چار منزلہ گھر کی سب سے اوپر والی منزل جہاں پانی تک نہیں چڑھتا۔ میں تو قاسمی  
 صاحب کے ساتھ ان کی بیگم کی ہمت کی بھی داد دیتی ہوں جنہوں نے اپنے شوہر کے

منہ بولے رشتوں کو بھی اپنوں کی طرح نبھایا۔ جب کہ ندیم لالہ کے عہد وفاتے تو کبھی ہانپا قبول نہیں کیا۔“ (40)

پروفیسر فتح محمد ملک اپنے مضمون ”احمد ندیم قاسمی..... رشتے ناتے“ میں اپنی یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ:

”ہمارے عہد کی ادبی اور تہذیبی تربیت کا فریضہ انھوں نے اس شان سے ادا کیا ہے کہ جو ہر قابل کو درپیش روٹی روزگار کے مصائب سے نجات کی نگ و دو کو بھی ہمیشہ اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھا۔ ابھرتے ہوئے نوخیز فنکاروں کو بھی وہ اپنی حقیقی اولاد کی مانند باد حوادث سے بچانے میں ہر آن کو شاں رہتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں سراسر مادی نظر یہ حیات کے فروغ و ارتقاء کے باعث بعض اوقات احمد ندیم قاسمی کی شخصیت و کردار کے اس حسن لازوال کو سمجھنے میں ندیم کے کچھ عزیز ترین دوست بھی ناکام رہے..... ندیم کے نکتہ چینیوں کا یہ طرز عمل ان روحانی اصول و اقدار سے قابل رحم نا واقفیت کا ثبوت ہے جن سے ندیم کی شخصیت عبارت تھی۔ اگر یہ لوگ ندیم کی منہ بولی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ ساتھ ندیم کے منہ بولے بھائیوں اور بیٹوں کو بھی خاطر میں لاتے تو ان پر ندیم کے تخلص کا منہوم بھی عیاں ہو جاتا اور ندیم کے اوصاف حمیدہ بھی روشن ہو جاتے۔“ (”فتون“ دو نمبر شمارہ 129 -)

دراصل مذہم سب انسانوں کو اپنے ہی خاندان کے افراد کی طرح عزیز رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو پوری انسان برادری میں شامل ایک فرد سمجھتے ہیں۔ اسی لیے تو اُن کا ایمان ہے کہ:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر  
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریب شہر نہیں  
داور حشر مجھے تیری قسم..... عمر بھر میں نے عبادت کی ہے  
تو میرا نامہ اعمال تو دیکھ..... میں نے انسان سے محبت کی ہے

عزیم تعلیم:

حصول تعلیم کے لیے ندیم صاحب کو قربانیاں بھی دینا پڑیں اور مختلف آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا: ”نومرس کی عمر میں مجھے تھاں سے الگ ہو کر تعلیم کے سلسلے میں کیسبل پورجا نا پڑا“ (41)

اپنے مجموعہ کلام ”جلال و جمال“ کے دیباچے میں احمد ندیم قاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ:

”عمر کے ابتدائی نو برس گاؤں میں گزارے۔ پانچواں سال گاؤں کی مسجد میں قرآن مجید کا درس لیتے گزرا۔ 1924 میں والد گرامی چل بسے۔ 1925ء میں ابتدائی چار جماعتیں پاس کر کے اپنے چچا جان خان بہادر پیر حیدر شاہ کے ہمراہ کیسبل پور چلا گیا۔“

”..... چچا جان عربی فارسی دونوں کے عالم تھے لیکن ان کی طبیعت کا رجحان زیادہ تر عربی کی طرف تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ اردو میں بھی خاصے رواں شعر کہہ لیتے تھے۔ قیمتی کتابوں سے ٹھنسی ہوئی الماریاں ان کے کمرے کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ میں پانچویں میں تھا کہ انہوں نے ہم سب بھائیوں کو ”تفسیر حقانی“ کا درس دینا شروع کیا۔ درس کے دوران میں جگہ جگہ حسان بن ثابت۔ سعدی، حافظ، غالب، حالی، اقبال کے اشعار سے مطلب واضح فرماتے، تلفظ درست کرتے، اشعار سے صحیح طور پر ملاحظہ ہونے کے طریقے بتاتے، امیر، داغ کی شاعری سے بیزار تھے۔ کتب خانہ کا ایک حصہ مرحوم و مغفور نے ہمارے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس حصہ میں قرآن مجید کی تفاسیر کے علاوہ مسلمان فلسفیوں کی کتابیں تھیں، اصفیائے کرام کے ملفوظات تھے، ساتھ ہی اقبال کی اردو فارسی تصانیف اور ”ہمایوں“ اور ”صوفی“ کی فائلیں تھیں۔ اس علمی اور ادبی ماحول کا میری طبیعت پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ چھٹی جماعت ہی سے میں نے ایک بیاض میں اردو کے پاکیزہ اشعار لکھنے شروع کر دیے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ان دنوں بھی مجھے غالب کا یہ شعر آج ہی کی طرح پسند تھا:

سراپا رہن عشق و ناگزیر اُلفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

”دس گیارہ برس کی عمر میں اس بے پناہ شعر کے معانی کا شعور چچا جان کی ہمہ گیر اور ہمہ صفت شخصیت کا معجزہ ہے۔ سیالکوٹ میں چچا جان شمس العلماء میر حسن مرحوم کے شاگرد رہ چکے تھے اور ڈاکٹر اقبال کے ہم سبق تھے۔ شاید اسی لیے بچپن سے اقبال کی شاعری سے انس پیدا ہوا جواب تک اسی شدت سے قائم ہے۔“

بارہ برس کی عمر میں میں نے 80 صفحات کا ایک ناول لکھا جو میرے ہم جماعتوں میں

بہت پسند کیا گیا۔ اس عمر میں مجھے چند اشعار موزوں کرنا بھی یاد ہے۔ 1930 کے  
 اواخر میں چچا جان کے ہمراہ شیخوپورہ آنا پڑا۔ لاہور قریب ہی تھا۔ یہاں کے لڑکے کیمبل  
 پور کے لڑکوں کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور معلومات کے معاملے میں تیز تھے۔“

”چچا جان کا ارادہ تھا کہ حکومت پنجاب کی ملازمت سے فارغ ہو کر ریاست بہاول پور  
 میں مشیر مال کا عہدہ سنبھال لیں گے۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے مجھے بہاول پور  
 کالج بھیج دیا۔ مگر اس کالج میں ”کالجیٹ“، کم تھی اور ”مکتبیت“ زیادہ تھی..... اسی لیے  
 مزاج میں جوڑ پ تھی وہاں حوال کے جمود میں دبی پڑی رہی اور اگر ابھری تو سلجھ نہ سکی کہ  
 اچانک علی گڑھ یونیورسٹی سے ایک خوش اخلاق اور وسیع المطالعہ پروفیسر پیرزادہ  
 عبدالرشید صاحب جو ان دنوں کالج کے پرنسپل ہیں، اس کالج سے منسلک ہو  
 گئے۔ اتفاق سے میرا نام انھی کے گروپ میں آگیا اور سپاہیوں (سولجرز) کا یہ گروپ  
 ان کی زیر نگرانی چند ہی مہینوں میں کالج کی زندگی میں نئی تحریکوں کا منبع بن گیا۔  
 ڈرامے، مباحثے، مشاعرے اور ادبی جلسے غرض کالج میں زندگی اور حرکت کی لہروں پر  
 لہریں دوڑنے لگیں اور میری شاعری نے انھی دنوں پر پُورے نکالنے شروع کیے۔“

”انھی ایام میں میرے ایک نہایت عزیز دوست محمد خالد اختر (جنہیں ادیب بننا چاہیے  
 تھا لیکن جو آج کل انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان میں مقیم ہیں) نے مجھے  
 آرائیل اسٹیوٹنسن اور رائڈر ہیگرڈ کے ناولوں کی روشنی میں مہماتی کہانیاں لکھنے کی  
 ترغیب دی۔ ان کے پاس انگریزی کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا جو میرے مطالعے کے لیے  
 وقف کر دیا گیا اور میں نے شاعری کے علاوہ افسانہ کی طرف بھی توجہ دینا شروع کی۔“

”1934 میں چچا جان مرحوم مشیر مال مقرر ہو کر بہاول پور تشریف لائے۔ تقرر کے  
 فوراً بعد رخصت پر گاؤں چلے گئے اور وہیں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے وفات  
 پائی۔ زندگی کے بحر ذخار میں یہ تنہا مینارہ نور بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مخدومی  
 پیرزادہ عبدالرشید صاحب کی دیکھیری اور کچھ اپنی ہمت سے مرمت کر 1935 میں بی

اے کا امتحان پاس کیا۔“ (42)

ندیم کے سکول فیلو احمد شفیع کا بیان ہے:



”احمد شاہ صہب اول کے ڈیسک پر بیٹھتا تھا وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ اس لیے وہ اساتذہ کے بالکل سامنے بیٹھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا وہ کالج کا طالب علم ہوا تو جب بھی پروفیسروں کے سامنے ڈٹ کر بیٹھتا رہا۔“ (43)

جب کہ ندیم کے کالج فیلو محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

”میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا، وہ تھرڈ ایئر کا مگر خوش قسمتی سے ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ موسوم بہ ”سولجرز“ میں شامل تھے۔ سولجرز کے اجلاس ہر ہفتے ہمارے پروفیسر (عبدالرشید صاحب) کی صدارت میں ہوتے تھے۔ ندیم جو اس وقت ”احمد شاہ ندیم“ تھا، سولجرز کے اجلاسوں میں اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا تھا۔ ان نظموں میں ایک نئی نغمگی، نازگی اور اُجلا پن ہوتا تھا اور ہم ان کے جادو تلے آگئے تھے وہ اپنے پروفیسر کا چیتا طالب علم تھا اور فوراً تھ ایئر میں آکر سولجرز گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا ادب سے ہمارا سانچھا شغف رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔“ (44)

### ندیم شادی:

ندیم کے دوست محمد خالد اختر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”جولائی 1948 میں ندیم کی شادی گاؤں میں اپنے عزیزوں کے ہاں ہو گئی اور اب ندیم تین خوب صورت بچوں کا باپ ہے۔ اب ندیم کی زندگی ذہنی طور پر زیادہ اطمینان بخش اور بار آور ہو گئی ہے۔ گو اس کے مالی تفکرات میں کوئی کمی نہ آئی۔ وجہ یہ تھی کہ ندیم کتابیں لکھ کر اپنی روٹی کمانا چاہتا تھا اور اس ملک میں یہ ممکن نہیں۔“ (45)

پروفیسر احتشام حسین نے لکھا کہ:

”قاسمی نے اپنی شادی کے سلسلے میں میری مبارک باد کے جواب میں ایک طویل اور دلچسپ خط لکھا اور اپنی زندگی کے ایک نئے اور خوش گوار سفر کا ذکر کیا۔“ (46)

جب کہ شریف کنجاہی رقم طراز ہیں:

”ندیم صاحب کی زندگی کے ایک اور رخ کی طرف آنا چاہتا ہوں جو ان کی ندیمیت کا



ایک اور کامیاب روپ ہے اُن کی بیگم اُن کے قبیلے سے ہیں اور اُس دور کے عام مزاج کے مطابق جب اُن کی شادی ہوئی تھی، علوم جدیدہ سے معروف معنوں میں نا آشنا۔ ان حالات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل قلم کا ذوق جمال و طیفہ عیال پر غالب آ جاتا ہے اور یوں رابطہ باہم کی دیوار ختم داراُٹھنے لگتی ہے۔ یہ خیمہ دار دیوار گر پڑنے کے مستقل خطرے کا اعلان بنی کبھی بھی اہل خانہ کو اس سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی جو ندیم صاحب کے افراد خانہ کی متاع گراں ہے اور اس لحاظ سے بھی ندیم صاحب ہم عصر ارباب قلم کے ان محدود سے خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کی عائلی زندگی گرداب آشنا نہیں ہے۔ کافی حد تک اس کا سہرا بھی ندیم کی اس طبیعت کے سر ہے جس کی جڑیں دوسروں کو اپنانے اور ان کے جوہر کی قدر کرنے کی داخلی تحریک میں سے اخذ غذا کرتی ہیں جس کا خارجی روپ ندیم کے ایک محبت کرنے والے خاوند کے روپ میں ابھرتا ہے تو کسی عورت کے دخل و معقولات ہونے کے خدشات کو جلو میں لینے نہیں آتا اور جب ایک شفیق باپ کے پیکر میں نمودار ہوتا ہے تو ناہید بیٹی بے اختیار پکار اُٹھتی ہے کہ ”میرے لیے یہی بات عمر بھر فخر کرنے کے لیے بہت ہے کہ میں ندیم کی بیٹی ہوں۔“ (47)

مجتبیٰ حسین اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں کہ:

”ایک نظم ”انتساب“ جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اپنے ان اہل خاندان کے نام

جن سے میری حیات فن کو دوام

اس کا ایک شعر ہے:

فن انھیں سے ہے معتبر میرا

جن سے جنت بنا ہے گھر میرا

یہ اشعار اعلان نہیں ہیں، ندیم اور ندیم کی شاعری کی پہچان ہیں۔ ان میں وہ مہک ہے

جو ہمارے گھر کے آنکھوں سے اُڑتی جا رہی ہے۔“ (48)

## مدتیم ملازمتیں:

محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

”کالج سے فراغت کے بعد مدتیم بہاول پور سے چلا گیا اور وہ اذیت اور کرب ناک مہینے جو اس نے لاہور میں ڈگری ہاتھ میں لیے کسی چھوٹی سی ملازمت کی تلاش میں جو تیاں چٹھا تے گزارے، ان کی تلخی اور ہولناکی وہ ابھی تک نہیں بھول سکا۔ جس دفتر میں وہ جاتا کوئی آسامی خالی نہیں، کی تختی اس کا خیر مقدم کرتی۔ باہر کی دنیا کی مہربانی اور بے دردی نے اس خام دہقانی نوجوان کے حساس دل کو بڑی طرح مجروح کیا اور کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے کے ایمان نے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے سے روکا۔ بہت سے دن اس نے بغیر کھائے پینے گزارے۔ کئی راتیں لاہور کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے کاٹیں۔“ (49)

احسان دانش لکھتے ہیں:

”مدتیم سے میری پہلی ملاقات ملتان شہر سے باہر ایک چوراہے پر ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں کسی سرکاری محکمے سے منسلک تھے۔ اس وقت تک میں نے ان کی شاعری یا نثر کو نہیں پڑھا تھا مگر محسوس ہوا کہ اس شخص میں سینکڑوں قیامتیں رستے تلاش کر رہی ہیں آخر ایک وقت ایسا آگیا کہ مدتیم کو سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور اب وہ ادبی زندگی میں آگئے۔ سچے یا حقیقی ادیب اور شاعر کو کبھی اس کے دور نے سہولتیں نہیں دیں۔ مدتیم بھی اسی صنف کے انسان تھے اُن پر بھی معاشی گرفتیں اور اقتصادی تنگیاں آئیں، مگر انہوں نے اپنا انداز نہ بدلا کیوں کہ وہ ادب کی نقدیس سے آشنا تھے اور شعر کی عظمت و برکت سے آگاہ تھے۔“ (50)

محمد علی صدیقی کی رائے میں:

”مدتیم کے باقی ہم عصر یا تو زندگی کی نیرنگیوں کو اپنا حق سمجھ کر اپنی محرومیوں کا انتقام لیتے رہے، یا اپنے منہ میں پیدائش کے وقت ہی چاندی کا چھچھ لے کر پیدا ہوئے تھے یا پھر منٹو کی طرح خود زندگی سے دست و گریباں رہ کر بالآخر سرد پڑ گئے۔ قاسمی کوئی تین عشروں سے ”قلم مزدوری“ کے علاوہ گراں قدر ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں۔“ (51)

احمد ندیم قاسمی اپنی ملازمتوں کے بارے میں بتاتے ہیں (ملازمت کے اس پہلے تجربے کے واقعے کی جھلک باب اول میں بھی تھی):

”ملازمت کا پہلا تجربہ نہایت تلخ تھا۔ میں ریفارمز کمشنر کے دفتر میں بطور ”محرر“ بھرتی ہوا۔ بیس روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ دفتر ایک تکیوں سی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ افسر ایک پٹواری تھا جو پلنگ پر بیٹھتا تھا اور ہم محرر لوگ نیچے فرش پر چٹائیوں پر ووٹروں کی فہرستوں کی چیکنگ کرتے تھے۔ دن بھر فلاں ولد فلاں سکنہ فلاں کی رٹ لگی رہتی تھی۔ ایک روز پٹواری نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ پریس میں جا کر دو ات میں روشنائی بھر لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اس کام کے لیے چڑا سی موجود ہے جو باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ میں محرر ہوں۔ میں محرری کا کام ہی کروں گا اور اس نے میری چٹائی کر دی۔“

”پھر میں نے چند دن دارالاشاعت پنجاب کے مفت روزہ ”تہذیب نسواں“ کے لیے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم کیے اور جو معاوضہ ملا اس سے گزر بسر کی۔ انھی دنوں ایک ہندو بزرگ کو حضورؐ کی حیات طیبہ لکھنے کی سوجھی۔ وہ حضورؐ کا عقیدت مند تھا مگر چاہتا تھا کہ اسے کوئی مسلمان لکھے۔ محترم سالک صاحب نے میرا نام تجویز کیا۔ معاوضہ کچھتر روپے مقرر ہوا۔ یہ بزرگ دیال سنگھ لاہوری کے ٹرسٹیر میں شامل تھے۔ اس لیے لاہورین سے کہا کہ اس لڑکے کو جس کتاب کی ضرورت ہو فوراً نکال دو۔ یوں میں نے ان دنوں حضورؐ کی حیات طیبہ پر پچاس ساٹھ (پیشتر انگریزی) کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر کتاب لکھی اور بزرگ کو پیش کر دی۔ وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے کچھتر کے بجائے نوے روپے عنایت کر دیئے اور ظاہر ہے کہ میری توقعید ہو گئی۔“

”ٹیلی فون آپریٹر کے امتحان میں کامیاب ہونے پر مجھے اوکاڑہ منڈی میں ٹیلی فون آپریٹر مقرر کر دیا گیا مگر میں اس ملازمت کو نو دن سے زیادہ نہ کر سکا اور بھاگ آیا۔ اس کے بعد محکمہ آب کاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا۔ میرے پھوپھی زاد بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر خان نے میرے لیے اہتمام کیا۔ میں خانیوال اور ملتان میں بھنگ، چرس، افیون اور شراب کے کیس پکڑتا پھرا۔ ظاہر ہے یہ میرے ذوق کا ماحول نہیں تھا۔ محترم سالک صاحب کو لکھا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ استعفیٰ دے کر لاہور

آجاؤ۔ بھائی جان (پیرزادہ محمد بخش) سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بھی بخوشی اجازت دے دی اور میں لاہور آگیا۔ محترم سالک صاحب نے مجھے ہفت روزہ ”تہذیب نسواں“ اور ہفت روزہ ”پھول“ کی ادارت دلا دی۔“

”میں اسی دوران میں رسالہ ”ادب لطیف“ کی ادارت بھی کرتا رہا۔ منٹو کی ایک کہانی اور مضمون چھاپنے پر میرے اور منٹو کے خلاف مقدمہ چلا مگر ہم دونوں بری ہو گئے۔“

”زورس بریک ڈاؤن نے مجھے لاہور سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں انگلہ آگیا اور وہاں کی آب و ہوا اور امی کی توجہ سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔ اسی دوران میں سجاد سرور نیازی نے جو، ان دنوں پشاور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور ان کے گھرانے سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے، مجھے پشاور بلوا بھیجا۔ میں وہاں بحیثیت سکرپٹ رائٹر 1948 کے آغاز تک کام کرتا رہا۔“

”اس دوران ادب کی ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے خوب جلوس نکالے اور پھر 1951 میں سنٹرل جیل لاہور کی ایک کوٹھریا میں بند کر دیئے گئے۔ رہائی کے کچھ عرصے بعد مجھے روزنامہ ”امروز“ (لاہور) کی ادارت کی پیش کش ہوئی جو میں نے منظور کر لی۔ میں نے چھ برس تک اس روزنامے کی ادارت کی مگر 1958 میں جب جنرل ایوب خان نے پاکستان پر قبضہ کر لیا تو مجھے پھر لاہور اور راولپنڈی کی جیلوں کے علاوہ لاہور کے شاہی قلعے میں بھی بند رہنا پڑا۔ فروری 1959 میں رہا ہو کر آیا تو چند روز بعد ایوب خان کی حکومت نے میرے دوست قدرت اللہ شہاب وغیرہ کے مشورہ سے ”امروز“ اور ”پاکستان نامہ“ اور ”لیل و نہار“ پر قبضہ کر لیا اور میں امروز کی ادارت سے احتجاجاً الگ ہو گیا۔“

”تب میں نے ایک اشاعتی ادارہ ”کتاب نما“ چلانا چاہا مگر دماغ کا کاروباری خانہ خالی ہے اس لیے یہ ادارہ فلاپ ہو گیا۔ 1963 میں رسالہ ”فنون“ کا اجراء کیا اور اسے اب تک چلا رہا ہوں۔“

”1974 میں جب محترم پروفیسر حمید احمد خان کا انتقال ہوا تو مجلس ترقی ادب کی



نظامت کی آسامی خالی ہو گئی۔ ان دنوں جناب حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور میرے محبوب دوست پروفیسر فتح محمد ملک عارضی طور پر اُن کے پریس ایڈوائزر تھے۔ انہوں نے اس آسامی کے لیے میرا نام تجویز کیا اور یوں میں اس نیک نام علمی و ادبی ادارے کا ناظم مقرر ہوا۔ ہر تین برس بعد ملازمت میں توسیع ہو جاتی ہے اس لیے میں 1974 سے اب تک اس عہدے پر فائز ہوں۔ میرے دور نظامت میں دوسو کے قریب کتابیں اس ادارے کی طرف سے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔“ (52)

### مدتیم ادارتیں:

مدتیم صاحب کے ایک کالج فیلو دوست محمد خالد اختر کے بقول ”وہ اپنے پروفیسرز کا چہیتا طالب علم تھا اور فورٹھائر میں آکسفورڈ گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا اور کالج میگزین ”نخلستان“ کے اردو حصے کا ایڈیٹر بھی۔“ (”نخلستان“ کے انگریزی حصے کے ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ) احمد مدتیم قاسمی ”جلال و جمال“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

”3 جولائی 1939 کو میں نے ملتان کے دفتر آب کاری میں کام کرنا شروع کیا۔ 20 ستمبر 1942 کو یہ کابوس میرے سینے سے اُترا۔ 25 ستمبر 1942 کو میں نے دارالاشاعت پنجاب (لاہور) میں بحیثیت ایڈیٹر ”تہذیب نسواں“ اور ”پھول“ کام کرنا شروع کیا۔ 1943 میں مشہور ترقی پسند رسالہ ”ادب لطیف“ (لاہور) کی ادارت سنبھالی۔ 1944 میں سالنامہ ”ادب لطیف“ کے ایک مضمون سے خفا ہو کر حکومت پنجاب نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کر لیا۔ یہ مقدمہ ایک برس تک چلتا رہا۔“ (53)

”پھر جب میری منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ترک وطن کر کے لکھنؤ سے لاہور آگئیں تو میں اُن کی سرپرستی کی خاطر پشاور (ریڈیو) سے مستعفی ہو کر لاہور آگیا۔ یہاں ہاجرہ بہن نے اور میں نے محمد طفیل صاحب کے تعاون سے رسالہ ”نقوش“ کا اجراء کیا۔ 1949 کے آخر تک یہ سلسلہ چلا۔ ہماری ترقی پسندانہ انتہا پسندی سے گھبرا کر ہمارے دوست محمد طفیل نے ہمارے ساتھ چلنے سے معذرت کر

لی۔ ظاہر ہے ہم تو خالی ہاتھ تھے۔ اُن کے بغیر رسالہ چلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے ”نفقوش“ اُن کے سپرد کر دیا اور خود بے روزگاری کے صحرا میں داخل ہو گئے۔“ (54)

ہاجرہ سرور لکھتی ہیں:

”1952 کے آخر میں نذیم بھیا ”امروز“ کے فکاہیہ کالم نویس کی حیثیت سے سامنے آئے اور مارچ 1953 میں اسی روزنامے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ (1958 میں) مارشل لاء کے آغاز میں ایک بار پھر سیفٹی ایکٹ کے گونگے بہرے بھوت نے نذیم بھیا کو دبوچ لیا اور ایک بار پھر نذیم بحیثیت ایڈیٹر ”امروز“ ہاتھوں میں جھکڑیاں پہنے لاہور جیل، راولپنڈی جیل اور وہاں سے شاہی قلعے لاہور کے چکر لگاتے رہے اور اس طرح انھوں نے اپنی قید کے سو (100) دن پورے کیے۔“ (55)

اس کے متعلق احمد نذیم قاسمی بتاتے ہیں کہ:

”اس دوران مجھے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک مضمون ملا۔ اس کا عنوان تھا: ”کیا یہ مارشل لاء ہے؟“ مطلب یہ تھا کہ یہ نعمت خداوندی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں یہ مضمون نہیں چھاپ سکتا۔ اس پر مجھے اوپر سے پیغام ملا۔ ”ہم اپنے آدمی بھیج دیں؟“ میں نے کہا: ”جناب بھیج دیجیے۔“ چنانچہ ادھر ایک آدمی مضمون واپس لے کر گیا اور ادھر دوسرا آدمی میرے وائرٹ گرفتاری لے آیا اور مجھے پکڑ کر اندر کر دیا گیا۔“

”رہائی کے کچھ روز بعد میں نے دوبارہ ”امروز“ کی ادارت سنبھال لی۔ یہ مارچ 1959 کی بات ہے جب صبح کو مجھے گھر پر ٹیلی فون ملا کہ پولیس اور فوج نے پروگریسو ہیپر زلمینڈ پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں دفتر میں گیا تو وہاں پولیس اور فوج کا پہرہ تھا۔ میرے دفتر کے اندر بھی پولیس والے بیٹھے تھے میں نے وہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے کہہ دیا کہ ”میں یہاں پر کام نہیں کروں گا۔“ انھوں نے کہا: ”اس صورت میں آپ کو پکڑ لیا جائے گا۔“ میں نے کہا: ”جناب یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں جو آزادی سے اخبار کے ادارے لکھتا رہا ہوں اب پولیس والے آکر مجھے ڈکٹیشن دیں گے کہ یہ لکھو اور وہ نہ لکھو۔ یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“ اس پر ایڈمنسٹریٹر صاحب نے قدرت اللہ شہاب کو

ٹیلی فون کیا، جو اس زمانے میں انفارمیشن سیکرٹری تھے، میں نے بحث کی اور وہ قائل ہو گئے کہا: ”ٹھیک ہے ہم آپ کا استعفیٰ منظور کر لیتے ہیں۔“ میں نے کہا: ”آپ کا یہ مجھ پہ بہت بڑا کرم ہوگا“ اس کے بعد میں بے کار ہو کر ایک بار پھر سڑک پر آ گیا کچھ عرصہ بعد (1963 میں) میں نے اپنا رسالہ ”فتون“ جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔“ (56)

احمد نسیم قاسمی کی مدیرانہ صلاحیتوں کے بارے میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

”ادیب ہونے کے علاوہ قاسمی ایک ادبی شخصیت بھی رکھتے تھے۔ ہر ادیب ادبی شخصیت بن جانے کا اہل نہیں ہوتا کیوں کہ ان میں عام طور پر یہ کمی ہوتی ہے کہ ان میں انا، بہت ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب دوسروں کے لیے بہت گنجائش رکھتے تھے۔ وہ اپنے خردوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور جن میں ادبی صلاحیت نظر آتی، ہمیشہ انکی سرپرستی کرتے ”فتون“ کو ایک طرح سے ان کی شخصیت کی توسیع سمجھا جاسکتا ہے۔ اس جریدے کے ذریعے انھوں نے نووارد اور نوآموز لوگوں کی تربیت کی اور ان کو ادب کی دنیا میں متعارف کرایا..... ان کا رسالہ ایک طرح سے ایک ادارہ بن گیا تھا۔“ (57)

### مدتِ قید و بند:

حمید اختر نے لکھا ہے کہ:

” (1948) لاہور میں ہم نے مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کو متحرک کیا۔ قاسمی صاحب انجمن کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ہم لاہور برانچ کے سیکرٹری تھے۔ اس زمانے میں خفیہ پولیس والے ہم لوگوں کے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ انجمن کے ہفتہ وار جلوس میں سرکاری ادارے، خفیہ ایجنسیاں بار بار رخسہ اندازی کرتی رہیں۔ اس پر آشوب دور میں ہم نے قاسمی صاحب کے کندھے سے کندھا کر ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں۔ حتیٰ کہ مئی 1951 میں گرفتار بھی ایک ساتھ ہی ہوئے۔ لاہور سینٹرل جیل میں (گریجویٹ ہونے کے باوجود) سی کلاس میں ان کے ساتھ جو وقت گزارا اس نے دوستی اور رفاقت کے رشتوں کو اور مضبوط کر دیا وہاں جو قیدی تھے، قاسمی صاحب

کے علاوہ وہ سب سیاسی کارکن یا رہنما تھے قاسمی صاحب ترقی پسند ادیب تھے مگر اُن کا سیاست سے اُس وقت تک کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم سب لوگ پریشان تھے کہ اُن کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ وہ یہ سختیاں کیسے برداشت کریں گے مگر انھوں نے بڑے حوصلے اور عزم کے ساتھ یہ وقت گزرا بلکہ اُن کی حس مزاح کچھ اور تیز ہو گئی جن لوگوں نے اُس زمانے میں لکھی گئی میری کتاب ”کال کوٹھڑی“ پڑھ رکھی ہے انہیں اس میں قاسمی صاحب کی بھرپور شخصیت کا اندازہ ضرور ہوگا۔“ (58)

حمید اختر کی کتاب ”کال کوٹھڑی“ سے ایک اقتباس دیکھئے:

”چٹائی پھیلا کر اس پردہ پر بچھاتے ہوئے میں لیٹ گیا مگر اس نام نہاد بستر میں تکیہ نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی تکیہ نہیں تھا (حالانکہ گریجویٹ کو ”بی“ کلاس کے ساتھ تکیہ بھی دیا جاتا ہے۔) مگر مجھے بار بار نذیم کا خیال آتا تھا جو میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں بغیر تکیہ کے لیٹا ہوا تھا۔ جس نے اپنی جوانی، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اپنا گھر اور اپنا سب کچھ فن کی نذر کر دیا تھا۔ اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس نسل کے ادیبوں میں بہت کم نذیم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ جتنی محنت اس نے کی ہے، اتنی محنت وہی ادیب کر سکتے ہیں جن کے اندر تخلیق کی صلاحیت، قوت اور جذبہ ہوتا ہے، جو اپنے فن اور مقصد میں مخلص ہوتے ہیں۔ اُس نے اپنی ذات کو کائنات پر قربان کر دیا۔ یہی چھوٹے اور بڑے، جھوٹے اور سچے فنکار کا فرق ہے اور اسی سچائی اور صداقت کے لیے آج وہ زمین پر لیٹا تھا اور وہ جو قلم کی ایک جنبش سے اچھے خاصے انسانوں کو بغیر ان کا جرم بتائیے۔ (”سیفٹی ایکٹ“۔ ”احتیاطی نظر بندی“ کے تحت) کال کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں آرام سے لیٹے ہیں۔ انھیں یہ احساس بھی نہیں کہ آج فن پا بزدلی ہو گیا ہے۔“

محمد علی صدیقی کی رائے میں:

”ترقی پسند تحریک سے اُن کی باقاعدہ اور عملی وابستگی ”ادب لطیف“ کے دور سے شروع ہوئی اور ادب لطیف میں ایک ”قابل اعتراض“ مضمون لکھنے کی پاداش میں اُن کی گرفتاری عمل میں آئی اور اس طرح وہ گفتی کے چند ادیبوں میں شامل ہو گئے جنہوں نے



ادب میں ترقی پسندانہ فکریت کی سرخ روئی کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔“ (59)

### مدتیم استادورہنما:

کسی بھی نمایاں شخصیت کی پشت پر استاد اور رہنما کی تھکی بہت اہم ہوتی ہے۔ مدتیم نے جس سے بھی کچھ اچھا سیکھا اور رہنمائی حاصل کی، اس کی ہمیشہ قدر کی اور برملا اعتراف بھی کیا۔ ماں کی گود اور چچا کی تربیت اُن کی پہلی درس گاہیں تھیں۔ یہ احمد مدتیم قاسمی کی خوش بختی رہی کہ انھیں اچھے استاد اور رہنما ملے۔ اس کے بارے میں کچھ مضامین اور انٹرویوز کے علاوہ سوانحی اور شخصی خاکوں پر مشتمل مدتیم کی دو کتابوں ”میرے ہم سفر“ اور ”میرے ہم قدم“ میں بھی وضاحت ہے۔ کچھ دوستوں کی تحریریں بھی ہیں۔ مثلاً محمد خالد اختر بتاتے ہیں:

”وہ اپنے پروفیسر (انگریزی کے استاد عبدالرشید) کا چہیتا طالب علم تھا (دوران طالب علمی ہی میں) اُس کی پہلی ہی کہانی اختر شیرانی کے رسالے ”رومان“ میں اشاعت کے لیے قبول کر لی گئی“

” (ملازمت کی تلاش کے دوران) لاہور میں اس کی بے کاری اور مایوسی میں مدتیم کو بالآخر ایک سہارا ملا۔ ایک دوست جس نے اپنی شفقت کے پروں میں لے لیا۔ یہ اختر شیرانی، تپتے جذبات اور ایروز (EROS) کا شاعر تھا۔ دو مختلف رنگ ڈھنگ کے آدمی ایک دوسرے کے قریب کیوں کر آ گئے۔ مجھے بڑا عجیب لگتا ہے پنجابی بڑا اپنے رند ہونکے باوجود ایک فن کار تھا۔ اس لیے اپنے نوجوان قلم کار کا جوہر بھانپتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ مجھے یاد ہے مدتیم نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا: ”تم لاہور آؤ گے تو میں تمہیں اختر شیرانی سے ملاؤں گا۔ اس جیسا پیارا آدمی میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔“ معلوم ہوتا ہے اختر شیرانی ایک بڑا فراغ دل شخص تھا اور دردمندی اور انسانی محبت کے جذبات اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ اختر شیرانی کے لیے بڑی محبت اور قدر کے باوجود مدتیم نے خود کو اس کے رنگ میں نہ رنگنے دیا۔“

”اختر شیرانی کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے جواں سال شاعر کو اخلاقی اور مالی



سنجھ لادیا۔ سالک ”نیا زندانِ لاہور“ کے حلقے کا روح رواں، ”انقلاب“ میں ناقابل تقلید، نکھری نثر میں ”افکار و حوادث“ کا راقم، ادبی و سیاسی حلقوں میں بارسوخ تھا۔ اُس کی دل چسپ، شگفتہ، چٹکوں سے بھری گفتگو نے ندیم کو گرویدہ کر لیا اور ندیم نے بھی اس کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ عمروں میں تفاوت کی وجہ سے ندیم نے ہمیشہ اپنے تعلقات میں حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھا۔ مولانا عبد المجید سالک کی توسط سے وہ ”نیا زندانِ لاہور“ کے گروپ کے مشاہیر اور دوسرے ادبی لوگوں سے متعارف ہوا۔ (سالک صاحب سے ندیم کا تعارف ندیم کے خالہ زاد بھائی مولانا غلام مرشد صاحب خطیب بادشاہی مسجد نے کروایا تھا) دارالاشاعت پنجاب کے امتیاز علی تاج کو اپنے بچوں کے ہفتہ وار رسالے ”پھول“ کے لیے ایک اچھے مدیر کی جستجو تھی۔ سالک نے تاج سے ”پھول“ کی ادارت کے لیے ندیم کی سفارش کی، بلکہ ندیم کو اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ سالک جو ندیم سے اپنے بیٹے کی سی محبت کرتا تھا۔ اس کی دل جوئی کے لیے اکثر وہاں آنکلتا۔ ”پھول“ میں ندیم نے کتنی ہی اچھی نظمیں لکھیں۔ سالک کے کہنے پر ندیم نے اپنی کہانیاں کتاب کی صورت میں طباعت کے لیے جمع کیں اور اس کی پہلی کتاب موسوم بہ ”چوپال“ دارالاشاعت پنجاب کے مطبع سے 1939 میں شائع ہوئی۔“ (60)

جب کہ احمد ندیم قاسمی سالک صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”مجھ پر، میری شخصیت اور میری شاعری پر سب سے بھاری احسان گرامی قدردار مولانا عبد المجید سالک مدیر روزنامہ ”انقلاب“ لاہور نے کیا۔ وہ بھی اختر شیرانی صاحب کی طرح ایک آدھ لفظ ادھر سے ادھر کر کے شعر کے معیار کو انتہائی بلندی پر لے جاتے تھے اور میں اس خاموش رہنمائی سے فیض یاب ہوتا رہتا تھا اگر میری زندگی میں وہ وارد نہ ہوتے تو میں یہاں وہاں ٹھوکریں کھاتا ہوا عملاً ختم ہو جاتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں انھی کی محبت اور حوصلہ افزائی کا ثمر ہوں۔“ (61)

سالک صاحب عمر بھر کے لیے ندیم کے آئیڈیل اور مثالی نمونہ رہے اور وہ خود بھی اُن کے جیسا زندہ تابندہ شفیق رہنمایا نہ سلوک نو جوان نسل سے کرتے رہے۔ یوں ندیم نے خود بھی رہنما کا مقام حاصل کر

لیا۔ بقول الطاف حسن قریشی:

”وہ ایک مشفق استاد تھے۔ ریا کاری اور فریب نفس سے پاک تھے اور دوسروں کے

لیے خیر خواہی کا ایک چشمہ آب حیات تھے۔“ (62)

اور احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے:

”ذاتی طور پر میں انہیں معلم کا درجہ دیتا ہوں ان معنی میں معلم کہ پاد مخالف کی تندی میں

کیسے دستار کو گر نے نہ دیا جائے، دشنام کے ہنگام میں کیسے لبوں پر مسکراہٹ سجائی جائے

اور کیسے اصولوں پر کھوت نہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے میں انہیں اپنا معلم سمجھتا ہوں کہ ان

سے میں نے صبر و استقامت سے جادہ حیات پر گامزن رہنے کے درس کے ساتھ وقار

سے خاموش رہنے کا علم بھی حاصل کیا۔ یہ آسان سبق نہیں لیکن قاسمی صاحب کی عملی زندگی

نے یہ نقطہ روشن کر دیا کہ خودی سے زیست کرنا مشکل سہی مگر ناممکن نہیں۔“ (63)

### ندیم دوست:

ندیم کا مطلب ہی دوست ہے اور ندیم بہت دوست دار اور تعلقات نباہنے والے انسان تھے۔ نوے

برس کی عمر میں شروع سے آخر تک بلا تفریق مذہب رنگ و نسل ان کے ان گنت دوست بنے۔ خاص

خاص چنیدہ دوستوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ وہ سراپا دوستی تھے۔ نظریاتی اختلاف اپنی جگہ لیکن

ندیم کے نزدیک تو

گل تیرے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں

اسی رشتے میں ہر انسان کو پرونا چاہوں

ساری دنیا میرا کعبہ سب انسان مرے محبوب

دشمن بھی دو چار تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انسان

ندیم کے ایک قریبی دوست محمد کاظم کی رائے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ”احمد ندیم قاسمی

ایک تعلق کی یاد“ میں لکھتے ہیں۔

”یہ کچھ مثالیں ہیں ان دوستوں کی جن کے ساتھ ندیم نے بہت قریبی تعلق محسوس کیا اور

ان کے ساتھ قلبی تعلق رکھے۔ ایسی کئی اور شخصیتیں ہوں گی..... ہوگی کیا یقیناً تھیں..... جو

ندیم کی زندگی کے ہر دور میں بہار کے جھونکے کی طرح آنکس اور اُن کے شب و روز کو درخشندہ اور بامعنی بنا دیا۔ ندیم کے پاس دراصل محبت کا ”اُن گھٹ“ خزانہ تھا جسے وہ ہر دور میں اپنے قریبی دوستوں اور تعلق والوں پر لٹاتے رہے تھے۔“ (64)

اپنے دوست خالد محمد اختر کے بارے میں احمد ندیم قاسمی بتاتے ہیں کہ:

”جب میں صادق ابجرائٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھا تو آج کے نامور ادیب، طنز نگار اور سفر نامہ نویس جناب محمد خالد اختر سے میرے دوستانہ روابط استوار تھے..... وہ انگریزی فکشن کے عاشق تھے متعدد انگریزی اہل قلم کی کتابیں مجھے پڑھنے کو دیں اور ساتھ ساتھ اُکساتے رہے کہ میں بھی کہانیاں لکھوں۔ یہ انہی کی عنایت ہے کہ میں نے افسانہ نگاری اختیار کی اور یوں اپنے تخلیقی جوہر کو ایک طرح سے غیر محدود کر دیا۔“ (65)

جب کہ نامور نقاد احشام حسین کا کہنا ہے کہ:

”ایک اچھے شاعر اور افسانہ نگار، ایک اچھے دوست اور اچھے انسان کی ساری خوبیاں قاسمی میں جمع ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انھیں پنجاب کے دیہاتوں نے، ماحول کی کشمکش نے، پیرزادگی کے اخلاقی تصور نے، علم و آگہی کی پیاس نے اور انسانی محبت کے احساس نے جو کچھ دیا ہے وہ اُن کے حسین اور توانا پہلوؤں کو اپنے افسانوں اور اپنی نظموں کے ذریعہ عام کر رہے ہیں۔ مجھے مسرت اور اعتماد ہے کہ اس مادیدہ محبت میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔“ (66)

ندیم کے دوستوں کی فہرست بہت لمبی ہے جب کہ کچھ قریبی اور پیارے دوست ندیم کی طویل عمر کا ساتھ نہ دے سکے۔ اُن کی جدائی ندیم کو اکثر اداس کر دیتی رہی۔

### ندیم کی پسندیدہ شخصیت:

ندیم سب سے زیادہ جس انسان کی خوبیوں کے معترف تھے وہ حضرت محمدؐ ہیں۔ پھر انہیں انسانوں کا بھلا چاہنے والے بہت پسند تھے۔ وہ بلا تعصب، انسانی خامیوں کو نظر انداز کر کے خوبیوں پر نظر رکھتے۔ وہ ایڈلسن کی انسان دوست دریافتوں کا ذکر بھی پیار سے کرتے اور گوتم اور رام کے انسان دوست رویوں کی بھی قدر کرتے، جب کہ سچے فن کاروں کے تو وہ عاشق تھے۔ سبھی فنونِ لطیفہ سے وابستہ

آرٹسٹوں کی خوبیاں بیان کرتے۔ اس انسان دوست شخص کی پسندیدہ شخصیات کی فہرست بھی مختصر نہیں ہے۔ ایک ذرا سی جھلک ملاحظہ کیجیے:

”میں آج بھی حضرت عمرؓ کا قصیدہ تک لکھنے کو تیار ہوں۔ میں عمر بن عبدالعزیز کے زہد و

تقویٰ کا معترف ہوں اور ٹیپو کی وطن دوستی سے پیار کرتا ہوں۔“ (67)

محمد اقبال اور منصورہ احمد نے ندیم کی پسندیدہ شخصیات کی فہرست میں درج ذیل کو شامل کیا ہے:

”مختار شیرانی، عبدالحجید سالک، جوش، منٹو، کرشن چندر، غالب، اقبال، عرفی، ہومر،

افلاطون، ایلین، پاؤنڈ، گوئٹے، شیکسپیر، ٹالسٹائی، گورکی، فلاہیر، برٹینڈرسل، ابن

خلدون اور آئن سٹائن وغیرہ۔“ (68)

میرے نزدیک یہ فہرست مکمل نہیں۔ ندیم کے قریبی دوست احباب اس سلسلے میں ہماری مدد بخوبی کر سکتے ہیں اُن سے درخواست ہے کہ ہماری رہنمائی کریں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد (یعنی ندیم صاحب) اپنے بزرگ دوستوں مثلاً غلام رسول مہر صاحب اور مولانا ابوالخیر مودودی کے یہاں اپنے دیگر دوستوں کے ہمراہ باقاعدگی سے جاتے اور اس معمول کو دل سے نبھاتے۔ یقیناً ایسی اور بھی شخصیات ہوں گی۔

## ندیم اختلاف:

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی  
جس کو ہودین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں

(غالب)

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا  
ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

(ندیم)

ندیم صاحب کو قدرت نے سوچنے سمجھنے والا عالی شان دماغ اور گہرا احساس رکھنے والا حسین سنہری دل، دونوں تو دیئے ہی تھے ساتھ میں جرأت اظہار، صلاحیت فیصلہ اور ہمت عمل کا سرمایہ بھی بخشا اور صبر و برداشت کی بے پناہ قوت بھی عطا کی تھی، ان سب نے اُن کی شخصیت کو انوکھا توازن دے رکھا تھا۔ وہ



حمایت بھی ڈٹ کر کرتے تھے اور مخالفت بھی کھل کر کرتے۔ ندیم کی شخصیت میں سمائی ان صفات کو ہم آپس میں متضاد صفات نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو اُس ایک ہی منشور نما شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ جس کی ایک ایک کرن میں کئی کئی رنگ ہیں۔ لیکن یہ ایک ہی منبع سے پھوٹ رہی ہیں۔ سو خود انہیں دوسروں سے اختلاف رہا اور اُن سے بھی اختلاف کیے گئے۔ وہ جانتے اور مانتے تھے کہ:

”اختلاف رائے کا بھی ایک سلیقہ، ایک قرینہ ہوتا ہے جب کہ مارل رویوں کے حامل دانشوروں نے مستقل غیر جانب داری کو ناممکن بتایا ہے اور کچھ نے اسے مفاد پرستی اور منافقت کا نام دیا ہے کیوں کہ واضح نتیجے تک پہنچنے کے لیے اور گولگو کی کیفیت سے نکلنے کے لیے کسی ایک رائے کا انتخاب تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ سو مثبت اور منفی پہلو جانچ کر اچھے پہلوؤں کی وضاحت اور حمایت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔“ (69)

پھر وہ اپنے ضمیر کے اطمینان کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اسی لیے اکثر و بیشتر مطمئن اور خوش رہے لیکن ریا کاری، نا انصافی، ظلم و استحصا ل دیکھ کر وہ بہت پریشان اور سخت اُداس ہو جاتے چوں کہ وہ اصولوں پر کبھی کبھوتہ نہیں کرتے تھے اس لیے انھیں بعض اوقات غصہ بھی آ جاتا تھا۔

1966 میں ماہید قاسمی نے لکھا:

”ابا جی کو کبھی کبھی غصہ آتا ہے۔ مگر یہ عجیب پیارا سا غصہ ہوتا ہے کہ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ غصے کی حالت میں اُن کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ وہ غصے کا اظہار ایک آدھ لفظ میں کرتے ہیں اور اس کے بعد اُسی کو منانے میں لگ جاتے ہیں جس پر انہیں غصہ آیا ہو۔“ (70)

اور 2007 میں ایک انٹرویو کے دوران ماہید قاسمی نے افضال ریحان کے پوچھے گئے سوال کے جواب میں بتایا کہ:

”جی ہاں! وہ ایک مارل انسان کی طرح ناراض بھی ہوتے تھے۔ بالخصوص اپنے عرصہ عمر کے آخری حصہ میں دل دکھائے جانے پر! ایسے موقع پر بھلا کوئی مسکرائے کیسے؟ ظاہر ہے کہ چُبھن ہو رہی ہو تو آہ سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن اپنی بے مثال قوت برداشت کی وجہ سے اور لحاظ اور پاسداری کی وجہ سے کبھی آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ مہذب جیسپر ز، سنبھلی ہوئی ناراض گفتگو اور ہلکے ہلکے طنز سے اپنی ناراضگی ظاہر کر دیتے تھے۔



اور پھر پہلے کی طرح ہنستے اور ہنساتے۔

”اُنہیں نا انصافی، دغا بازی، جھوٹ اور الزام تراشی پر غصہ آتا تھا لیکن اہم بات یہی ہے کہ وہ اُداسی کو جلد ہی اپنے اندر جذب کر لیتے۔ اُن میں مثالی گہرائی، خدا داد صبر و تحمل اور حیرت انگیز قوت برداشت تھی، وہ اُداسی کو دیر تک اپنے اوپر طاری نہ رہنے دیتے۔ ندیم صاحب اختلاف کے اظہار کو بردائی نہیں سمجھتے تھے لیکن اس میں بھی شائستگی کے قائل تھے۔ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ اختلاف نظریاتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ذات پر حملے کو وہ سب سے بڑی ادبی بداخلاقی سمجھتے تھے۔“ (71)

”وہ لحاظ کرنے والے وضع دار انسان تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ انہوں نے سچ پر کبھی کبھوتہ نہیں کیا۔ کچھ لوگ اُن سے سچ سن کر خفا بھی ہوئے۔ حقیقت یہی ہے کہ سچ سننا اور سہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ندیم صاحب کو اگر کبھی کسی سے گلہ شکوہ ہوتا بھی تھا (جو انسانی تعلقات میں کوئی غیر فطری بات نہیں ہے) تو وہ ان شکوؤں کو اپنے اندر اکٹھا کر کے اس طرح پالتے پوتے نہیں تھے کہ لاوہ بن جائیں اور کسی روز آتش فشاں پھٹ کر تباہی مچا دے۔ وہ گھما پھرا کر یا چھپ چھپا کر وار بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ ذہین، سمجھدار اور حوصلہ مند تو تھے لیکن اُن کے مزاج میں۔ کاری اور فریب کی بجائے معصومیت، سادگی اور سچائی تھی۔ وہ عدل پسند اور غیور تھے۔ اس لیے اپنی خفگی اور رنجش کا صاف اور سیدھا اظہار کر دیتے تھے (چاہے یہ سب اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے کسی نظریے یا اپنے کسی عزیز دوست کے لیے ہوتا)۔ دراصل اُن کا مقصد یہ ہوتا کہ فریقین کی انا اور خود داری کے تحفظ کے ساتھ بالآخر صلح صفائی ہو جائے عموماً ندیم کی خفگی جھاگ کی طرح ہوتی، انتہائی ناراضگی میں بھی اپنی طرف سے مہذب رویوں اور سنبھلی ہوئی گفتگو کا خیال رکھتے۔ خفگی کو بہت دیر تک برقرار رکھنا اور بہت دور تک چلانا اُنہیں پسند ہی نہیں تھا۔ وہ دوسروں کو جلد منالینے اور اسی طرح خود اپنے جلد منالینے کے قائل تھے:

یہ بھی تو نماز کی قضا ہے

جو روٹھ گئے انھیں مناؤں“ (72)

جب کہ ندیم صاحب ایک اور انٹرویو میں کہتے ہیں:

”میرے مخالفین بھی بہت سے ہیں۔ میرے خلاف مضامین بھی لکھتے ہیں لیکن، اُن میں سے نوے فیصد معافی مانگ لیتے ہیں اور میں معاف کر دیتا ہوں۔ یہی میرا معیار اختلاف ہے۔ سوچتا ہوں عین ممکن ہے میرے معاف کرنے سے میرے مخالف کی شخصیت میں ایسا تغیر پیدا ہو کہ آئندہ وہ اس قسم کی حرکت کسی اور کے ساتھ نہ کرے“ (73)

جہاں تک اختلاف رائے کی بات ہے چوں کہ ندیم کو منہمک کے قائل تھے اس لیے اختلاف رائے کا برملا اظہار دلائل کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ جواب میں اُن کو کبھی ذات پر حملے تک ملے حال آنکہ مخالف کو بھی ایسے موقع پر اپنی رائے ہی دلیل کے ساتھ دینا چاہیے تھی۔ بہر حال ندیم کا کہنا ہے:

جو دشمنی پہ تلے ہیں، وہ جانتے ہی نہیں  
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبت ہیں  
ساری دنیا میرا کعبہ سب انسان مرے محبوب  
دشمن بھی دو چار تھے لیکن دشمن بھی تو تھے انسان

اسی لیے ندیم کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اکبر جمیدی بھی کہتے ہیں کہ:

”یہ ضروری ہے کہ انسان کو انسان ہی سمجھ کر دیکھا جائے۔ ایسا کرنے سے اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔“ (74)

ندیم بھی ایک انسان ہیں اور جن سے اُن کو اختلاف رائے رہا وہ بھی انسان ہی ہیں جب کہ ندیم کے نزدیک:

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز ”اذنِ کلام“  
ہم تو انسان کا ”بے ساختہ پن“ مانگتے ہیں

یہاں بھی تو نہیں چند ایک ”اختلافات“ پر نظر ڈالتے ہیں۔ فیض صاحب اور ندیم صاحب میں زیادہ تر اتفاق رائے تھا جب کہ دونوں دوست تھے اور ایک دوسرے کی خامیوں سے آگاہ تھے تو ایک دوسرے کی خوبیوں سے بھی آشنا تھے۔ چنانچہ ندیم نے جب اپنے اہم دوست اور بڑے شاعر فیض احمد فیض کا نہایت خوب صورت خاکہ لکھا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا حالانکہ اسے پڑھ کر فیض پر پیارا آتا ہے اور وہ ہمیں

اپنے اور قریب محسوس ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے دو تین باتوں کو پرکھ لینا ضروری ہے۔  
 محمد طفیل اور بشیر موجد نے 1966 سے لگا تار دس برس محنت کے بعد 1976 میں ”ندیم نامہ“ کے  
 عنوان سے کتاب مرتب کر کے شائع کی۔ اس میں اہم ناقدین کے ساتھ ساتھ بڑے شعرا نے بھی  
 ندیم پر طویل یا مختصر مضامین لکھے۔ فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری کے بعد اور احسان دانش اور عابد علی  
 عابد سے پہلے ان سب کے برخلاف فیض صاحب جنہوں نے ”میزان“ میں سنجیدہ تنقیدی مضامین لکھے  
 تھے، یہاں اپنے معمول کے طرز بیان کے برعکس مزاحیہ اور تضحیک آمیز انداز تحریر اپنایا۔ یہ کوئی معمولی اور  
 نظر انداز کردی جانے والی بات نہیں ہے بلکہ یہ قابل غور ہے۔ مثلاً ندیم پر مضمون لکھنے کی درخواست کے  
 جواب میں ان کی تحریر کے چند بظاہر بے ضرر جملے ملاحظہ کیجیے (انہوں نے اپنی اس تحریر کو مبہم اور غیر واضح  
 عنوان دیا تھا ”بے تکلف فن کار“) وہ لکھتے ہیں:

” (ندیم پر لکھنا) ہم کسی طرح نال گئے تھے ”اے“ ”یک پہلو“ آدمی کے بارے  
 میں لکھیں کیا اور کیسے؟“..... ”جو بھی کام کرتے ہیں ہمیشہ اس بے تکلفی سے اور بلا آورد  
 کرتے ہیں جیسے پہلے سے اسی پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے“..... ”شاعری اور افسانہ نویسی  
 کی حد تک تو خیر سمجھ میں آتا ہے کہ مشق سے قادر ہو گئے ہوں گے“..... ”ان کا نام قریب  
 قریب ہر ادبی پرچے میں دندا نا نظر آتا تھا“..... ”جب ندیم سے میری ملاقات نہیں  
 تھی ممکن ہے ایک آدھ سرسری ملاقات رہی ہو جو ذہن میں نہیں“..... ”فطرت کو چاہیے  
 تھا کہ ان کا نمبر رندوں اور چاک گریبانوں کی بجائے واعظوں اور ناصحوں میں لکھوایا  
 ہوتا“..... ”میں کبھی سوچتا ہوں کہ ندیم صاحب نے بہت سے نہایت مؤثر عاشقانہ  
 اشعار اور افسانے لکھے ہیں لیکن انہوں نے کبھی عاشقی کی بھی ہے یا نہیں۔ مجھے شبہ ہے  
 کہ نہیں کی۔“ (75)

اور اپنی اس تحریر میں فیض صاحب نے ندیم کے کسی ایک بھی شعر، کسی ایک بھی افسانے کا ذکر تک کرنا  
 بھی مناسب نہیں سمجھا۔ اسی طرح 1975 میں جب صہبا صاحب نے ”افکار“ کے ندیم نمبر کے لیے لکھنے  
 کو کہا تو تب بھی اپنے ایک اہم ہم عصر، ہم خیال شاعر، افسانہ نگار، نقاد، کالم نگار اور دانشور کے لیے  
 نکالے گئے اس نمبر کو ایک مدیر کا دوسرے مدیر کی خدمات کا اعتراف قرار دیا۔ فیض لکھتے ہیں:  
 ”آپ نے ہم عصر ادیبوں سے متعلق خاص شماروں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ

اپنی جگہ قابل ستائش بات تھی ہی۔ لیکن اب کے جو آپ ندیم قاسمی نمبر نکال رہے ہیں تو اس میں خوشگوار اضافہ اور ہوا، یعنی ایک مدیر دوسرے مدیر کے بارے میں خاص نمبر چھاپ رہا ہے جو غالباً منفرد ہے۔“ (”افکار“ ندیم نمبر، ص: 34)

انصاف سے کام لے کر بتائیے کہ بڑے بڑے اور اہم شعرا کی سنجیدہ اور وزن رکھنے والی آراء کے درمیان کیا فیض صاحب کے یہ تمسخر آمیز ہلنچلے جملے خود اُن کے یا اُن کے ہم خیال دوست کے شایانِ شان تھے؟ ندیم صاحب 1952 سے (جب دورہ چین کے وقت فیض صاحب نے پورے دورے کے دوران اپنے وفد کا چینی ادیبوں سے تعارف کرواتے ہوئے دوسرے ساتھیوں مثلاً مشرقی پاکستان کے صحافیوں کے شاعر ادیب ہونے کا ذکر تو ہر بار کیا لیکن ایک بار بھی یہ نہیں بتایا کہ ندیم بھی ایک شاعر ایک افسانہ نگار ہے اور انھیں صرف ایک مقامی زبان کے اخبار کا ایڈیٹر بتایا) دل و دماغ پر ضربیں سہتے آرہے تھے۔ آخر ندیم جو دور و مند حساس دل کے مالک شاعر اور ادیب تھے، تڑپ کر یہ کہہ اُٹھے تو کوئی انوکھی بات نہیں کہ:

”جو کچھ ہم دونوں (فیض اور ندیم) نے لکھا ہے۔ اس کے بارے میں صحیح رائے تو مستقبل کا کوئی دیانت دار نقاد دے سکتا ہے۔ میں تو فیض صاحب کا بہت نیاز مند رہا ہوں۔ مجھے جب بھی موقع ملا، میں نے اُن کی شاعری کی بہت تعریف کی۔ مجھے ان کی شاعری کے طلسم کا اعتراف ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں کبھی تو فتنے نہیں ہوئی۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ جب بھی اُن سے میری شاعری کے بارے میں پوچھا گیا۔ اُنہوں نے کہا: ”اچھے افسانے لکھتے ہیں، کالم بھی عمدہ لکھتے ہیں اور شعر بھی ٹھیک کہہ لیتے ہیں۔“ اس سے زیادہ اُنہوں نے میرے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے فیض سے کوئی رقابت نہیں۔ وہ ہمارے بزرگ ساتھی تھے۔ اس لیے کہ مجھ سے پانچ برس بڑے تھے۔“ (76)

جمیل یوسف کے خیال میں:

”ندیم صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ شاعر زودرنج بھی ہوتے ہیں یہ تو سراسران کا خلوص اور صاف گوئی تھی کہ جو اُن کے دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ وہ ہمارے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی طرح منافق نہیں تھے جو اُنہوں نے محسوس کیا، واشگاف



اس کا اظہار کر دیا۔ ان کے دل میں جو بات ہوتی، بلا تھجک زبان پر لے آتے۔ ہم میں کتنے ہیں جو اس طرح بے دھڑک اپنے دل کی بات کہہ دینے پر قادر ہیں؟ وہ نجی مجلس میں غیبت کا ارتکاب کرنے کی بجائے اپنے محسوسات ضبط تحریر میں لے آئے۔ یہ ان کے کردار کی بلندی تھی، راست بازی تھی، انہوں نے حرف کی حرمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔“ (77)

جب کہ اکبر حمیدی کی رائے یہ ہے کہ:

”ندیم صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری رہے تو مخالفین کی مخالفت کا دلیری سے سامنا کیا۔ جیل بھی گئے، الزامات بھی برداشت کیے مگر اس مرکزی عہدے کے فرائض پوری قوت اور دیانت داری سے ادا کیے۔ فیض صاحب کی طرح (انجمن کی) کوئی اہم اور مشکل ذمہ داری قبول کرنے سے کبھی پہلو تھبی نہیں کی۔ فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کیا ایسا فیض صاحب نے دانستہ کیا۔ جو لوگ طبقہء اشرافیہ کے رکن تھے، تحریکوں میں شامل ہو کر حوادثِ روزگار کا سامنا کرنا ان کے مزاج کے منافی تھا۔ ایسے کام کو تو ندیم جیسے لوگ ہی کر سکتے تھے جو معاشرے کی ماریں کھانے اور اس کا دلیری سے سامنا کرنے کے عادی تھے۔“ (78)

منصورہ احمد لکھتی ہیں:

”سہ ماہی“ معاصر میں ایک سوانحی خاکہ چھپا اور ترقی پسندی کے داعی ایک محدود سے حلقے میں بھونچال آگیا مگر کیوں! حالانکہ خاکہ لکھنے والا بھی ترقی پسند، موضوع مضمون بھی ترقی پسند اور بھونچال زدہ احباب بھی ترقی پسند۔ ترقی پسندوں نے بہت بلند آہنگی سے انسان کی آزادی رائے کا حق مانگا تھا، پھر خود ہی اس پر شب خون مارنے بیٹھ گئے۔ انصاف کا تقاضا جب گھر کی دہلیز تک پہنچے تو پلڑا اکثر ڈول جاتا ہے۔ دیکھئے ایسے سوانحی خاکوں میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلی تجربہ اور دوسری رائے، آپ کے پاس زیادہ سے زیادہ اختیار اس رائے سے اختلاف کا ہوتا ہے یا اتفاق کا۔ تو پھر یہ احباب، صاحب مضمون کو اپنی رائے کے اظہار کے بنیادی حق سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں؟“ (79)



اس ”اختلاف“ کے آخر میں فیض صاحب پر ندیم صاحب کے سوانحی خاکے کے متعلق مشفق خواجہ کا نہایت اہم تبصرہ ملاحظہ کیجیے۔ پھر اس ساری صورت حال کے بارے میں بلا تعصب انصاف کیجیے اور اپنی رائے قائم کیجیے۔ ایسا کرنے سے فیض کی مستند بڑائی اور ندیم کی منفرد عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مشفق خواجہ ایک خط میں لکھتے ہیں (یہ خط ”فتون“ کے شمارہ نمبر 124 میں شائع ہوا):

”معاشر“ میں فیض صاحب پر آپ کا خاکہ پڑھا۔ فیض صاحب کے بارے میں شاید ہی کوئی مضمون ہو جو میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ میں نے ایسا متوازن اور خوبصورت شخصی خاکہ کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ آپ نے پہلی مرتبہ فیض صاحب کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ کل احمد فراز کراچی میں تھے۔ محترم یوسفی صاحب کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بھی آپ کے بیان کردہ واقعات کی تصدیق کی۔ آپ کے شخصی خاکوں کا ایک الگ مجموعہ بھی اب چھپ جانا چاہیے۔“ (80)

اب جماعت اسلامی اور رجعت پسندوں سے اختلاف پر ایک نظر۔ ندیم صاحب سے ایک انٹرویو میں یہ سوال پوچھا گیا کہ ”جماعت اسلامی دوسرے ترقی پسند ادیبوں سے زیادہ ناراضی ظاہر نہیں کرتی لیکن اس کے حامی آپ کے جریدے پر خوب بدستے ہیں اور کئی آپ کو لادین ادبی عناصر کا ”سر خیل“ کہتے ہیں۔ آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے“۔ تو ندیم صاحب نے مختلف واقعات کے ذریعے تفصیلی جواب دیا اور آخر میں یہ بھی کہا:

”..... پھر مولانا مودودی کی وفات پر میں نے ”فتون“ میں مولانا کے اسلوب بیان، سلاست اور روانی کی تعریف کی تو میرے ترقی پسند دوست مجھ سے بہت ناراض ہوئے۔ دراصل میرا گناہ یہ ہے کہ میں حق بات کہتا ہوں اور جماعت اسلامی کے اہل قلم جو اخباروں میں میرے خلاف صفحات سیاہ کر رہے ہیں، اتنے تنگ نظر ہیں کہ اس طرح کے واقعات کو بھول گئے ہیں۔ جہاں تک لادینی عناصر کا سرخیل ہونے کا تعلق ہے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں کس طرح لادین ہوں..... اب تو میں حج بھی کر آیا ہوں۔“

”جماعت اسلامی کے حلقوں میں میری مخالفت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب بھی ترقی پسند تحریک پر حملہ ہوا، میں نے اس کا جواب دیا اور (اُن پر) واضح کیا کہ اُن کا موقف درست نہیں..... (دیگر بڑے بڑے ترقی پسند لیڈروں) نے ترقی پسند تحریک کے دفاع

میں دو سطر یہ نہیں لکھیں لیکن مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اور اُسکے اندر باہر کے حالات سے واقف ہوں، اس پر ہونے والے غلط اعتراضات کا جواب نہ دوں، اور شاید اس کی سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔“ (81)

اب ایسا تو ہوتا ہے کہ جتنے زیادہ چاہنے والے ہوں اُن کے ساتھ ساتھ اختلاف رکھنے والوں کا بھی اکثر ایک حلقہ موجود ہوتا ہے۔ میں تو بچپن سے یہ دیکھتی آرہی تھی کہ کسی بھی غلط فہمی کی بناء پر میرے باجی سے ناراض ہونے والے اکثر کچھ ہی عرصہ بعد اصلیت سے آگاہ ہو جاتے۔ یوں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا اور وہ خود ندیم سے صلح کرنے آ جاتے۔ سوائے ایک گروپ کے۔ جب کہ وزیر آغا گروپ کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں ندیم صاحب نے وائس آف جرمنی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

”ذاتی طور پر میرا کوئی گروپ نہیں، میرا گروپ کوئی اگر ہے تو اچھے لوگوں کا، اچھے ادب کا گروپ ہے، اچھے شاعروں، اچھے افسانہ نگاروں کا ہے اور میں نے اپنے رسالے میں بھی انہی لوگوں کو شائع کیا ہے جن کی تخلیقات میرے معیار کے مطابق ہوتی ہیں، چاہے وہ کسی بھی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ جب میں دوسرے ملکوں میں جاتا تھا تو مجھ سے پہلا سوال یہی پوچھا جاتا کہ آپ کیوں گروہ بندیاں کر رہے ہیں اور میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ میں ہرگز ایسا نہیں کر رہا اور جو کر رہے ہیں وہ اُلٹا مجھ پر ہی الزام دھرتے ہیں کہ میرا کوئی گروپ ہے۔ باقی جہاں تک دوستیاں ہیں۔ ایسے لوگوں سے بھی ہیں جو دوسرے نظریے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بحیثیت انسان مجھے پسند ہیں تو اس لیے اُن سے میری دوستیاں ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونا کہ میں نے کوئی گروپ بنالیا ہے، سراسر غلط بات ہے۔“ (82)

جب کہ 1994 میں اور پھر 2004 میں فنون کے ایک اہم اور مشہور ادارہ میں ندیم وضاحت کرتے ہیں کہ:

”ان سطور میں میرے مخاطب میرے خیر خواہ، میرے بد خواہ، میرے دوست، میرے دشمن، میرا اثبات کرنے والے، میری نفی کرنے والے سبھی ہیں۔“

”بعض عناصر نے ادبی دنیا میں گزشتہ کئی برسوں سے ایک مغالطے کو حقیقت کا رنگ دے کر عام کر رکھا ہے۔ مغالطہ یہ ہے کہ میں ایک ادبی گروہ، یا کسی ادبی گروپ کا سربراہ

ہوں۔ اس گروہ کو کبھی ندیم گروپ، کبھی قاسمی گروپ اور کبھی فنون گروپ کا نام دیا جاتا ہے اور اس مغالطے کو بڑے اہتمام کے ساتھ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے براعظموں میں رہنے والے اردو دان طبقوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔“

میں اعلان کرتا ہوں کہ میرا یا میرے احباب کا یا میرے رسالے کا کوئی گروپ نہیں ہے۔ ”فنون“ کے مندرجات گواہ ہیں کہ گزشتہ برسوں میں اس کا طرز عمل کا سموپالیٹن رہا ہے۔ ”فنون“ کو نظریاتی یا شخصی یا گروہی وابستگیوں سے بلند ہو کر مرتب کیا جاتا ہے۔ اس ادبی مجلے کا ایک معیار مقرر ہے۔ اگر کوئی تحریر اس معیار پر پورا اترتی ہے تو یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ اور کس کا دوست یا دشمن ہے؟ اس معیاری نظم یا غزل یا افسانے یا مضمون کو درج کر دیا جاتا ہے۔“

”مجھے ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا ہے میرے پاس جماعت سازیوں اور حلقہ بندیوں کا وقت بھی نہیں ہے اور اتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ کسی گروہ یا کسی فرد کو خرید سکوں۔ پھر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی کی مہلت کو کشیدگیوں اور دشمنیوں میں ضائع کرتا پھروں؟“ (83)

ندیم نے یہ بھی کہا ہے:

”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے ارباب سیاست کی طرح یہاں کے اہل شعرو ادب میں بھی قوت برداشت ختم ہو چکی ہے۔ اختلاف کا حق تو یقیناً کبھی کو حاصل ہے مگر اظہار اختلاف کے بھی چند تہذیبی اور اخلاقی معیار ہیں۔ دردناک بات یہ ہے کہ آج شعرو ادب کی دنیا میں مہذب اور اخلاقی معیار بھی گردن زدنی قرار پا چکا ہے اور بہتان و دشنام کی ایک آندھی سی چل رہی ہے اس کے ساتھ ہی محسن کشی اور احسان فراموشی کی وبا بھی شاید اسی احساس کمتری کی وبا کی وجہ سے پھیل رہی ہے اور حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد بارہا یاد آتا ہے کہ ”جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔“

”دراصل احساس کمتری کی طرح منافقت نے بھی بعض اچھے خاصے شاداب ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے بہر حال آج کے شعرو ادب کی صورت حال انتہائی تشویشناک ہے اور ادب کے ماحول کو مزید آلودہ ہونے سے بچانے کی سعی کرنا ہر ایمان

داراہل قلم پر فرض ہے۔“ (84)

اسی لیے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی رائے میں:

”احمد قسیم قاسمی کو اپنی زندگی میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے ساتھ مخالفین کی طعنہ زنی کا سامنا رہا۔ تاہم وہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہے اور ایک مستعد اور فعال زندگی گزار کر اس عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوئے کہ ان سے محبت کرنے والوں اور عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے اور محبت کے پھول بچھا کر رکھنے کے لیے موجود تھی۔“ (85)

اے حمید ایک دلچسپ واقعہ سنانے کے بعد بیان کرتے ہیں:

”میں نے قاسمی صاحب کو لڑائی کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اختلاف ضرور کرتے تھے۔ نظریاتی اختلاف انھیں ضرور ہوتا تھا اور وہاں یہ سختی سے ڈٹ جاتے اور کسی صورت بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ لوگ ان کے نظریاتی اختلاف کو ذاتی رنجش یا دشمنی کا سبب بنا لیتے اور ذاتیات پر اتر آتے۔ ایک بار لاہور میں رہنے والے ہمارے ایک پرانے ساتھی نے اخبار میں قاسمی صاحب کے خلاف ذاتی رنگ میں مخالفت شروع کر دی۔ پاکستان کونسل کی ایک تقریب میں قاسمی صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے مخلصانہ سادگی سے مجھ سے پوچھا: ”یہ شخص میرے خلاف کس لیے لکھ رہا ہے؟ میں نے تو اس کے بارے میں کبھی نا مناسب بات نہیں کی۔“ (86)

امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:

”ان کی وفات سے چند گھنٹے قبل ان کی ذہنی یکسوئی اور احساس ذمہ داری کا یہ حال تھا کہ اس عالم میں بھی انھیں 15 جولائی کو مجلس ترقی ادب کی بورڈ میننگ کی فکر تھی کہ اگر وہ ملتوی ہوئی تو کئی ملازمین کے واجبات کا کیس رہ جائے گا جس سے ان کو مالی پریشانی ہوگی۔ ان ملازمین میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے طرز عمل سے گزشتہ برس مجلس کی ڈائریکٹر شپ سے استعفیٰ دینے کے دوران وہ سخت دل تنگ اور اُداس تھے۔“

”ان کی طبیعت میں جو نرمی، گداز، برداشت اور معاف کر دینے کی حیرت انگیز خوبی تھی، اس کا مظاہرہ یوں تو میں اکتالیس برس سے دیکھتا آ رہا ہوں لیکن دوران گفتگو



جب ہمارے ایک ہم عصر شاعر اور ایک ادبی رسالے کے مدیر کا ذکر آیا جو نجانے کیوں گزشتہ کچھ عرصہ سے اُن کی کردار کشی پر اترا ہوا تھا اور اب قاسمی صاحب کی طرف سے دائر کردہ ہتک عزت کے مقدمے میں مجرم قرار دیا گیا تھا تو ندیم صاحب نے اس کے بارے میں ایک جملہ کہا جو وہی کہہ سکتے تھے کہ کردار کی ایسی عظمت، وسیع النظر فی اورنا قابل معافی صورت حال میں معاف کر دینے کی صلاحیت اب کتابوں میں نظر آتی ہے۔“ (87)

”احمد ندیم قاسمی ایک ایسی نسل کے آخری نمونوں میں سے تھے جو زندگی کو پورے وثوق سے برتنے پر قادر تھے۔ یہ نسل زندگی کو ایک اجتماعی کل کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ ندیم صاحب کے موضوعات زمینی حقائق سے پوری طرح جوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دکھ اور ابتلا کو خود اپنی جان پر جھیل کر جانا تھا اُن کی ذات سے وابستگیاں بڑی گہری اور شدید رہیں۔ ہر بڑے آدمی کی طرح انھیں بھی مخالفت، دشمنی، حسد اور بعض کے رنج سہنا پڑے۔ محبت اور عداوت دونوں دھند پھیلا دیتی ہیں۔ یہ دھند چھٹ جائے گی تو اُن کے فن کے حقیقی خدو خال زیادہ نکھر کر سامنے آئیں گے۔“ (88)

ندیم صاحب کے ایک ہم دفتر رکن محمد امجد کے خیال میں:

”قاسمی صاحب نے نہ صرف عمدہ ادب تخلیق کیا بلکہ عمدہ ادب تخلیق کروایا بھی۔ بے شمار ادیب ایسے ہیں کہ جو صرف انھی کے تربیت یافتہ ہیں۔ آپ نے لوگوں کو قلم پکڑنا سکھایا، انھیں لکھنا سکھایا، مگر ان میں سے کئی ایسے ہیں جنہوں نے جب قلم پکڑنا سیکھ لیا تو انھوں نے اُسی قلم کو اُن کے خلاف استعمال کیا۔ مگر قاسمی صاحب اس پر بھی خوش ہیں اور خوشی انہیں اسی بات کی ہے کہ وہ جنھیں لکھنا سکھانا چاہتے تھے، انھیں بہر حال لکھنا تو آگیا: میں نے سنا کہ وہ مجھ سے الجھ رہے ہیں..... مجھ پر برس رہے ہیں سرور ہوں میں لیکن..... گالی ہو یا دعا ہو..... کچھ بولتے تو ہیں وہ..... جو میں نے ہی تراشے..... لب کھولنے لگے ہیں..... اب بولنے لگے ہیں (ندیم) ”میں بت تراشنا ہوں“ ”ارض و سما“ منفرد شاعر جو شلیخ آبادی دکھے دل سے کہتے ہیں:

”مجھ ما مراد کی یہ آرزو ہے کہ قاسمی پھولے، پھلے، پروان چڑھے اور اُس کی شاعرانہ



برتری کو دنیا جانے اور ماننے کی طرح مانے۔ لیکن میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں بد نصیب ملکوں میں ادبی نقطہ نگاہ سے اس قدر اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خط و خال دیکھنے سے قاصر ہو چکے ہیں۔ ارے چراغِ جلاؤ! اندھیرا ہے۔“ (90)

ندیم سے اکثر اختلاف رکھنے والے نظریاتِ اقبال اقرار کرتے ہیں کہ: ”اُن کی زندگی معرکہ آرائیوں سے خالی نہیں رہی اور انھوں نے اپنے نظریات پر کبھی کبھوتہ نہیں کیا۔ جب کہ انھوں نے کم از کم چار نسلوں کو متاثر کیا، چوں کہ وہ زندگی بھر انتہائی فعال اور زندہ ادیب کی طرح رہے، اس لیے لامحالہ ان سے اختلاف کرنے والوں کی بھی کبھی کمی نہیں رہی لیکن ان کے چاہنے والے مقدار اور تعداد میں اتنے ہیں کہ زندگی میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئے ہوں۔“ (91)

یہ بالکل درست ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ندیم صاحب کے آخری عشرہ عمر میں ان کے ارد گرد موجود قریبی دوست ہستی سے خود ندیم کے کردار، شخصیت اور فن و دانش سے پھوٹی بے انتہا روشنی نادر برداشت نہ ہو سکی، اور سہی نہ جاسکی۔ اب وہ ہستی ہر کرن کو خود لے لینا چاہتی تھی۔ اچھے خاصے اخلاص پر اُس کی گہری ہوتی جاتی مطلب پرستی، دروغ گوئی اور ضد حاوی ہونے لگی۔ اس خود غرضی کے پھیلاؤ سے یہ ہوا کہ ندیم کے برہما برس سے قائم و دائم مثالی، مرتب، متوازن، معتدل اور عدیل لائف سٹائل پر بھی ضرب پڑنے لگی۔ یوں اپنی ذات سے لوگوں کو ناراض کر دینے کو پسند نہ کرتے ہوئے بھی انھیں چند ایک ناراضگیاں مول لینا پڑیں اور کچھ ذاتی نوعیت کے اختلافات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کچھ اپنوں سے دوری بھی اُس ایک اپنے کی خاطر سہنا پڑی۔ مجھے معلوم ہے کہ قلب و نظر کی گہری وسعتوں کے مالک ندیم کو سب خبر تھی۔ وہ سب جانتے سمجھتے تھے۔ (چپکے سے فریب کھالیا ہے..... ہم نے ترا بھیید پالیا ہے) لیکن چوں کہ ہمیشہ سے ندیم جو بھی رشتہ یا تعلق جوڑتے، اُسے اپنی طرف سے پورے خلوص اور مکمل دیانتداری سے نباتے اور ان اپنوں کا دل ٹوٹنے سے بچائے رکھنے کے لیے کوشاں رہتے۔ تو اب وہ اپنا یہ معمول کیسے ترک کرتے؟ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس عرصے میں کچھ لوگوں کی ندیم صاحب سے ایسی بیشتر ناراضگیوں کے پیچھے اکثر و بیشتر اسی قریبی ہستی کی مانگھی رہی۔ حد یہ کہ ندیم کی دوسروں سے خفگی میں بھی کافی حد تک اُسی کا وجود نمایاں رہا۔ کیوں کہ اب اُس کی ”سب توں“ کی سوچ بالآخر ”سب

میں،“ سے بدل چکی تھی اور اب مختلف نوعیتوں کے منفی اثرات ڈال رہی تھی۔ اس کی تفصیل بتانے کا یہ موقع نہیں۔ بس یہ کہنا ہے کہ اس سب کچھ سے ندیم رویوں کا توازن کچھ متزلزل سا تو ہوا لیکن ندیم کی کبھی نہ چھینی جاسکے والی خدا داد قوت برداشت اور سمجھ داری نے سب کچھ گرنے سے اور تباہ ہونے سے بچائے رکھا۔ ہمیشہ سے مستحکم ندیم مینارہ نور سے طوفانی لہریں لکراتی تو رہیں لیکن وہ اپنی جگہ قائم، برقرار اور حسب معمول روشن رہا۔

ایسے میں جدید افسانہ نگار رفعت مرتضیٰ یوں اظہار خیال کرتی ہیں کہ:

”نوے برس کا ایک شخص جس نے تمام عمر لفظ کی حفاظت کی، نوک پلک سنوارنے کی روایت کو آگے بڑھایا، غلط کو غلط کہنے سے رکا نہیں اور سچ کو چھپایا نہیں۔ اُس سے ناراض ہونا ہی ہے تو پھر راضی کی وجہ کا شایان ہونا بھی ضروری ہے۔ نوے برس کا ہر ایک دن ایک انعام، ایک تحفے کی مانند ملتا ہے۔ جس کے بعد ہر لمحہ ایک عید کی طرح منانے کے لیے ہوتا ہے، اس لیے کہ کس کو خبر کہ کچھ کہنے کچھ سننے کے لیے کس کے پاس کتنا وقت رہ گیا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ ناراض ہو رہے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی اماؤں کے ساتھ ناراض ہو رہے ہیں۔ کوئی کہاں تک سنے، تھک کر پیر لے کر کے لیٹ نہ جائے تو کیا کرے؟“ (92)

اور اب شاہد دہلوی کی بات بھی سنئے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

”قاسمی صاحب یقیناً عقلمند ہیں کہ بے انتہا زحمات گوارا کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں جو کام بھی سونپا گیا اس میں محنت و استقامت سے انھوں نے چار چاند لگا دیے۔ یہ سلیقہ خدا کی دین ہے۔“

ایس سعادت بزورِ بازو نیست

تانبہ بخشد خدائے بخشنده

”مگر ہم بڑے مانگنے لوگ ہیں۔ سچا اعتراف نیکی کو بھارتا ہے۔ اعتراف تو کجا ہم کسی جوہر قابل کی چمک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے شاید ہم بہت ہی چھوٹے دل کے لوگ ہیں۔ قاسمی صاحب کو اپنی بے لوث خدمات کا صلہ مخالفتوں، پریشانیوں بلکہ قید و بند کی صورت میں ملا۔ مگر وہ دھمن کے پکے تھے۔ تمام پریشانیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز

کر گئے اور مخالفت کی آگ میں جل کر قاسمی صاحب کندن بن گئے۔ جو جینٹلس ہوتے ہیں ہمت نہیں ہارتے۔ قاسمی صاحب کو با مخالف روک نہ سکی اور انکی ہمت کا سفینہ آگے ہی بڑھتا رہا نا سازگار حالات اور مخالفتوں نے انھیں سخت کوشش بنا دیا اور اس سخت کوششی نے انھیں منہائے عروج پر پہنچا دیا۔“

”ع آفریس بباد بریس ہمت مردانہ تو“ (93)

جب کہ ڈاکٹر سلیم اختر یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ:

”احمد ندیم قاسمی نہ منافق تھے اور نہ ریا کار، اپنے فنی آدرش کو اپنے قول و فعل سے زندہ رکھا۔ حاسدین، مخالفین اور بدخواہوں نے جو طویل دشنامی مہم چلائے رکھی، وہ نہ تو اُن کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین سکی اور نہ قلم کی روشنی خشک کر سکی۔“ (94)

## ندیم اخلاق و کردار:

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ ندیم

میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

ندیم کی شخصیت کے اس پہلو پر ان گنت اشخاص نے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں بس چند

ایک اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

ندیم کے ہم علاقہ کرامت بخاری لکھتے ہیں:

”وہ محنت، خلوص، لگن، رواداری، وضع داری، بردباری اور ایمان داری جیسی خصوصیات

کے حامل تھے۔“ (95)

محمد سعید شیخ نے کہا ہے کہ:

میں نے انکو دوستوں کا گلہ کرتے اور شکایت کرتے نہیں سنا۔ انکی پیٹانی سلوٹوں سے

پاک رہتی تھی۔ اُن سے بات کرنا، انکے پاس بیٹھنا ایک انعام تھا، ایک اعزاز

تھا۔“ (96)

اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کا مشہور قول دہراتے ہیں:

”جب کسی مدعی شاعر سے دوچار ہوں تو سب سے پہلے اس بات کی تحقیق کریں کہ اس

کا کردار کیا ہے۔ اس کا اقارب و احباب سے برتاؤ کیا ہے اور اگر اس میں کھوج میں اُن کے علم میں یہ بات آجائے کہ وہ دروغ گفتار، خلوص بیزار، جفا شعار، زر پرستار، فریب کار اور غدار ہے تو آنکھیں بند کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ہرگز شاعر نہیں ہے۔ شاعری و انسانیت کے پیہر انہ معیار پر نگاہ کر کے جب قاسمی کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو بلا خوف ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر اور انسانیت و شعریت کا ایک ایسا دل کشا سنگم ہے جس کا اور چھوڑ نہیں مل سکتا۔“ (97)

صلاح الدین حیدر نے تحریر کیا ہے کہ:

”اس حقیقت سے اکثر احباب آگاہ ہیں کہ وہ اپنے ترقی پسند نظریات کے باعث مشکلات اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن تمام تر مشکلات کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک طمانیت کے ساتھ مسکراہٹ کھیلتی ہوئی ملتی تھی۔ آنکھوں میں زندگی سے لبریز شوخی اور اعتماد کی لہر نظر آتی اور وہ اختلاف فکر و نظر کو ذاتی عناد میں بدلنے کے رویے کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔“ (98)

اور ڈاکٹر مسرور احمد زئی کا کہنا ہے کہ:

”اس روز قاسمی صاحب تبسم آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بے تکان ماضی کو دہرا رہے تھے، نہ لہجے میں تلخی، نہ جملوں میں بے اعتدالی، نہ الفاظ میں تُرشی، نہ بیان میں تلخی، نہ کسی کی دل شکنی، نہ اپنی تعریف میں طول کلامی، (قاسمی صاحب درد مند دل رکھتے تھے، حساس طبیعت کے مالک تھے۔ وہ پوری انسانیت کو اپنا سمجھتے تھے) دراصل یہی اُن کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے معاصرین میں ممتاز اور ممتاز رہے۔“ (99)

## ندیم مزاج:

ندیم کے دوست محمد کاظم بتاتے ہیں کہ:

”ندیم کی شخصیت کا دوسرا پہلو اُن کا وہ احساس ذمہ داری تھا جس کا ثبوت وہ اپنے دوستوں اور پیاروں کے نجی اور ذاتی معاملات میں دیتے تھے۔“ (100)



مسعودا شعر لکھتے ہیں:

”تمام کڑوی کیلی باتوں کے باوجود اُن کے مزاج میں کڑواہٹ نہیں آئی تھی ہم (میں اور کاظم صاحب) جب بھی اُن کے پاس جاتے وہ اسی طرح خوش گوار موڈ میں نظر آتے۔ اُن کا ہنسی مذاق اور اُن کے لطیفے اسی طرح چلتے رہتے۔“ (101)

ڈاکٹر خورشید رضوی کا کہنا ہے کہ:

”قاسمی صاحب کا شعر:

یوں تو سمیٹ شوق سے توشتہء آخرت مگر

وہ جو ہیں زندہ اُن پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

اُن کے شخصی رویے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ وہ بڑے زبردست رجائی تھے اور انھیں رحمت الہی پر بڑا زبردست اعتماد تھا۔ چنانچہ توشتہء آخرت کی انھیں زیادہ فکر نہ تھی مگر زندگی کے قرض نمٹانے کی اُن میں بڑی تڑپ تھی۔ وہ روئے زمین پر خصوصاً وطن عزیز میں جس زندگی کو دیکھنے کے تمنائی تھے اُس کا اظہار اُن کی مشہور نظم ”وطن کے لیے دعا“ میں بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔

خدا کرے کہ مرے کبھی بھی وطن کے لیے

حیات مجرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو“ (102)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے لکھا ہے کہ:

”اُن کی شخصیت کا ایک خاص وصف اُن کے حلقہء ارادت پر اس وقت کھلتا تھا جب وہ

انتہائی محبت و احترام سے دوسروں کو مخاطب کرتے تھے۔“ (103)

فیاض عزیز اس بارے میں لکھتے ہیں:

”بقول قیوم نظامی اُن کے پاس بیٹھ کر اپنے ہونے کا احساس ہوتا تھا اور بڑے بڑے سیاست دانوں اور دانشوروں کے پاس بیٹھ کر صرف اُن کے ہونے کا پتہ چلتا تھا جو صرف خود کو ابھارتے تھے۔ اپنے نام نہاد اور جھوٹے کاموں اور کارناموں کو اُجاگر کرتے تھے لیکن قاسمی صاحب دوسروں کو اُجاگر کرتے تھے۔ اُن کے ہنر اور ٹیلنٹ کی بات کرتے تھے اور انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے تھے۔ ایسا کوئی سچا انسان ہی کر سکتا

تھا، کوئی معمولی شخص نہیں۔“ (104)

منصورہ احمد بتاتی ہیں کہ:

”نومبر کا مہینہ ہمارے لیے جوش اور ولولے کا مہینہ ہوتا تھا..... سب سے پہلے ہم

کارڈ (نہیم کی سالگرہ کا) ڈیزائن کرتے۔ بابا سے چھپا کر اس کی عبارت لکھتے، ورنہ یہ

خطرہ رہتا کہ وہ تو صیغی لفظ یا فقرہ کٹوانہ دیں۔“ (105)

یہ نہیم مزاج، جس میں رویوں کی سادگی بھی تھی اور ذہانت و فطانت کی بوقلمونی بھی تھی۔ اُس مزاج

کی یہاں صرف چند جھلکیاں دیکھی ہیں ورنہ بقول جمیل الدین عالی:

”اُن کی ذات و صفات ایک مضمون تو کیا کئی کتابوں میں بھی نہیں سمائے گی۔“ (106)

## نہیم سلیقہ:

بقول ڈاکٹر خورشید رضوی:

”قاسمی صاحب ایک ان تھک انسان تھے۔ وہ آخری زمانے تک دن بھر محنت میں لگے

رہتے۔ وقت کی تنظیم (TIME MANAGMENT) کا اُن میں ایک فطری ملکہ

تھا۔ وہ مصروف نظر آئے بغیر مصروف رہ سکتے تھے اور سنجیدگی طاری کیے بغیر اپنے کام

میں سنجیدہ تھے۔ اُن کے ذہن کے بطون میں ایک ترتیب تھی جو خود کو ایک جلی سلیقے سے

نافذ کرتی رہتی تھی۔“ (107)

پروفیسر سلیم الرحمن تحریر کرتے ہیں کہ:

”اُنہوں نے بڑی لگن اور تن دہی سے کہیں دُور رکھی ہوئی کتاب ڈھونڈ کر مجھے عنایت

فرمائی تھی۔ یہ کتاب ”منہو کے خطوط“ تھی..... مجھے عنایت فرماتے ہوئے ان کا جوا انداز

اور پر جمال سلیقہ تھا وہ میرے لیے کسی ادبی ایوارڈ سے کم نہیں۔“ (108)

محمد احسن فاروقی کی رائے میں:

”قاسمی صاحب کے ٹھہراؤ اور توازن اور نرمی میں ایک طوفان چھپا نظر آتا ہے۔ وہ ان

لوگوں میں ضرور ہیں جن کے بحر کی موجوں میں کمال اضطراب ہے مگر ساتھ ہی ساتھ

اس کو قابو میں رکھ کر ایک مخصوص رُخ کی طرف چلا کر مفید عام بنانے کا بھی شعور

ہے..... اس لیے میں انھیں ماڈل ادیب مانتا ہوں۔“ (109)

قاسمی صاحب کی بیگم رابعہ ندیم نے ایک انٹرویو میں شہناز پروین سحر کو بتایا کہ:

”مجھے اُن کی صفائی ستھرائی کی عادت پسند ہے۔ زندگی گزارنے کا وہ ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور یہ سلیقہ مجھے بے حد عزیز ہے، وہ بے حد خوش مزاج ہیں، بے حد صاف گو ہیں، کبھی کوئی لگی لپٹی اٹھا کر نہیں رکھتے۔ اس طرح بعض دفعہ مشکلات میں بھی گھر جاتے ہیں مگر مجھے ان کی صاف گوئی سے پیار ہے۔“ (110)

جب کہ اُن کی بیٹی ماہید قاسمی نے لکھا ہے کہ:

”ابا جی اپنی ایک بیوی، تین بچوں اور ملازم کے باوجود کثرتِ اپنے کام خود کر لیتے ہیں مثلاً جو کپڑے بدلنے ہوتے اُنارے، وہ خودتہ کر کے رکھ دینے یا ٹانگ دینے۔ شیو کی اور شیو کا سامان صاف کر کے قرینے سے رکھ دیا۔“ (111)

### ندیم گفتگو:

احمد ندیم قاسمی جہاں بہت توجہ سے دوسروں کی بات سنا کرتے تھے وہیں خود بھی بے حد خوش گفتار تھے۔ اشفاق احمد اکثر کہا کرتے کہ جب ندیم صاحب بول رہے ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اُن کی گفتگو اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کر لی جائے۔ محمد خالد اختر کے خیال میں:

”اس کی گفتگو ہر لطف، دل پذیر اور شگفتہ ہوتی ہے۔“ (112)

محمد کاظم لکھتے ہیں کہ:

”فنون“ کے دفتر میں میں نے ندیم صاحب کی شخصیت کا ایک خاص رخ، جس پر میں نے اس سے پہلے غور نہیں کیا تھا، بہت قریب سے دیکھا۔ وہ یہ کہ ندیم بے حد دلچسپ گفتگو کرنے والے اور ایک قدرتی اور ملہرفن لطیفہ گو تھے۔ اُن کی لطیفہ گوئی کا انداز اتنا دل آویز ہوتا تھا کہ ان کی زبان سے ایک ہی لطیفہ دسویں بار سننے پر بھی یوں لگتا جیسے پہلی بار سنا ہو۔“ (113)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے لکھا ہے کہ:

”اُن کی شخصیت کا ایک خاص وصف ان کے حلقہٴ ارادت پر اس وقت کھلتا تھا جب وہ

انتہائی محبت اور احترام سے دوسرے کو مخاطب کرتے تھے۔ یہ اُن کا بڑا اپن تھا کہ انہوں نے شرف و عظمت کی اونچی مسند پر بیٹھنے کے باوجود اپنے کسی عمل یا گفتگو سے اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اُن کی عظیم شخصیت کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے غیروں کی سنگ زنی اور مخالفتوں کی دشنام کے باوجود اپنی انسانیت نوازی اور انسان دوستی کے رویے میں فرق نہیں آنے دیا۔“ (114)

بارون الرشید کی رائے میں:

”ہمارے ملک میں اُردو ادب میں بڑے بڑے نام ہیں لیکن ندیم صاحب کی شخصیت کے اندر جو ملکوتی حسن، و جاہت، نفاست اور ایک ہمہ گیر درویشی کا جو عنصر دیکھا اور کہیں وہ نظر نہیں آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود کم بولتے تھے اور مخاطب کو زیادہ بولنے کا موقع دیتے تھے اور اس کی گفتگو ہمہ تن گوش سنا کرتے تھے۔“ (115)

علی تنہا نے بتایا کہ:

”انھیں وادی سون سکیر کی بولی ہمہ دائے فیض سے عطا ہوئی تھی۔ میں جب بھی اُن کی مادری زبان میں اُن سے بات کرتا تو اُن کے چہرے پر بے پایاں محبت منعکس ہو جاتی۔ وہ اتنی صحت اور باریکی سے اپنی بولی میں جواب دیتے کہ معلوم پڑتا، یہ انگہ سے باہر گئے ہی نہیں۔ اپنے صاحب زادے نعمان ندیم سے اپنی بولی میں بات کرتے، بہت بھلے لگتے۔“ (116)

پروفیسر حسن عسکری نے کہا کہ:

”مشاعروں میں اُن کا انداز اظہار سب سے منفرد نظر آتا، بہت سے شعرا اُن کی طرح شعر کو پڑھنے کی کوشش کرتے لیکن احمد ندیم قاسمی کا لب و لہجہ اور اُن کا مخصوص زاویہ نظر کسی اور کو نہ ملا۔“ (117)

جب کہ میرے نزدیک:

”گھر میں گفتگو کے دوران ابا جی اکثر اپنے دوستوں، شاعروں، ادیبوں فنکاروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں ہمیں بہت سی باتیں بتاتے۔ اُن کی گفتگو کا انداز اس قدر دلچسپ اور ہر کشش ہوتا کہ زندگی سے بھرپور



یہ شخصیات ہمیں اپنے ابا جی کے ہم قدم چلتی پھرتی، ہنستی بولتی محسوس ہوتیں۔“ (118)

”عام طور پر لوگ ساٹھ ستر برس کی عمر میں گوشہ نشین اور خلوت پسند ہو جاتے ہیں لیکن ندیم اپنے نوے (90) ویں برس میں بھی مکمل مجلسی آدمی رہے۔ وہ ایسی اچھی گفتگو کرتے کہ گھنٹوں بیٹھے سنتے رہیں اور پھر بھی جی نہ بھرے۔ ایسے خوب صورت لمحوں میں اُن کی آواز کا زیر و بم، اُن کے لہجے کی گرفت، اُن کی سمیٹتی کھلتی آنکھوں کی کشش اور اُن کے چہرے اور ہاتھوں سمیت اُن کے پورے وجود سے پھوٹی متحرک زندگی ندیم کے دلے پتلے مگر حسین اور بارعب وجود میں انوکھی باوقار توانائی بھر دیتی۔“ (119)

### ندیم محفل:

صلاح الدین حیدر نے تحریر کیا ہے:

”فنون“ اور مجلس ترقی، ادب“ کی محفلوں میں وہ ماضی کے واقعات، معاصرین کے خاکے، مختلف لطائف وغیرہ دلچسپ پیرائے میں سناتے۔ لیکن بے تکلفی کی فضا کے باوجود اُن محفلوں میں ایک نظم و ضبط اور ذمہ داری کا احساس بھی رہتا تھا ”فنون“ کے دفتر میں شام کو اُن کی روانگی تک بزم کی رونق میں کوئی کمی نہ آتی۔“ (120)

ڈاکٹر صابر آفاقی رونق محفل کے رخصت ہونے پر کہتے ہیں:

”ہمارے دکھ بانٹنے والا، ہمارے زخموں پر پھاہار کھنے والا، مسکراہٹیں بکھیرنے والا، ہم سے روٹھ گیا..... اب ہم کس کے سامنے اپنے دکھ بیان کریں گے؟ غم کی کہانی کس کو سنائیں گے کہ ہمارا غم خوار تو چل بسا۔“ (121)

مستنصر حسین تارڑ یاد کرتے ہیں کہ:

”فنون کے دفتر میں جمعہ کے روز ”اکٹھ“ ہوتا تھا۔ جس میں نہایت پائے کے ادیب اور فلسفی بھی شامل ہوتے محمد خالد اختر کے علاوہ محمد کاظم اور سید علی عباس جلال پوری سے بھی میری پہلی ملاقات ”فنون“ کے اس دفتر میں ہوئی۔ میں نے ان تمام لوگوں سے بہت کچھ سیکھا یہاں نہایت ہی دقیق قسم کی گفتگو بھی چلتی اور کبھی لطیف بھی چلتے۔“ (122)

علی اصغر عباس کا کہنا ہے:

”سب کا ندیم، احمد ندیم قاسمی سب سے پیار کرتا تھا، محبت بانٹتا تھا، شفقت لٹاتا تھا۔ جس کی محفل میں لوگ دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔

وہ سب کی سنتا، کوئی روتا ہوا آتا تو ہنستا ہوا واپس جاتا، مایوس آتا اور بُرا امید لوٹتا، زندگی سے ناراض آتا تو حیاتِ نو کے جذبے سے سرشار ہو کر زندگی کے تیز تر دھارے میں شامل ہو جاتا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کیوں کہ یہ محفل اس ندیم کی ہوتی تھی جو کہا کرتا تھا:

میں کسی شخص سے ہزار نہیں ہو سکتا

ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

اس قدر پیار ہے انسان کی خطاؤں سے مجھے

کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا۔“ (123)

محمد سعید شیخ لکھتے ہیں:

”قاسمی صاحب کے پاس بیٹھنے سے یوں لگتا تھا جیسے میں کسی گننے برگد کی گھنیری

چھاؤں میں بیٹھا ہوں، جس کی چھاؤں ہر راہی، ہر مسافر اور تھکے ہارے گرفتہ پا کے

لیے براہِ مہربان تھی۔“ (124)

میں ایک گھنا چڑ سرِ راہ گزر ہوں

## ندیم محبت:

داورِ حشر مجھے تیری قسم

عمر بھر میں نے عبادت کی ہے

تُو مرا نامہ اعمال تو دیکھ

میں نے انسان سے محبت کی ہے

ندیم کی پہلی محبت اُن کی ”مائے“ (والدہ) ہے۔ اُس کے بعد شعر و ادب۔ جب کہ معروف معنوں

کی سچی محبت کے سلسلے میں بیس برس کی عمر میں انھیں گاؤں کی معصوم الہڑ ”مبوجی“ اچھی تو لگی لیکن میرے

خیال میں چند برس بعد انھیں گہری اور حقیقی محبت ایک سلجھی ہوئی، پڑھی لکھی شہری لڑکی سے ہوئی۔ اس

محبت کا ذکر پچھلے باب میں بھی ہوا۔ پھر جب ندیم صاحب سے خالد سہیل نے پوچھا:

”قاسمی صاحب! آپ نے اپنی اصلی محبوبہ کا نام پوشیدہ کیوں رکھا؟“ تو ندیم صاحب نے جواب دیا: ”پاکستان میں محبوبہ کا نام نہیں بتایا جاتا..... ویسے میں یہ کہہ دوں کہ جو شخص محبت نہیں کر سکتا وہ شعر بھی نہیں کہہ سکتا۔ سو، محبت میں نے کی ہے لیکن آپ کو اس کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔“ (125)

میں سمجھتی ہوں کہ:

”احمد ندیم قاسمی کے نزدیک محبت دراصل کسی کی خوبیوں کا اقرار کرنا اور ساتھ ہی اُن خوبیوں سے اثر پذیر ہونے والی اپنی حسِ لطیف کا اثبات کرنا ہے۔ ندیم محبت کو کوئی کاروبار، لین دین یا سودا نہیں سمجھتے، نہ ہی اسے عام معمول کی بات کہتے ہیں اپنے دیگر رویوں کی طرح محبت کے سلسلے میں بھی ندیم مخصوص رومانویت یا صرف مادیت کے حامی نہیں ہیں، بلکہ اپنی معتدل مزاجی کی بدولت ان احساسات میں بھی عقل و شعور کے استعمال کے قائل ہیں۔ اسی لیے جذبہء عشق کو صرف ایک خیال یا پھر محض ایک تقاضہء بدن کے طور پر قبول کرنے کی بجائے جسم و جان میں توازن قائم کر کے اسے ایک اعلیٰ مرتبے پر فائز کرتے۔ وہ عشق کو زندگی کی تہذیب کہتے ہیں اور یہ بھی کہ عشق ہی کی قوت ہے جو آزمائشوں میں حوصلہ بخشتی ہے۔“ (126)

بہر حال زندگی کی جدوجہد کے آغاز ہی میں ان محبتوں میں ایسا نور تھا، اتنی قوت تھی کہ پھر ندیم تمام عمر مختلف افراد میں محبتیں ہی بانٹتے رہے لیکن یہ انمول خزانہ ختم نہ ہوا۔

تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبت میں نے۔ یہ بھی ہوا کہ

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے

تیری اُلفت نے محبت مری عادی کر دی

بالآخر انسان ہی اُن کا اصل محبوب ٹھہرا اور اس کے مختلف روپ کو وہ بزرگ، راہنما، دوست، بھائی، بہنیں، بیٹے اور بیٹیاں کہہ کر مودب طالب علم، مخلص دوست، گئے بھائی اور شفیق والد جیسی ذمہ داریاں بخوبی نبھاتے رہے۔

یہ تو تھی ندیم کی محبتوں کی جھلک اب ندیم سے محبت پر نظر ڈالتے ہیں۔ خوش قسمت ندیم کو حاصل ہونے والی محبتوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ انھیں ہر طرح کی محبت (اس میں ہر خلوص، گہری اور سچی محبت کے

ساتھ ساتھ، کچھ کچھ خود غرضانہ، مظلّی اور یک طرفہ محبت بھی شامل ہے) میسر رہی۔ بڑے بوڑھوں سے لے کر ننھے بچوں تک کی مخلص محبت، مرد حضرات سے لے کر خواتین تک کی سچی محبت اور دانش وروں سے لے کر عام مستری مزدور تک کی گہری محبت اسی لیے نذیم کہتے ہیں کہ:

”مجھے زندگی میں بے انتہا محبت میسر آئی ہے، بھائی کی محبت، محبوبہ کی محبت، دوستوں کی محبت، میری ادبی کاوشوں کو سراہنے والوں کی محبت لیکن ماں کی محبت کا میں اس لیے سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں کہ اس محبت نے مجھے پتھر نہیں بننے دیا۔ اگر میرے ادب میں PATHOS کا کہیں وجود ہے تو یہ میری ماں کی دین ہے اور اگر میں انفرادی دکھ کے حصار سے نکل آیا ہوں تو یہ بھی انھی کی دین ہے۔“ (127)

منصورہ احمد لکھتی ہیں:

”بابا محبت ہی محبت تھے۔ محبت کے چھوٹے سے اظہار پر سیال کی طرح بہہ جاتے، اُن سے تھوڑی سی محبت سے ہی آپ انھیں عمر بھر کے لیے جیت سکتے تھے۔ محبت کرنے والے بدل بھی جاتے، تب بھی وہ اُن کا ماضی یاد کرتے رہتے۔“ (128)

جب کہ ڈاکٹر ناہید قاسمی کے خیال میں:

”ہم سب کے نذیم نے بے حد و حساب محبت کی ہے۔ یہ تو اُن کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ انھیں جواب میں بھی بے انتہا پیار ملا۔ بچپن سے آخر تک پیار ملا۔ اپنی والدہ سے، بھائی، بہن، بیوی اور اولاد سے بھی، دوست، احباب سے بھی اور اپنے پرستاروں، اپنے چاہنے والوں سے بھی لیکن اس نہایت اچھے اور مثالی جواب کے باوجود اور اس انوکھے پیارے صلے کے باوجود میں سمجھتی ہوں اور محسوس کرتی ہوں کہ ایک رُخ، ایک پہلو شاید نذیم کی نفیس خواہش کے مطابق مکمل نہیں ہو پایا۔

میرے خیال میں ہمارا یہ عظیم ”محبت شاعر“ محبتوں کے لیے بہت قربانی دینے والا سخی فن کار، اس لحاظ سے تشنہ رہ گیا۔ وجہ یہ ہے کہ

یہ جو اک عمر سے کچھ کھوجتا پھرتا ہے نذیم  
صرف بے لوث محبت کا تمنائی ہے۔“ (129)

اور نذیم کے ایک قریبی دوست محمد کاظم کا کہنا ہے کہ:



”اُن کو جس کسی کے ساتھ دلی تعلق ہوتا اس کے ساتھ اپنے اس تعلق اور لگاؤ کا اظہار وہ بہت کھل کر اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ کرتے۔ اپنی محبت اور التفات میں ندیم صاحب ایک دریا کی مانند تھے۔ جس کا تیز دھارا کبھی ایک کنارے کو چھوتے ہوا چلا جاتا اور کبھی اس کے مقابل دوسرے کنارے کو! ندیم کے پاس اصل میں محبت اور چاہت کا ایک ”اُن گھٹ“ خزانہ تھا جسے وہ ہر دور میں اپنے قریبی دوستوں اور تعلق والوں پر لٹاتے رہے تھے یہ کہانی جب بھی کہی گئی۔ بہت دلچسپ ہوگی۔“ (130)

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ندیم کو اپنی محبتوں کا جواب بھی مستقل بنیادوں پر اُسی خلوص اور بے غرضی سے ملا؟

### ندیم انسانیت و آفاقیت:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشتِ انساں پر  
کسی بھی شہر میں جاؤں غریب شہر نہیں  
اس موضوع پر تو الگ سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی جاسکتی ہے۔ یہاں ندیم اور انسانیت کے بارے میں کچھ آراءِ ملاحظہ کیجیے:

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون ”وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے“ میں لکھتے ہیں:  
”ندیم انسان کی اجتماعی آواز والی شاعری بڑے غور و فکر کی محتاج ہے۔ اہم سوال تو یہ ہے کہ غم انسان کا مسلک محض فکری چیز ہے، یا انسانی دکھ کے گہرے تجربے سے ابھرا ہے! مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ندیم کے یہاں یہ روحانی تجربہ موجود ہے۔“

میں بظاہر اک بھنور ہوں چینختے جذبات کا  
لیکن اک بھرے ہوئے طوفان کا ساحل بھی ہوں

بھرے ہوئے طوفان کا یہ ساحل کہاں ہے؟ یہ اس مقام پر ہے جہاں شاعر شکست کے گہرے احساس میں ڈوب کر پھر ابھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے بتانا یہ تھا کہ ندیم شاعر بھی ہے اور انسان بھی ہے اور انسان ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کے دل میں دوسرے دل کے لیے جگہ ہے، اس کا دل دوسرے کے لیے تڑپ سکتا ہے، انسان دوستی کے لیے یہی کافی ہے۔“ (131)

فتح محمد ملک یوں تجزیہ کرتے ہیں کہ:

”یہ اپنی تہذیب کے بنیادی اقدار پر اٹوٹ اعتماد اور انسان کی عظمت میں ناقابل شکست یقین ہی کا کرشمہ ہے کہ ہندویم عصرِ رواں کی فنی اور فکری تحریکوں کے منفی رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر ان سے اکتسابِ فیض کر پائے ہیں..... ہندویم کے خیال میں محبت انسان کا سب سے بڑا حسن اور سب سے بڑی عبادت ہے۔“ (132)

ظفر اقبال اعتراف کرتے ہیں:

”اُن کے چاہنے والے مقدار اور تعداد میں اتنے ہیں کہ زندگی میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئے ہوں۔ اُن کا نقطہ نظر ہمیشہ رجائی رہا اور وہ انسان اور انسانیت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔“ (133)

جب کہ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے:

”میرا نظریہ انسان دوستی کا ہے۔ اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہزار نظریے بدل جائیں، ہزار عقیدے بدل جائیں، انسان دوستی اور انسانی محبت کا نظریہ اپنی جگہ قائم ہے..... مساوات تو ہونی چاہیے، انصاف تو ہونا چاہیے۔ اگر یہ سب چیزیں ہمیں مل بھی جائیں تب بھی انسان تو موجود ہوں گے اور انسان کو دوستی کی ضرورت ہمیشہ ہوگی۔“ (134)

ہارون الرشید، ہندویم صاحب کی یاد میں لکھتے ہیں کہ:

”بابا محبتوں اور شفقتوں کے دیوتا تھے۔ وہ ہر ایک کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اب اُن کا خیال زلا زلا دیتا ہے وہ نہایت حساس انسان تھے۔ جو دوسروں کے درد پر اتنا تڑپتا ہو، وہ اپنے ذاتی دکھ کو کیسے سہتا ہوگا۔ سوچنے والی بات ہے وہ خود ایک تہذیب تھے جو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہے سیلف میڈ انسان تھے ساری انسانیت کے لیے بلا مذہب و قوم درد رکھتے تھے۔ دُنیا میں جہاں بھی ظلم ہوتا، اس کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے بھرپور جنگ کرتے۔ اُن کی پوری شاعری میں انسانیت ایک طاقت و راستعارے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔“ (135)

ہندویم کے دفتر کے ایک کارکن محمد امجد کا کہنا ہے:

”یہ اُن کی عادت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے کو ”صاحب“ کے لاحقے کے ساتھ بلا تے

تھے۔ دراصل قاسمی صاحب ملازم کو سب سے پہلے انسان سمجھتے تھے اور انسان عظیم ہے  
خدا یا، ”اُن کا فلسفہ حیات تھا اور یہی اُن کی زندگی کا اصل نچوڑ تھا وہ ملازم کی غلطی پر کبھی  
اُسے ڈانٹتے نہ تھے بلکہ بڑے پیار سے سمجھا دیتے تھے۔“ (136)

عورتیں بھی انسان ہیں اور طالبات سے ایک انٹرویو میں ہندیم صاحب خواتین کے بارے میں کہتے ہیں کہ:  
”اگرچہ میں ایک بہت ہی قد امت پسند گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں مگر میرے نزدیک  
عورتوں کو گھروں میں پابند رکھنے سے بڑا ظلم کوئی نہیں۔ ہماری چودہ کروڑ کی آبادی ہے  
جس میں بڑا حصہ خواتین کا ہے۔ اس حصے کو نظر انداز کرنا درست نہیں۔ اسلام نے ہمیں  
یہ بتایا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق مساوی ہیں، اسی لیے میرے نزدیک  
پاکستانی عورت کو بھی اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہونا چاہیے۔“ (137)

یہ دیکھ کے، رہبران ”حق پر“..... وحشت سی سوار ہو رہی ہے  
انسان کی ہو رہی ہے گھٹی..... عورت بھی شمار ہو رہی ہے  
جب کہ صائب الرائے نقاد محمد علی صدیقی ہمارے اس انسان دوست شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں:  
”احمد ہندیم قاسمی مادہ پر ذہن کی فوقیت تسلیم کرتے ہیں۔ ماورائی طرز فکر کے اصولاً مخالف  
نہیں اور مذہب کو خیر و برکت سے متصادم نہیں سمجھتے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں سماجی  
عدم مساوات اور ہرنوع کی اخلاق باختگی کے خلاف ایک مسلسل پکار ملتی ہے جو انھیں ایک  
انسان دوست شاعر کے اعلیٰ منصب کی طرف لے جاتی ہے۔ قاسمی انسان کو تجرید و تجسیم  
دونوں صورتوں میں امکانات خیر و برکت کا پتلا سمجھتے تھے۔ انسان اُن کے یہاں ایک  
جمالِ باطنی ہیکر صوت و صورت و آہنگ بن کر ابھرتا ہے۔ یہ رخ بہت نیا اور انوکھا ہے لیکن  
قاسمی کی انسان دوستی کو یورپی اصطلاح HUMANISM کی روشنی میں نہ دیکھا  
جائے۔ قاسمی کی انسان دوستی دراصل ترقی پسندی کا عاواظ عظیم مشترک ہے۔“ (138)

### ہندیم افکار:

احمد ہندیم قاسمی اپنے افکار و خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:  
”جب میں جوان ہوا تو میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں جس ملک میں رہتا ہوں، اس پر ایک غیر

ملکی سامراج کیوں مسلط ہے اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ میرے آس پاس انسانوں کی اکثریت اپنی ابتدائی ضرورتیں پوری کیوں نہیں کر سکتی اور وہ زندگی کی ہر آسائش سے محروم کیوں ہے؟ بیشتر انھی دو دکھوں نے میری شاعری اور نثر میں اظہار پایا۔ نہ میں نے برطانوی استعمار کو بخشا اور نہ ہی اپنی انسانی برادری کی محرومیوں کو نظر انداز کیا۔ ساتھ ساتھ میں نے انسانوں کی باہمی محبتوں اور ان محبتوں کی گونا گوں کیفیتوں کے بھی گیت گائے کہ کوئی بڑے سے بڑا نظریہ بھی انھیں گزند پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری ترقی پسندی نے بنیادی انسانی جذبات کی کبھی نفی نہیں کی کیوں کہ یہ جذبے ہی تو انسان کو انسان بناتے ہیں۔“

”آزادی کے بعد بین الاقوامی دہشت گردی کے علاوہ خود اپنے بھائی بندوں کا قلم و جبر میرا موضوع فن رہا۔ میں نے ویت نام، فلسطین اور دیگر عالمی مسائل پر نظمیں کہتے ہوئے، کشمیر کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ایک عالمی شخصیت بننے کی بجائے اپنے پاکستانی تشخص پر اکتفا کیا کہ پاکستان ہی میری پہچان ہے پاکستان کی تاریخ بیشتر آمروں کی تاریخ ہے مگر کوئی بھی آمر مجھ سے اپنے حق میں ایک حرف بھی وصول نہ کر سکا۔ میں ان پر صاف اور غیر مبہم لفظوں میں بار بار واضح کرتا رہا کہ اہل قلم حکومتوں سے وفاداری کے عادی نہیں ہوتے بلکہ ہم تو صرف اپنے ملک اور اس میں رہنے بسنے والے کروڑوں افراد کے وفادار ہوتے ہیں میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ تم اظہار آزادی کا لاکھ گلا گھونٹو۔ ہم اہل قلم براہ راست نہیں تو علامت یا استعارے کی زبان میں اپنا مافی الضمیر بہر حال بیان کریں گے اور ہم اپنے ہم وطنوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ہر صعوبت برداشت کریں گے۔“

”یہ بھی واضح کر دوں کہ بعض ہم عصروں کی طرح میں نے انسانوں کو دوسرے درجے کی مخلوق کبھی نہیں سمجھا۔ میرے نزدیک تو انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی طرح میں نے انسان کے بہر صورت مرجانے کے دکھ سے خوف زدہ ہو کر انسانی زندگی کو لایعنی اور بے معنی کبھی قرار نہیں دیا کیوں کہ میرے نقطہ نظر کے مطابق تو جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہاں سے شاخ پھوٹی ہے اور یہ تسلسل حیات بنی نوع انسان کی فنا کی نفی



کرتا ہے۔“ (139)

”آخر ہم اس زمین سے دور رہ کر صرف کارخانوں اور آمد و خرچ کے حسابوں اور مردم شماریوں وغیرہ میں کیوں کھوجائیں، زمین، ہوا اور خلا اور خلا سے پرے بے شمار دنیا کی اور ان دنیاؤں کی بے کنار خلائیں، یہ سب کچھ انسان کا ہے۔ ہم پرواز کرتے ہوئے بھی زمین سے کیوں وابستہ نہ رہیں یہی رابطہ و آہنگ ہماری انسانیت کا محافظ ہے۔“ (140)

میرے ناقد، مرا موضوع سخن  
یہی دنیا ہے یہیں کی باتیں

### عظیم نظریہ فن و نظریہ حیات:

احمد عظیم قاسمی اپنے نظریہ فن کے بارے میں بالغ نظری سے بتاتے ہیں کہ:  
”ممکن ہے فنکار کا اپنے فن کی خصوصیات گنا نا ایک حد تک اس کی خود اعتمادی کی دلیل بھی سمجھا جاتا ہو مجھے تو یہ کہتے ہوئے بھی تکلف ہوتا ہے کہ میں اہم ہوں۔ اگر میں اہم ہوں تو میرا اتفاقاً اور میرا قاری آج نہیں تو کل اس اہمیت کا احساس ضرور کر لے گا۔ اور اگر میں کچھ ایسا اہم نہیں ہوں تو خود اپنی طرف سے ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود بھی میں غیر اہم ہی رہوں گا۔ کوئی فنکار یہ کہنے سے رہا کہ مجھ میں فلاں خامی ہے فن کی دنیا میں حرف آخر کا کوئی وجود ہی نہیں۔ فن حقیقت و صداقت کی تلاش کا نام ہے۔ یہ ایک مسلسل اور مستقل عمل ہے، جس میں انسانی ذہن ابد تک مصروف رہے گا۔

”جب میں اپنی تخلیقات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے احساس ندامت نہیں ہوتا، احساس آسودگی ہوتا ہے اور میرا ضمیر خوش ہوتا ہے کہ میں نے اپنی تخلیقی قوت سے کوئی بددیانتی نہیں کی ہے۔ میں نے اپنے ماضی سے کچھ لیا ہے تو اپنے مستقبل کو کچھ دیا بھی ہے اور انسانی فکر و احساس کے عظیم اور لامتناہی کارواں کے رستے پر سے میں نے بھی چند کانٹے ہٹائے ہیں اور چند کلیاں بچھائی ہیں۔“

”میں فنکار کو اس معاشرے، اس ملک اور اس عصر کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں وہ

سانس لے رہا ہے۔ یوں فن کو ایک معاشرتی فعل قرار دیتا ہوں اور فن کار کی ذات اور اُس کی انفرادیت اور اُس کی انا کا معترف ہونے کے باوجود میں اُس سے انسانیت دوستی کا مطالبہ بھی کرتا ہوں۔“

”جب میں تخلیق فن کو ایک سماجی فعل کہتا ہوں تو اس سے میرا مقصد محض یہ ہے کہ فنکار کو اپنے اوپر چند ذمہ داریاں عائد کرنا پڑتی ہیں اور بس جب کہ فنکار کے فکر و احساس اور اُس کے خوابوں کی حد بندی کی بجائے میں اس کا قائل ہوں کہ:

خدا نہ کردہ کسی قوم پہ یہ وقت آئے

کہ خوابِ فن رہیں شاعروں کے سینوں میں

”فن کا طرہ امتیاز ہی بے ساختگی ہے۔ یہ بے ساختگی اس سے چھن جائے تو فن تخلیق نہیں ہوتا۔ گھڑا جاتا ہے..... میں تو فن کو خاص طور پر فن شعر کو انسانی شعور کا قافلہ سالار سمجھتا ہوں اور قافلہ سالاروں کے قدموں میں بیڑیاں نہیں ہوتیں۔“

”پھر میں انسان اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں۔ اگر انسان موجود ہے اور اس کرے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے۔ انسان اور خدا، ذات اور کائنات حقیقت اور مابعد الطبیعات کے رشتوں اور مسئلوں پر بھی انسان اور زندگی کی ہی موجودگی میں غور ہو سکتا ہے۔ سو میری نظر میں انسان اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن و توازن حاصل کرنے میں مدد دے اور انسان کو منفی انداز میں اُداس نہ کرے۔“

”..... یہاں ادب کی افادیت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں:

یہ رقص و نغمہ، یہ شعرو ادب، یہ حکمت و فن

حیات کش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات آموز

”فن کی صورت میں حیات آموزی ایک ایسا دشوار مرحلہ ہے کہ اگر فن کار کو اپنے فن پر پوری گرفت نہ ہو تو وہ منبر کے سب سے بلند پائے پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ تو حسن کا رہے۔ اسے تو لفظوں سے چراغ جلانے ہیں اور پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنا ہے۔ فن کار کی اس سماجی آگاہی کا اظہار اس حسن و جمال اور اس بے نام

سی ایک طلسماتی کیفیت کے ساتھ ہونا چاہیے کہ جس کے دم سے سینکڑوں تقریریں اور ہزاروں تلقینیں شاعر کے صرف ایک شعر کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔“

”.....میرے نزدیک فن رائے کا اظہار نہیں ہے، جذبے کا اظہار ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں میں فکر کو شاعری کی عظمت اور گہرائی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہوں، وہیں اس فکری شاعری کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں ہے، جس میں صرف علم ہو اور احساس جسے چھو کر بھی نہ گیا ہو شاید میں اسی خیال کو اپنے غزل کے ایک شعر سے واضح کر سکوں:

زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں

فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں

”میں صرف اور محض فکر کی شاعری کو برداشت نہیں کر سکتا، فکر محض میں جو کج رنگی اور درشتی ہوتی ہے اس کی میرے نظریہ فن میں کوئی گنجائش نہیں۔ مگر ساتھ ہی اگر فن فکر سے خالی ہوگا تو یکسر سطحی ہوگا۔ اس کا حسن مصنوعی پھولوں کا سا حسن ہوگا۔ سو میں سمجھتا ہوں کہ بڑے فن، بڑی شاعری کے لیے خیال و احساس کی یکجائی ضروری ہے۔“

”.....میرے نزدیک غم انسان کی ایک تخلیقی قدر ہے کیوں کہ اس غم سے ہی تو اُن حالات کو ختم کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جنہوں نے یہ غم بخشا ہے پھر جب اُداس ہونا ہی پڑے گا تو اسے ایک تخلیقی قدر کیوں نہ بنا لیا جائے:

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں

ہم کوئی تم تھے کہ وابستہ غم ہو جاتے

ظلمت گہم حالات کے ویران افق پر

جو چاند چمکتا ہی رہا، وہ میرا غم تھا

”فن کار میں تخلیق کا اضطراب بے حد ضروری ہے فن کار کا محبوب انسان ہے اور جب تک انسان مضطرب ہے اور بے قرار ہے فن کار کی آسودہ خاطر بددیانتی ہے۔ فنکار ارتقا کا پرستار ہے اور ارتقاء کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہ خوب تر اور خوب تر سے خوب ترین بلکہ اُس سے بھی آگے نکل جانے کا عمل ہے۔ اس لیے سچے فنکار کے دل میں تخلیق کی لگن بجھ نہیں سکتی۔ فن تخلیق کرنا تو اپنے اندر قیامت تک کے لیے الاؤ لگا

لینے کا نام ہے اور جب تک دنیا میں ظلم ہے۔ بے انصافی ہے۔ بھونڈا پن ہے۔ عدم توازن ہے، ریا کاری ہے، انسان کے بے ساختہ پن کی پامالی ہے۔ اس وقت تک سچے فن کار کا تخلیقی اضطراب ختم نہیں ہو سکتا۔ سو میں ذاتی طور پر اپنے قاری سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اور میرے قوی سلامت ہیں، میں اس سے بحیثیت فنکار رخصت ہونے کی اجازت طلب نہیں کروں گا۔“

”یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں کسی بڑے پیغام کا شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا میں تو صرف ایک نقطہ نظر کا شاعر ہوں اور یہ نقطہ نظر صرف اتنا سا ہے کہ میں ایک خاص ملک اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہونے کے باوجود کسی انسان کو اجنبی نہیں سمجھتا۔ نقطہ نظر کی اس عالمگیریت کے باوجود مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں کیوں کہ مجھے اسی مٹی نے پیدا کیا اور انھی ہواؤں نے پالا ہے میں امن و آشتی کا پرستار ہونے کے باوجود اس کے ناموس و تحفظ کے لیے لڑ بھی سکتا ہوں اور اس کی آن پر مر بھی سکتا ہوں“ (141)

”اشاریت کا حسن بے پناہ ہے لیکن ابہام اور اشاریت میں امتیاز کرنے کی بصیرت نہایت ضروری ہے۔“ (142)

”فن کی نوعیت کو میں بہت اونچی یا بہت گہری یا بہت دھندلی فلسفیانہ موٹو گافیوں میں لپیٹنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا نقطہ نظر سیدھا، صاف اور واضح ہے۔ فن میرے نزدیک ایک معاشرتی فعل ہے۔ گہما میں بیٹھے ہوئے کسی پیراگی کی کراہ نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فن کو محض پند و نصائح کا ملغوبہ ہونا چاہئے۔ بنیادی طور پر فن اظہار حسن ہے۔ اظہار خیر اور اظہار صداقت ہے، رمز اس کا بے پناہ مؤثر ہتھیار ہے اور دلوں کی ظلمتوں میں خیر و برکت کے اور انقلاب و ارتقا کے چراغ جلانے کا جانا اس کا منصب ہے۔ اگر کوئی فن انسان اور زندگی کا اثبات نہیں کر سکتا تو وہ منفی فن ہے۔ یہ فن بھی خوبصورت ہو سکتا ہے۔ مگر بالکل اس طرح جسے سانپ خوبصورت ہوتا۔“ (143)

یہ تھیں ندیم کی آراء جب کہ میرے نزدیک:

”ندیم کا نظریہ شعران کے نظریہ نظام حیات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے وہ فن کو نہ صرف



زندگی کا بہترین نمائندہ قرار دیتے ہیں، بلکہ فن کی ذمہ داری یہ بتاتے ہیں کہ وہ زندگی کو سنوارنے، نکھارنے اور اسے تہذیب و شائستگی عطا کرنے کا باعث ہو“ (144)

یہ مسافت بھی تو فنکار کو طے کرنا ہے

کس کی محنت کا ثمر جا کے ٹپکتا ہے کہاں

جب کہ اپنے ایک مضمون میں ندیم وضاحت کرتے ہیں:

”صرف اتنا چاہتے ہیں کہ یہ مملکت ایسی ہو جس میں سہانے خواب حقیقت بن کر پنپ سکیں۔ جہاں کا ایک ایک فرد خود کفیل اور خوشحال ہو اور مادی اور روحانی استحصال سے محفوظ ہو، جہاں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو، کوئی بھوکا نہ ہو، کوئی بے روزگار نہ ہو۔ کوئی بیمار علاج سے اور کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ ہو۔ جہاں کوئی کسی کا حق نہ تھپیا سکے، جہاں نفرت کی بجائے محبت کا راج ہو، جہاں فرقہ پرستی کی بجائے بھائی چارے کی فضا ہو، جہاں منافقت نہ ہو، دشنام بازی اور بہتان طرازی نہ ہو، جہاں کشیدگی کی بجائے باہمی تعاون کا فرما ہو، جہاں بے مقصدیت کی بجائے وہ مثبت مقاصد پروان چڑھیں جن کا ایک واضح رخ اور ایک متعین جہت ہو اور جن کا سفر ارتقائی ہو، جہاں مادی اور قلبی اور روحانی سکون ہو اور جہاں تنقید برداشت کی جاتی ہو۔ جہاں زندگی کا ڈھرا ایسا ہو کہ سب انسان بہترین اخلاقی اصولوں کے مطابق زندہ رہیں اور یہ اصول ان لوگوں کے ایمان اور عقیدے اور مقدس قدروں اور بلند تہذیبی معیاروں کی برکت سے، ان کے اندر سے، ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے، ان کی نفسیات و عادات کا قدرتی حصہ بن کر، ان کی شخصیت میں رچ بس کر خود بخود بے ساختگی کے ساتھ، یوں پھوٹیں جیسے کہسار سے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ یعنی یہ سب کچھ ان پر بحکم عائد ہونے کی بجائے ان کے دلوں اور دماغوں میں اثر ہو اور یہ تعلیم سے ممکن ہے ہر بیت سے ممکن ہے، پاکیزہ اور ہر سکون ماحول سے ممکن ہے، چھٹوں کے سامنے بڑوں کے کا ایک مثال بن کر زندہ رہنے سے ممکن ہے اور صرف ایسی فضاء میں ممکن ہے جہاں ذاتی مفادات پر قومی اور مملکتی مفادات کو ہر صورت اور ہر حال صد فی صد فوقیت حاصل ہو۔“

(رسالہ ”نئی عبارت“ حیدرآباد۔ ندیم نمبر 1994۔ ص: 222)

## ندیم سخی و کامیابی:

شکست سے میرا خلاق اجنبی ہے ندیم  
سحر ملے نہ ملے، رات سے نہ ہاروں گا  
طوفاں ہے اگر گھر کے درپے یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو  
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

اکبر جمیدی اپنا مشاہدہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

”ندیم کی پوری زندگی، اُن کے ادبی کام، اُن کی شخصیت کی فتوحات اور مقبولیت پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ چھوٹے سے دور افتادہ گاؤں کے نچلے متوسط طبقے کے ایک فرد نے بغیر کسی پروموٹر کے محض اپنے بڑے ادبی کام اور نہایت درجہ پُرکشش شخصیت سے ایک دُنیا کو فتح کر ڈالا۔ کبھی ندیم صاحب تنہا تھے اور آج پورا عہد اُن کے ہم رکاب ہونے میں فخر محسوس کرتا ہے۔“ (145)

جمیل یوسف لکھتے ہیں:

”ندیم صاحب کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ مقدر کی جگہ قرطاس و قلم اٹھالائے اور انھی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ قرطاس و قلم سے اپنی وفاداری اس استواری سے نبھائی کہ انعام کے طور پر زندگی کے سارے ثمرات و اعزازات پائے۔“ (146)

ندیم کا ایک شعر:

اہل ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی  
اُس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

ڈاکٹر سید عبداللہ ندیم صاحب کے بارے میں اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

”ندیم کے کلام کو پڑھ کر عموماً میرے خیال میں اُس شاعر کی تصویر ابھرتی ہے، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں سپیاں چننے والا فکر مند، مگر متمسم جگنوؤں سے کھیلنے والا چاند تارے سے ہم کلام ہو کر اندھیروں کو بھگانے والا، سحر آفتاب اور دن کا جویندہ، ندیوں کے کنارے پھرنے والا مگر شہروں کی زندگی کے مسئلوں سے پھر بھی غافل نہیں۔“

صبح کو راہ دکھانے کے لیے  
دست گل میں ہے دیا شبنم کا  
شبنم کا چراغ ہاتھ میں لیے ہوئے یہ شخص شہر اور کوہسار میں گھوم جاتا ہے اور بام و در سے یہ آواز سنائی  
دیتی ہے:

دوستو اب قریب آ جاؤ  
آ کے دیکھو تو سہی  
ایک حالتے میں بھیجی آنکھوں کو  
لا کے دیکھو تو سہی  
شاید آواز پہ آواز آئے  
گا کے دیکھو تو سہی

غرض یہ سپیاں چننے والا ”گا کے دیکھو تو سہی“ کی دعوت دیتے ہوئے خود بھی گاتا ہے  
اور اپنے زمانے کو بھی اس عمل پر ابھارتا ہے۔“ (147)  
اس سلسلے میں اکبر جمیدی اپنے ایک اہم مضمون میں مزید لکھتے ہیں کہ:

”ندیم صاحب ان دو تین شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے دامن ترکیے  
بغیر ”قعر دریا“ کا سامنا کیا اور ساحل تک پہنچے۔ ندیم صاحب نے جہاں فکر و نظر کے  
اعتبار سے شاعری میں اور فکشن میں بڑا کام کیا، وہاں زندگی کی باریکیوں کو بھی سمجھا  
اور اس بے درد اندھی مشین کی لپیٹ میں آنے سے ہمیشہ خود کو بچائے رکھنے میں  
کامیاب رہے۔ اس میں ان کی سماجی ذہانت کو بھی دخل ہے اور ان کی عالی ظرفی کو  
بھی۔ اس میں بے حد تحمل، برداشت، جدوجہد کا جذبہ، روشن خیالی اور مثبت انداز فکر  
اور انتظار کرنے جیسی خوبیاں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

”ایک بات ندیم صاحب کی شخصیت میں بے حد اہم اور کارگر ہے۔ وہ ہے زندگی کے کار  
زار میں اپنی جنگ آپ لڑنا۔ دا شجاعت دینا، دوسروں کا انتظار نہ کرنا کہ وہ آئیں اور ان کی  
حفاظت کریں۔ یہ خوبی آج بھی ان میں بدیہ اتم موجود ہے کہ جب بھی کسی نے ان پر حملہ  
کیا، انہوں نے خود اس کی مدافعت کی اور نہایت باوقار انداز میں کی۔ اپنے منصب سے

”کبھی نیچے نہیں اترے۔ اپنی اخلاقیات کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔  
 ”مجموع ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری رہے تو مخالفین کی مخالفت کا دلیری سے  
 سامنا کیا۔ مقدمے بھی بھگتے، جیل بھی گئے، الزامات بھی برداشت کیے مگر اس مرکزی  
 عہدے کے فرائض پوری قوت اور دیانت داری سے ادا کیے۔ کوئی اہم اور مشکل ذمہ  
 داری قبول کرنے سے کبھی پہلو تہی نہیں کی تحریکوں میں شامل ہو کر حوادثِ روزگار کا سامنا  
 ندیم جیسے لوگ ہی کر سکتے تھے۔“ (148)

”میں ندیم قریہ سیم وزر سے بھی سرکشیدہ گزر گیا  
 جو مری انا کا غرور ہے، مری عمر بھی کی کمائی ہے  
 نہ میں طلسم کا ماہر، نہ مجتہد، نہ رسول  
 مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے

(ندیم)

### ندیم جرأت و حق گوئی:

”اتنی خاموش ہے شب لوگ ڈرے جاتے ہیں  
 اور میں سوچتا ہوں کس نے بلایا ہے مجھے

(ندیم)

ندیم کی جرأت مندی اور صداقت شعاری نے بھی اُن کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ عملی زندگی ہو یا فنی  
 زندگی، ندیم نے ہمیشہ بہادری کا ثبوت دیا اور نہ صرف حق کی حمایت کی بلکہ خود بھی سچائیاں  
 اپنائیں۔ بالخصوص اپنے کالموں میں بلا خوف و خطر اور بغیر کسی طرح کی مصلحت کے سچ ہی لکھا۔ یہ احمد  
 ندیم قاسمی ہی تھے جنہوں نے وزیراعظم، صدر مملکت اور دیگر اہم عہدے داروں سے ڈائریکٹ مخاطب ہو کر  
 سیدھے صاف انداز میں اپنی بات کہنے کا آغاز کیا اور آخری کالم تک اسی جرأت اور صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔  
 عطاء الحق قاسمی ندیم صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ندیم وہ بلند و بالا مینار ہے جہاں سے محبت کی اذان بلند ہوتی ہے اور دکھی دلوں میں  
 اُترتی جاتی ہے لیکن میں نے تو ندیم صاحب کو کئی مواقع پر محبت چھوڑ مروت سے بھی



دست بردار ہوتے دیکھا ہے مثلاً گزشتہ دنوں ادیبوں کا ایک وفد ”روس یا ترا“ کے لیے ترتیب دیا گیا۔ جس کے لیڈر قومی حلقوں میں خاصے متنازعہ ہیں۔ ندیم صاحب کو بھی اس وفد میں شمولیت کی دعوت دی گئی مگر ندیم صاحب نے انکار کر دیا، وجہ اس کی انہوں نے یہ بیان کی کہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے ان کے نظریات سے اختلاف ہے۔ چنانچہ وفد کے سربراہ کی حیثیت سے وہ روس میں جو کچھ کہیں گے، اگر میں وہاں اس کی تردید کرتا ہوں تو یہ ضوابط کی خلاف ورزی ہوگی اور اگر میں خاموش رہوں تو اپنے نظریات کے ساتھ غداری کروں گا۔ ندیم صاحب کی اس ”حرکت“ پر میں خاصا حیران ہوا تھا لیکن ندیم صاحب ایسی ترغیبات سے ایک دفعہ نہیں بے شمار دفعہ گزرے ایسے مواقع پر انہوں نے محبت سے لائقیتی کر کے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی ہیں۔“ (149)

وحید الحسن ہاشمی کہتے ہیں:

”(احمد ندیم قاسمی صاحب) گفتگو میں نرم گو، عمل میں پُر عزم تھے انہوں نے جیلیں کاٹیں مگر کوئی اُن کے ضمیر کی طاقت کو نہ زیر کر سکا، نہ خرید سکا۔“ (150)

اپنے ایک انٹرویو میں ندیم بتاتے ہیں کہ:

”میں نے ماہنامہ ”ہیرلڈ“ کو انٹرویو دیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ان جامروں کے حق میں لکھی ہوئی ایک سطر، میرا ایک لفظ ہی دکھا دیجیے، میں نے ضیا مالحق کے دور اقتدار ہی میں اس ماہنامے کو بتایا تھا کہ ضیا مالحق صاحب کا ریفرنڈم اعلیٰ پیمانے کے ایک فراڈ کے سوا کچھ نہ تھا اور جو نوے دنوں کے لیے آئے تھے انھیں نوے مہینوں سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ کیا کسی اور ”مہارتی پسند“ کو یہ کہنے کی توفیق ہوئی؟“ (151)

”میں 1953 سے 1959 تک روزنامہ ”امروز“ کا مدیر رہا۔ اس دوران میں ایوب خان نے حکومت سنبھالی اور مارشل لاء لگ گیا۔ مجھے محکمہ اطلاعات کی جانب سے ایک مضمون ملا۔ اس کا عنوان تھا ”کیا یہ مارشل لاء ہے؟“ مطلب یہ تھا کہ یہ تو نعمت خداوندی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں یہ مضمون نہیں چھاپ سکتا۔ اس پر مجھے اوپر سے پیغام ملا۔ ”ہم اپنے آدمی بھیج دیں؟“ میں نے کہا: ”جناب بھیج دیجیے۔“ چنانچہ ادھر ایک آدمی مضمون واپس لے کر گیا اور ادھر دوسرا آدمی میرے وارنٹ گرفتاری لے آیا اور

مجھے پکڑ کر اندر کر دیا گیا رہائی کے کچھ روز بعد میں نے دوبارہ ”امروز“ کی ادارت سنبھال لی۔ یہ مارچ 1959 کی بات ہے۔ جب صبح کو مجھے گھر پر ٹیلی فون ملا کہ پولیس اور فوج نے پروگریسو پیپر لیڈنڈ پر قبضہ کر لیا ہے میں نے وہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے کہہ دیا کہ ”میں یہاں پر کام نہیں کروں گا۔“ انھوں نے کہا: ”اس صورت میں آپ کو پکڑ لیا جائے گا۔“ میں نے کہا: ”جناب یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں جو آزادی سے اخبار کے ادارے لکھتا رہا ہوں اب پولیس والے آکر مجھے ڈکٹیشن دیں گے کہ یہ لکھو وہ نہ لکھو۔ یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔“ (152)

اہل قلم کانفرنسوں میں احمد ندیم قاسمی کے دو کلیدی خطبوں کو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں جابر آمر کے دور حکومت میں نہایت جرأت کے ساتھ حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ ندیم صاحب بتاتے ہیں کہ:

”1980 میں جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں مجھے کلیدی خطبہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ اس کا موضوع ”ادیب اور مملکت“ تھا۔ میں نے حق بات کے اعلان کے لیے یہ موقع غنیمت جانا۔ میرے کلیدی خطبے میں مارشل لاء حکومت کی غیر مشروط اور صد فی صد نفی کی گئی تھی۔ اس اجلاس کی صدارت مارشل لاء حکومت کے وزیر تعلیم نے کی تھی۔ میں خطبہ پڑھ رہا تھا تو اکادمی کے اُس وقت کے ڈائریکٹر صاحب نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ شخص حکومت کو کھری کھری سنا رہا ہے تو انہوں نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ اپنے خطبے کا خلاصہ پڑھیے۔ میں نے عرض کیا میرا خطبہ ہے ہی مختصر اور اس لیے آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ (153)

”پانچ برس بعد 1985 میں ایک اور اہل قلم کانفرنس اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ یاد رہے کہ وہ زمانہ بھی مارشل لاء ہی کا تھا۔ اس میں بھی مجھے کلیدی خطبہ پڑھنا تھا سو میں نے پڑھا مگر اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سا حادثہ ہو گیا۔ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے میرا یہ مختصر سا خطبہ اکادمی ادبیات کے اس وقت کے چیئرمین کی وساطت سے صدر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا چنانچہ انہوں نے غصے سے بھرا ہوا اپنا رد عمل اپنی افتتاحی تقریر میں ارشاد کر دیا اور ان اہل قلم کی ایسی تہمتیں کر دی جو ملکی حالات و واقعات پر کھل کر تنقید کرتے تھے چوں کہ میں نے اپنا خطبہ صدر صاحب کی تقریر کے بعد پڑھا تو

دوستوں نے یہ سمجھا کہ میں ان کی تقریر کا جواب دے رہا ہوں جب کہ وہ تو مجھے میرے خطبے کا نہایت ناگوار جواب پہلے ہی دے گئے تھے۔“ (154)

صرف فکری اور نظریاتی سطح پر ہی نہیں عام زندگی کے بارے میں بھی ندیم کے رویے جرأت مندانہ تھے۔ اکبر حمیدی درست کہتے ہیں کہ:

”ندیم صاحب نے بعض معاملات اپنے زمانے کی اخلاقی قدروں سے اتنے بلند اور مختلف اختیار کیے کہ لوگ انھیں تسلیم کرنے سے ہی منکر ہو گئے آج کے زمانے میں یہ باتیں ہماری اخلاقیات سے اتنی بالا ہیں کہ ہمیں یقین ہی نہیں آتا کہ کوئی شخص اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے“ (155)

ندیم کی شاعری بھی اظہار جرأت کا خوب صورت نمونہ ہے۔ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گی۔ ایک تو اُس غزل کا شعر جو اپنے وقت کے وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی کی صدارت میں (جب کہ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کی تھی) منعقدہ مشاعرے میں ندیم نے پڑھی:

میں نے بھیجا تجھے ایوانِ حکومت میں مگر  
اب تو برسوں ترا دیدار نہیں ہو سکتا  
اور دوسری مثال کے لیے ندیم کی بہت مشہور نظم ”پابندی“ ملاحظہ کیجیے:  
میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی  
راز کیوں کھولتی ہے  
اور میں پوچھتا ہوں تیری سیاست فن میں  
زہر کیوں کھولتی ہے  
میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا  
رات دن رولتی ہے  
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا  
اپنے پر تولتی ہے  
ایک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر  
بوند بھی بولتی ہے

اور بے حد مقبول نظم ”ایک درخواست“ جو اسی کتاب کے باب چہارم میں شامل ہے۔

### ندیم رجائیت:

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ:

”وہ عمر بھر زندگی کے محاذ پر حالت جنگ میں رہے اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ کبھی مایوس نہ ہوئے۔ اس معاملے میں وہ پکے رجائی تھے۔ قنوطیت انھیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔“ (156)

دراصل ندیم صاحب کلہیت، قنوطیت اور منفیت کے خلاف تھے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں اس کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

”..... کلہیت کی حیثیت منفی اور تخریبی ہے۔ کسی ادیب کے رویے میں کلہیت اس کی شخصیت میں کسی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ اس کی کمی کا کوئی وجود بھی ہو، جب ادیب اپنے متعلق کسی شبہ میں مبتلا ہو جائے تو پورے معاشرے اور قومی زندگی کے دوسرے شعبوں، حتیٰ کہ انسان اور انسانیت تک پر اسے شبہ ہونے لگتا ہے، شخصیت میں کمی پورے نظام زندگی میں کمی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ادیب اپنی اصلاح کرنے کے بجائے ساری دنیا سے انتقام لینے پر اتر آتا ہے۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو سطح ارض کی روئیدگی اور دھرتی کی قوتِ نمو کو گالیاں دیتا ہے، اس کی آنکھ میں مٹی کا ایک ذرہ پڑ جائے تو وہ عناصر کو ٹوم ڈالتا ہے۔“ (157)

الطاف حسین قریشی کا کہنا ہے کہ:

”ان کا سب سے بڑا وصف یہی تھا کہ وہ ہمیشہ پر اُمید رہے اور ان کی موجودگی میں نا اُمیدی کے تمام سائے تحلیل ہو جاتے تھے۔“ (158)

اور قیصر حمکین کے مطابق:

” (قاسمی صاحب ہمیشہ) لطافت اور توازن کا خیال رکھتے۔ ایسے حضرات تو تقریباً عنقا ہیں، جو ادب و فن کی خدمت کے ساتھ ہی دوسری گھریلو اور سماجی ذمہ داریاں بھی بحسن و خوبی نبھاسکیں۔ حال یہاں بھی قاسمی صاحب کا ایک انفرادیت سے مملو ہے پھر



قاسمی صاحب طرح طرح کی ترغیبات کے باوجود اپنے منصب و موقف پر استقلال و استحکام سے جے رہے۔“ (159)

جب کہ نفیہ حیات قاسمی یہ گواہی دیتی ہیں:

”احمد ندیم قاسمی صاحب سے میرا تعلق صرف شاعر اور مداح کا نہیں بلکہ مانا اور نواسی کا بھی ہے۔ قریبی تعلق کی وجہ سے میں نے دیکھا کہ ندیم کے فن اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ پھر اُن کے جس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا، وہ ان کے پُر امید رہنے اور مثبت سوچ اپنائے رہنے کی عادت اور صلاحیت ہے اور اس کا شاندار اظہار اُن کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

”سچ تو یہ ہے کہ میں نے امید اور جستجو کے اصل معنی احمد ندیم قاسمی کی حیات اور اُن کے فن سے سمجھے اور دیکھے ہیں۔ زندگی کے ان گنت کٹھن مرحلے اُنہوں نے جس وقار اور حوصلے سے طے کیے ہیں وہ میرے لیے ایک بہترین مثال اور قابلِ قد رسبق ہیں اُن کا اور اب میرا بھی یہ ماننا ہے کہ امید مثبت سوچ ہے اور اس کے نتیجے میں جستجو مثبت عمل ہے۔ مثبت سوچ کا نتیجہ منفی نہیں ہو سکتا۔ البتہ کبھی مشکلات درپیش ہوئیں تو امید کا سہارا ہوگا۔ اگر اچھا دور ختم ہو سکتا ہے تو بُرا دور بھی تو فانی ہے۔ اس لیے اُمید اور جستجو کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے تاکہ اچھا دور جلد سے جلد آ سکے۔“ (160)

بقول ندیم:

ۛ امکان پہ اس قدر یقین ہے  
صحراؤں میں بیج ڈال آؤں  
ۛ میں بھی عجب مٹی سے بنا ہوں، ریت کو ریشم تک کہہ دوں  
ۛ ممکن کی سوچ میں بھی امکان کا در وار کھتا ہوں

**ندیم وطنیت:**

یہ جو احمد ندیم قاسمی کو ”شاعرِ انسانیت“ کے ساتھ ساتھ ”شاعرِ پاکستان“ اور ”شاعرِ وطن“ بھی کہا جاتا ہے تو یہ درست ہے کیوں کہ ندیم کی تمام تحریریں اور تخلیقات، شاعری افسانہ مضامین اور کالم اُن کی انسان

دوستی کے ساتھ ساتھ اُن کی انتہائی پُر خلوص حب الوطنی کا بھی متاثر کن اظہار ہیں۔ ندیم کی نمایاں ترین صفت وہ سچی تڑپ ہے جو دل سے ابھر کر دلوں میں اُتر جاتی ہے اور جو وطن کی بات کرتے وقت اپنی تاثیر کی شدتوں پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ اُنہوں نے بتا رکھا ہے کہ:

”اپنے نقطہ نظر کی عالمگیریت کے باوجود مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں کیوں کہ مجھے اس مٹی نے پیدا کیا اور انھی ہواؤں نے پالا ہے۔ پھر میں جس حُسن و توازن کا پیاری ہوں اس کا تصور مجھے یہیں سے ملا ہے۔ اس لیے مجھ پر اس سر زمین کے خاص حقوق ہیں اور میں امن و آشتی کا پرستار ہونے کے باوجود اس کے ناموس اور تحفظ کے لیے لڑ بھی سکتا ہوں اور اس کی آن پر مر بھی سکتا ہوں۔ حد سے بڑھی ہوئی عالمگیریت والے مجھ پر تنگ خیالی کا الزام بھی دھر سکتے ہیں مگر میں اس ماں کو کیسے بھولوں جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے قدموں میں میری جنت ہے۔“ 161

ماہید قاسمی نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے:

میرے شاعر، میرے ندیم!

جشنِ آزادی کی شب کو

تیری کتاب کا دیا اُٹھائے

میں ماضی کی دھندلی وادی میں جا اُتری

اور پھر چونک اُٹھی

(آج سے پہلے یہ سب میں نے اتنا نمایاں کیوں نہیں دیکھا!)

ہر ایک مصرع میرے وطن پر بیٹے لحوں کا سچا اظہار لیے تھا۔“

(نظم ”دشت وفا کی پکار“) (162)

اگر ثبوت کے لیے صرف اُن کی شاعری ہی کا جائزہ لیں تو 1931 سے 2006 تک شاعری میں (افسانوں، کالموں اور مضامین کے علاوہ) مثالوں کا طویل سلسلہ ہے۔ اس میں سے صرف یہ نظمیں: ”درد وطن“، ”غم وطن“، ”میں روتا ہوں اے ارض“، ”کارواں بہاروں کا“، ”اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ“ اور ”وطن کے لیے ایک دُعا“ ہی پڑھے۔ خاص طور پر آخر الذکر نظم آپ کو ندیم کے خلوص، لگن اور تڑپ کی واضح پہچان کروائے گی:

خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے  
وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو  
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں  
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو  
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوج کمال  
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو  
خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے  
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

ڈاکٹر جمیل جالبی ندیم کے پر خلوص و باشعور جذبہ حب الوطنی کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ:  
”جس جرأت، حوصلہ مندی اور بے باکی سے احمد ندیم قاسمی نے 6 ستمبر 1965 کی  
جنگ کے بارے میں مضامین لکھے، کسی اور ادیب اور دانش ور کے قلم سے نہیں نکلے اور  
یہ فی الحقیقت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس وقت اکثر ادیب و دانش ور متذبذب اور  
عدم فیصلہ کا شکار تھے لیکن قاسمی صاحب ہی کی وہ آواز تھی جس نے سب کو متذبذب کے  
دلدل سے نکال کر پاکستانی ہونا سکھایا تھا۔ یہ مضامین ان کی کتاب ”تہذیب و فن“ میں  
آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس مسئلے پر  
ان کا ذہن کس قدر صاف و شفاف ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی تھی کہ ترقی  
پسندی اور محب وطن پاکستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔“ (163)

فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ:

”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ندیم خود پاکستان ہو اُس کی بقا و خوشحالی و آزادی و خود مختاری  
ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام ہی کا دوسرا نام ہو۔ جیسے ندیم خود پاکستان ہو  
اور اس کے اندر اپنی بنیادوں کو پگھلنے سے بچانے کی جنگ برپا ہو۔“ (164)

الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں:

”جناب احمد ندیم قاسمی اپنی ذہنی ساخت اور نفسیات کے مطابق ایک باغی انسان تھے  
انھیں ہر طرح کے جبر و استحصال سے شدید نفرت اور اس سے ٹکرا جانے کی ایک

زبردست قوتِ ارادی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور معاشرے کی تعمیر، عدل و مساوات کے اصولوں پر کرنا چاہتے تھے۔ یہی جذبہ انھیں ترقی پسند مصنفین کے حلقے میں لے آیا تھا۔۔۔۔۔“

”پیشتر اشتراکی ادیبوں اور شاعروں کے مزاج سے ہٹ کر جناب احمد ندیم قاسمی نے وطن کی محبت کے نغمے الاپے ہیں اور اپنی سر زمین کو وطنِ پاک سے موسوم کر کے (”وطنِ پاک کی عظمت کے سہارے ہو تم) وہ اپنے اہل وطن کے لیے ایک ایسی فصلِ گل کے لیے دُعا مانگتے ہیں جسے اندیشہ زوال نہ ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی پاکستان کے خلاف نجی محفلوں میں بھی کوئی بات سننے کی تاب نہیں لاتے تھے۔ معاشرتی ناہمواریوں کے بارے میں ان کا قلم تنقید کی مانند چلتا تھا لیکن ریاست کا وجود اور اس کا استحکام انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔“ (165)

پشاور سے محسن احسان بتاتے ہیں کہ:

”14۔ اگست کی رات بارہ بجے ریڈیو سے اعلان ہوا، ”یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس، پشاور ہے۔ اب آپ جشنِ آزادی کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا لکھا ہوا ترانہ سنیں گے“ پاکستان بنانے والے، پاکستان مبارک ہو، یہ ہے وہ پہلا قومی نغمہ جو اس رات نشر ہوا۔“ (166)

اس رات ندیم کے تین نغمے نشر ہوئے جنھیں سجاد سورو نیازی نے اپنی موسیقی اور اپنی آواز میں پیش کیا۔ عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا ہے:

”پاکستان اور اس کی عوام سے باندھے ہوئے عہدِ وفا پر وہ آخری سانس تک قائم رہے انھیں بائیں بازو کے ان عناصر سے ہمیشہ شکایت رہی جو پاکستان کی بنیادوں میں سے کیڑے نکالتے تھے یا اسلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی طرح دائیں بازو کے ان لوگوں کے ساتھ ان کی کبھی نہ بنی جو جاگیر داری، سرمایہ داری اور دوسرے ظالم طبقوں کو اسلام کے نام پر تحفظ دیتے رہے ہیں۔“ (167)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے کہا کہ:

”پاکستان اور پاکستان سے باہر وہ پاکستانی ادب کا ایک بہت بڑا حوالہ تھے۔“ (168)



ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے تحریر کیا ہے کہ:

”احمد ندیم قاسمی کے شعر میں تاثیر کا جادو اس لیے جاگا کہ اس کے اندر دردِ انسانیت جاگ رہا تھا۔ اس میں اپنی دھرتی کی مٹی کی بو باس تھی۔ اس میں غربائے وطن کے پسینوں کی مہک تھی۔ قاسمی صاحب نے کل عالم کے انسانوں کے لیے لکھا، مگر سب سے زیادہ اپنی دھرتی کے بایسویں کا درد اپنی رگ و پے میں محسوس کیا قاسمی صاحب کو اپنی پاکستانیت پر ناز ہے۔ ان کی انسان دوستی میں وطن دوستی کی منہاس گندھی ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب میکرو لیول کی سوچ رکھتے ہیں۔“ (169)

جب کہ لاہور سے ہارون الرشید نے اپنے کالم میں لکھا کہ:

”انہوں نے اس مظلوم قوم کے مجروح وطن کے ساتھ عمر بھر محنت کی اور کبھی اس کے بد باطن دشمنوں کے دریوزہ گر نہ ہوئے وہ سویت یونین، امریکہ اور بھارت کی دہلیز پر کبھی سجدہ ریز نہ ہوئے۔ سجدہ ریز کیا مرعوب تک نہیں ہوئے۔ احمد ندیم قاسمی ایک سچے پاکستانی تھے، تحریک پاکستان کے ایک کارکن..... ملک دشمنوں کے رفیق وہ کیسے ہوتے۔“ (170)

مقصود الہی شیخ لکھتے ہیں:

”احمد ندیم قاسمی کی دانش اور ان کے افکار ہمیشہ رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ سچے محب وطن تھے، پاکستانی اعزازات ان کے لیے سچا اعزاز تھا۔ وہ اس لیے پوری اُردو دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔“ (171)

### ندیم اور تحریک پاکستان:

احمد ندیم قاسمی نے تحریک پاکستان میں عملی حصہ بھی لیا۔ اس کی کچھ تفصیل ندیم کے برادرِ بزرگ یوں بتاتے ہیں کہ:

”قائد اعظم کی رہنمائی میں تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ شاہ (ندیم) جس نے انسان دوستی، اسلام دوستی کے رستے حاصل کی تھی۔ اس تحریک کے نظریات سے متفق تھا۔ اسے اختلاف تھا تو یہ کہ اس کی صوبائی قیادت صدیقی صدامراء کے ہاتھ میں تھی مگر وہ

ایک بڑے مقصد کے لیے اس اختلاف کو پی جانے پر تیار ہو گیا۔ مسلم لیگ کا سبز جھنڈا کاندھے پر رکھا اور اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا جلوس لیے علاقہ سون سکیر کے گاؤں گاؤں میں گھومنے لگا اور یوں وہ ضلع سرگودھا کے اس کوہستانی علاقے میں ایک ”خطرناک“ مہم کا لیڈر بن گیا۔ ”خطرناک“ اس لیے کہ اس وقت یونیسٹ وزارت برسر اقتدار تھی اور یہ علاقہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات خان کا حلقہ انتخاب تھا۔ یونیسٹ وزارت اس بات پر ٹل گئی تھی کہ چاہے کتنے ہی بے گناہوں کو جیل میں ٹھونس دینا پڑے وہ یونیسٹ امیدواروں (جو انگریز نواز بااثر جاگیردار تھے) کے مقابلے میں کسی مسلم لیگ کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ ہمارا علاقہ تو ویسے ہی پسماندہ اور راضی برضا قسم کا علاقہ تھا۔ یہاں تو پولیس والے ہر اس شخص کو حوالات میں بند کرنے پر تیار رہتے تھے، جو مسلم لیگ، قائد اعظم اور پاکستان کا نام بھی لیتا تھا۔ لیکن شاہ کوہنو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی ہر طرف سے اٹھتی ہوئی جھٹکا خوف زدہ کر سکی اور نہ اپنے خاندان کے بزرگوں کی شدید ناراضگی اس کے قدموں کو جکڑ سکی۔ وہ بے دھڑک اس میدان میں کودا۔ اب اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اس دوران اس نے نہ صرف جلوس نکالے اور جلسے کیے بلکہ ان گنت نظمیں لکھیں اور ترانے کہے اور اپنے علاقے کی بولی کی بولی میں ٹپے تصنیف کیے۔ لوگ گیت کی غیر فانی صنف ”ماہیا“ تک کو اس نے تحریک پاکستان کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔ حد یہ ہے کہ ان دنوں ہمارے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر عشقیہ گیتوں کی بجائے شاہ کے یہی ٹپے اور ماہیے گائے جانے لگے۔ وہ بچپن میں گانے والی لڑکیوں میں گھس کے بیٹھ جاتا تھا اور انھیں گیتوں کے نئے نئے بولوں (”کلیوں“) کے لقمے دیتا تھا، آج اپنے فن کو قیام پاکستان اور آزادی وطن کے لیے موثر طور پر استعمال کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے لاہور کے اخباروں کو اس علاقے کی سرگرمیوں سے باقاعدہ طور پر آگاہ رکھنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ یوں سمجھیں کہ یہ اس کی صحافت کا آغاز تھا۔ (172)

اجمل دانش لکھتے ہیں:

”جناب احمد تم قاسمی جس طرح نثر و شعر میں یکتا تھے اسی طرح نہایت بے بدل اور

جرات مند صحافی بھی تھے اور عملی سیاسی کارکن بھی۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی محدود عرصے تک انھوں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ قیام پاکستان سے قبل وہ اپنے آبائی علاقے سے مسلم لیگی امیدوار کو جتوانے کے لیے جدوجہد بڑے اعلیٰ انداز میں فرمایا کرتے تھے۔ مد مقابل امیدوار با اثر انگریز نواز جاگیردار تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب انھوں نے قائد اعظم کی جیب کے کھوٹے سٹکوں کی جھونکا رسی تو عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی زبان اور قلم کو ذریعہ اظہار بنا کر مختلف موقر جراند میں کالم نگاری کے ذریعے ملک کے بالادست طبقوں کے (ظلم و استحصال) کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔“ (173)

فکرتونسوی نے لکھا تھا کہ:

”اپنے گاؤں انگہ میں عوامی تحریک کی سال بھر تک تنظیم کرتا رہا اور رجعت پسند طبقہ کے خلاف ایک طوفانِ عظیم کھڑا کیے رکھا..... اس کے ضلع سرگودھا کے دیہاتی عوام خضر حیات نوانہ اور احمد ندیم قاسمی کے سوا شاید کسی اور کو نہیں جانتے تھے۔ وہاں کے لوگ احمد ندیم قاسمی کی نظمیں، مجلسوں اور محفلوں میں گا کر پڑھتے ہیں اور اس بات پر جھوم جھوم جاتے ہیں کہ یہ گیت اُن کے احمد شاہ (ندیم) نے لکھے ہیں۔“ (174)

### ندیم ترقی پسندی:

باشعور، حساس، سچے اور مستقل مزاج احمد ندیم قاسمی ترقی پسندی سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

”1934-35 میں امیر گھرانوں کے چند نو جوانوں نے، جو انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انگریز کے استعمار، جرمنی اور اٹلی کے فاشرزم، خود اپنے وطن میں ملائیت کی گرفت کی اور بڑے بڑے زمین داروں، وڈیروں، خانوں، پیروں، حمن داروں کے ہاتھوں کروڑوں عوام کے اندھا دھند استحصال کے خلاف ثقافتی محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1936 میں اسی جذبے کے تحت پروگریسو رائٹرائسوی ایشن (انجمن ترقی پسند مصنفین) کا قیام عمل میں آیا، جس کے ہمدردوں میں ٹیگور، ٹنٹی پریم چند اور مولوی

عبدالحق کی سی شخصیات بھی شامل تھیں مگر اس سے بہت پہلے ہی سے غیر ملکی استعمار کی غلامی اور انسان کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال سے شدید نفرت کرنے لگا تھا۔ انجمن کے کارکن بننے سے پہلے میں نے اپنے مجموعہ کلام ”جلال و جمال“ کا جو طویل دیباچہ لکھا ہے، (1946 میں) وہ اس حقیقت کی شہادت دے گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بڑے زمین داروں کے مظالم، ملائیت کی گرفت، بیروں فقیروں کی زیادتیوں اور انگریزی حاکمیت کی سفاکی کے مناظر دیکھے تھے، اس لیے میں مروجہ صورت حال سے انتہائی حد تک متنفر تھا۔ یہی میری ترقی پسندی تھی۔“

یہ پوچھنے پر کہ ”اکثر احباب آپ کے بارے میں تذبذب اور گولگی کی کیفیت سے دوچار ہیں کہ آپ بیک وقت کٹر مذہبی اور یکے ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟“ ندیم صاحب نے جواب دیا: ”میں کٹر مذہبی تو کسی صورت نہیں ہوں۔ میں تو بڑا فراخ دل مسلمان ہوں اور ہر اس نیک آدمی کو دل سے لگانے کو تیار ہوں جو چاہے کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو مگر عملاً نیک ہو۔“ ”پکا ترقی پسند“ یقیناً ہوں۔ میرا مذہب میری ترقی پسندی میں کسی طرف سے مزاحمت نہیں ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں خود اسلام بے حد ترقی پسند مذہب ہے، جس نے گورے کالے، عربی، عجمی، امیر غریب اور بڑے چھوٹے کی تفریق ہی سرے سے ختم کر ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کا مسلمان بیشتر محض برائے نام مسلمان ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

یوں مسلمان تو بہت ہیں، مگر اب تک نہ سنا  
اک مسلمان سے بھی، اک پیرو اسلام کا نام

ایک اور شعر ہے:

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اٹھتا ہوں  
بس یہ خامی ہے میرے طرزِ مسلمانی میں

اس صورت میں میری مذہبیت اور میری ترقی پسندی کے ضمن میں احباب کا تذبذب اور گولگی میں مبتلا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ترقی پسندی کے لیے کافری ضروری ہے؟ کیا ترقی پسند کہلوانے کے لیے کمیونسٹ ہونا ضروری ہے؟ یقیناً نہیں، پھر یہ تذبذب چہ



معنی دار۔“ (175)

عبداللہ جاوید نے ندیم کی ترقی پسندی کے بارے میں کہا ہے کہ:

”وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے اس کے آغاز سے ہی منسلک رہے۔ جب اس پر (حکومت کی طرف سے) پابندی لگی تو وہ ہی اس کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ہی اس کا آخری منشور بھی جاری کیا۔ اس منشور کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ حکومت وقت کو کسی طرح قدرے نرم موقف دکھا کر انجمن پہ پابندی کے انتہائی اقدام سے باز رکھا جائے لیکن حکومت وقت کو اوپر سے یا باہر سے اشارے مل چکے تھے۔

چنانچہ ایک رات اچانک چھاپہ پڑا اور ملک بھر میں انجمن کے دفاتر سر بہرہ کر دیے گئے اور عامل قلم کاروں کو جیل کی سلاخوں کے عقب میں کر دیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی بھی گرفتار کر لیے گئے۔“ (176)

اکبر حمیدی لکھتے ہیں کہ:

”انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری رہے تو مخالفین کی مخالفت کا دلیری سے سامنا کیا۔ مقدمے بھی بھگتے، جیل بھی گئے، الزامات بھی برداشت کیے مگر اس مرکزی عہدے کے فرائض پوری قوت اور دیانت داری سے ادا کیے، کوئی اہم اور مشکل ذمہ داری قبول کرنے سے کبھی پہلو جھکی نہیں کی۔“ (177)

پروفیسر فتح محمد ملک سمجھتے ہیں کہ:

”ترقی پسند شاعروں کے لیے تنقیدی ہدایت نامے مرتب کرنے والے آزادی کے تقاضوں کا صحیح شعور حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے طلوع آزادی کے فوراً بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ بہت بعد تک جسے آوازِ رحیل کا رواں سمجھا جاتا رہا وہ صرف ایک درماندہ رہبر و..... احمد ندیم قاسمی کی صدائے دردناک تھی۔“ (178)

صلاح الدین حیدر نے کہا کہ:

”نفقوی احمد پوری کی رائے ہے کہ وہ (ندیم) صرف انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل یا روح رواں نہ تھے بلکہ ترقی پسند ادب کے چراغ کو وحشی جھونکوں سے بچانے کے لیے خود کو ڈھال بنائے ہوئے تھے۔“ (179)

میرٹھ (بھارت) سے پروفیسر خالد حسین خان نے تحریر کیا ہے کہ:

”ترقی پسند تحریک کو ایام طفولیت سے نکال کر عالم بلوغیت سے ہم کنار اور ہم دوش کرنے میں احمد ندیم قاسمی نے میر کا رواں کا فریضہ بھی ادا کیا، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس تحریک کو نیا خون، نیا جوش اور نیا ولولہ بھی بخشا، احمد ندیم قاسمی جیسا ادیب و شاعر، صحافی و مدیر، مربی و مرشد اس صفحہ گیتی میں کبھی کبھی ہی نمودار ہوتا ہے، ان جیسے فن کاروں کے لیے صحیح ہے کہ:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وور پیدا“ (180)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے کہنے کے مطابق:

”قاسمی صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل تھے اور یہ اس نہایت اہم

ادبی تحریک کے آفیشل فورم کا سب سے بڑا عہدہ تھا۔“ (181)

ندیم ترقی پسندی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد سمجھتے ہیں کہ:

”انھوں نے ایک مقصد حیات کو سامنے رکھ کر شاعری کی اور زندگی کے حقائق کو شعروں

کا جامہ پہنایا۔ وہ انسان کی عظمت کے قیام، طبقاتی ناہمواری اور سامراجی تشدد کے

خلاف زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ عالمی امن کا قیام ان کا خواب تھا۔ اس خواب کی تعبیر

تلاش کرنے میں انھوں نے تمام عمر بسر کر دی۔“ (182)

مسعودا شعر واضح کرتے ہیں:

”ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ قاسمی صاحب کا جو تعلق تھا، وہ ہم سب

جانتے ہیں۔ بھیڑی کانفرنس کے بعد ترقی پسندوں میں جو انتہا پسندی آگئی تھی۔ قاسمی

صاحب کا یہ مزاج ہی نہیں تھا کہ وہ عرصہ اس (انتہا پسندی) کے ساتھ چلے۔ اُس وقت

اس تحریک میں واضح طور پر سیاست شامل ہو گئی تھی وہ بھی سویت یونین والی سیاست،

قاسمی صاحب اس کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے، بعد میں ایفروائیشن رائٹرز کی انجمن کے

سلسلے میں بھی ان کا اختلاف ہوا۔ اس انجمن کے دو حصے بن گئے تھے۔ ایک سویت

یونین کی ہم نوا تھی اور دوسری چین کی۔ فیض صاحب سویت یونین کی حامی انجمن کے

ساتھ تھے اور قاسمی صاحب چین کی حامی انجمن کے ساتھ بلکہ قاسمی صاحب اپنی اس

انجمن کے سیکرٹری تھے۔ دراصل قاسمی صاحب 1965 کی جنگ کے بعد سوویت یونین سے سخت ناراض تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی اس کا ساتھ نہیں دینا چاہتے تھے۔“ (183)

جب کہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی رائے میں  
 ”قاسمی صاحب نے جس زمانے میں ترقی پسند تحریک میں فعال کردار ادا کیا، ترقی پسندی اور مذہب بے زاری لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھی مگر قاسمی صاحب نقو اپنی مذہبی اور مشرقی اقدار سے دست بردار ہوئے اور نہ ترقی پسند دانش ور کہلانے کی دھن میں ساغر و مینا کا سہارا لیا۔“ (184)

نئی دہلی سے خلیق انجم لکھتے ہیں:  
 ”احمد ندیم قاسمی صاحب کو اپنے ترقی پسند ہونے کی قیمت چکانا پڑی تھی۔ 1951 میں اور 1958 میں حکومت نے انھیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے مبینوں نظر بند کیے رکھا۔“ (185)

کینیڈا کے سید عظیم کے بقول:  
 ”ہمارے گریز کے جواب میں جناب عبداللہ کہنے لگے۔ کیا آپ قاسمی صاحب کو ترقی پسند نہیں سمجھتے؟ ان کی کوئی ایسی تحریر لے آؤ، جس سے وہ ترقی پسند معلوم نہ ہوتے ہوں۔“ (186)

اور احمد ندیم قاسمی نے 1989 کے ایک انٹرویو میں اس سوال پر کہ ”چرچا کیا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کو آپ بھی OWN کرتے ہیں کبھی DIS OWN، آپ بتائیں کہ ترقی پسند تحریک سے آپ کی وابستگی کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟“ ندیم صاحب نے یہ مفصل جواب دیا:

”ترقی پسند تحریک ابتدا میں ایک مثبت تحریک تھی، پھر اس میں سیاست گھس آئی اور میں نے اس کا مقابلہ کرنے کی بڑی کوشش کی۔ نومبر 1949 میں ترقی پسند مصنفین تحریک کا، اپنی مرضی کے برعکس سیکرٹری جنرل منتخب ہوا۔ میں نے کہا، فیض احمد فیض ایسی معروف شخصیات موجود ہیں، وہ اسے کیوں نہیں سنبھالتے؟ لیکن کہا گیا کہ انھیں دوسرے کام تھے اور وہ دوسرے کام میری سمجھ میں آج تک نہیں آئے۔ میں سیکرٹری

جنرل بنا تو پہلی ہی کانفرنس میں کچھ ادیبوں کے بائیکاٹ کا ریزولوشن پیش ہوا۔ میں، امراہیم جلیس اور کئی دوستوں نے اس قرارداد کی مخالفت کی لیکن سیاسی حضرات کے غلبے کی وجہ سے قرارداد کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ ادیبوں کے بائیکاٹ نے ترقی پسند تحریک کا امیج تباہ کر دیا۔ ہم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ میں نے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ہر شاخ سے قرارداد کے حوالے سے رائے لی۔ کسی نے اس قرارداد کو پسند نہ کیا۔ ہم نے اسے واپس لے لیا، لیکن نقصان ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں راولپنڈی سازش کیس ہوا، جس میں فیض احمد فیض بھی ملوث بتائے جاتے ہیں۔ حکومت نے حفظہ ما تقدم کے طور پر ہمیں بھی گرفتار کر لیا کہ ہم شور نہ مچائیں۔ ہم رہا ہوئے تو ترقی پسند تحریک کو سیاسی ادارہ قرار دے دیا گیا۔ کوئی سرکاری ملازم اس کا رکن نہیں بن سکتا تھا۔ بہت سے سرکاری ملازم الگ ہو گئے تو ہماری تعداد مزید مختصر ہو گئی اور ان میں بھی زیادہ تر خوف زدہ تھے، پھر محسوس ہوا کہ یہ قصہ تو ختم ہو گیا ہے اور شرقی اور مغربی پاکستان میں تحریک تنظیمی اعتبار سے فعال نہیں تو میں نے 1954 میں کہا کہ کیوں کہ تحریک عملی طور پر سرگرم نہیں اس لیے سیکرٹری جنرل شپ سے مستعفی ہونا ہوں، لیکن میں ترقی پسند ہوں۔ اور کوئی شخص آگے بڑھ کر اسے سنبھال لے تو میں ایک رضا کار کی حیثیت سے پہلے کی طرح اس کا ساتھ دوں گا۔“

”ترقی پسند تحریک کی معاشی ناہمواری کے خلاف جدوجہد سے میں بہت متاثر ہوا اور اس سے میرے مذہبی عقائد پر کوئی زد بھی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اس کی رکنیت قبول کی، اس کے عہدوں پر فائز رہا اور میں آج بھی کہتا ہوں کہ میں ترقی پسند ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ سیاسی ترقی پسند نہیں، میں کمیونسٹ کبھی نہیں رہا اور اس کی وجہ میرے ارد گرد پھیلا ہوا مذہبی ماحول تھا۔ میں نے با شعور ہو کر مسائل پر غور و فکر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خدا کی ذات سے انکار کر کے انسان اپنے آپ کو دھوکا ہی دے سکتا ہے۔ ذات خداوندی کو خارج کر کے کائنات میں انتشار ہی باقی رہ جاتا ہے۔“ میں خدا کا منکر نہیں ہوں اور رسول کریم کو خالم النبین مانتا ہوں۔“ جب میں اپنے اشتراکی دوستوں سے یہ کہتا ہوں تو وہ گھبراجاتے ہیں کہ یہ شخص کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔“



”(کیونست تو کیا) میں کہتا ہوں، اگر ترقی پسند تحریک کا منشور کوئی ہندو اور سکھ بھی پیش کرتا تو میں اس کے ساتھ چلتا۔ ایک غیر مسلم بھی خیر کی بات کہے تو میں اس کا مرید ہو جاتا ہوں اور اس سے میرے مذہبی عقائد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن جب ہمارے ترقی پسند دوست حد سے بڑھنے لگے تو پھر میں نے انھیں روکا، اسی لیے میں آج بھی ان کی نظر میں معتبوب و مردود ہوں..... کیوں کہ میں کیونست نہیں۔ میں ترقی پسند تحریک میں خدا کے وجود سے انکار کی مسلسل مزاحمت کرتا رہا، لیکن ترقی پسند تحریک کے پروگرام سے مجھے کامل اتفاق ہے۔“ (187)

### عہدِ عوام نمائندگی:

احمد عظیم قاسمی اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں لکھتے ہیں:

”میرے باطن میں ایک معصوم بچہ چھپا بیٹھا ہے اور میرے باہر کے بوڑھے کو دیکھ کر کبھی کبھی حیران بھی ہوتا ہے کہ جب باہر کا یہ عالم ہے تو میں اندر بیٹھا کیا کر رہا ہوں مگر وہ موجود ہے۔ وہ بچہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو لیتا ہے۔ جو روتا بھی ضرور ہے مگر اس کے رونے کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے اور وہ آنسوؤں میں مسکرانے لگتا ہے۔ وہ بچہ جو سوچتا ہے کہ سب انسان آپس میں دوست کیوں نہیں ہیں؟ اور دشمنی کے لیے کیا درندے کافی نہیں تھے؟ وہ بچہ جو محض حیران نہیں ہوتا بلکہ اس کرید میں لگ جاتا ہے کہ اسے حیرت کیوں ہوئی ہے؟ جو انسانوں اور انسانی رشتوں، پھولوں اور کونپلوں، بادلوں اور درختوں، آسمانوں اور خلاؤں یعنی حسن کے تمام مناظر سے آج بھی بہت شدت سے متاثر ہوتا ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ جب تک میرے باطن میں بیٹھا یہ بچہ زندہ ہے، چاہے میرے چہرے کی جھریاں لٹک آئیں اور چاہے میرے ہاتھ پاؤں میں ریشہ پیدا ہو جائے، میں تخلیقی لحاظ سے کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔“

”میری زندگی اس لحاظ سے بہت بھرپور ہے کہ نشیب و فراز سے پر ہے اور اس لیے واقعات و حادثات کے علاوہ مشاہدات و احساسات کا ایک انبار ہے مگر شاید ہمارے معاشرے میں افراد کی اکثریت کے سواغ ایسے ہی ہوتے ہیں اور میرا تعلق ملک کے

ان افراد سے ہے جو اکثریت میں ہوتے ہیں اور عوام کہلاتے ہیں۔“ (188)

بے شک ندیم صاحب نے کہا تھا کہ:

”جب تک عوام میں تعلیم عام نہیں ہوگی اور عوام ہماری تحریر نہیں پڑھیں گے، ہم ان کی

سوچ پر کیسا اثر انداز ہوں گے۔“ (189)

لیکن عوام کے دکھ سکھ کی نمائندگی کرنے کا وعدہ وہ ہمیشہ نبھاتے رہے۔

”جس طرح عوام کے جذبات کی نمائندگی میں نے کی ہے۔ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس

جیسی نمائندگی کسی اور نے کی ہی نہیں۔ آپ میرے افسانے اور نظمیں پڑھ کر دیکھ لیجیے،

آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا..... (میری اگر کہیں مخالفت ہوئی ہے تو) اُس کی وجہ

صرف یہ ہے کہ میں عوام الناس کے جذبات، احساسات، مسائل اور ان کی امنگوں کا

ترجمان ہوں۔ میں نے اپنی نظموں، غزلوں، افسانوں اور کالموں میں ہر جگہ عوام کی

نمائندگی کی ہے۔“ (190)

اور مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

”احمد ندیم قاسمی نے عوام سے اپنا رشتہ بنائے رکھا، البتہ صاحبانِ اقتدار سے ہمیشہ ایک

شریفانہ دوری برقرار رکھی..... انھوں نے اپنے فن کے ذریعے اپنے زمانہ کے لب و

لہجے کو برقرار رکھا۔“ (191)

واقعی ندیم نے سبھی انسانوں کو مد نظر رکھا ہے لیکن خواص کے لیے مخصوص ہو جانے کی بجائے ان کی

ترجیح ہمیشہ عوام کی نمائندگی کرنا رہا، وہ کہتے ہیں:

یہی میرا ادب ہے اور یہی میری سیاست

مرے جمہور ہی سے میری فن کاری عبارت ہے

(ندیم)

## ندیم ادبیت:

یہاں ہم ندیم ادبی خصوصیت کی صرف جھلک دیکھیں گے۔ تفصیل اگلے باب میں ہوگی۔ ندیم کی

شاعری، افسانہ، کالم نگاری اور تنقید پر چند مختصر مگر نہایت اہم آراء ملاحظہ کیجیے۔

☆ جوش ملیح آبادی:

”سچ بولنا ہمیشہ خطرناک رہا ہے، لیکن میں، ہزاروں بار مجروح ہونے کے بعد بھی، سچ بولنے کی ”خوئے بد“ سے باز نہیں آیا اور اس بنا پر یہ لکھ رہا ہوں کہ اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں، احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے بہ مراحل بہتر سمجھتا ہوں، میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اور مجھے اس سے محبت بھی ہے“ (192)

☆ فراق گورکھپوری:

”ان کا کلام ایک حساس دل و دماغ کی پیداوار ہے جس نے ان کے لہجہ میں ایک چٹایا پن اور ان کے انداز فکر میں ایک خلوص اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی شاعری میں تقلید و فرسودگی، باسی پن، روایت زدگی اور پیش پا افتادہ باتیں نہیں ہوتیں۔ ان کی بجائے اک تازگی کا احساس ہوتا ہے جو محض جدت سے نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ ایک انفرادی وجدان سے ہی پیدا ہو سکتی ہے، جناب احمد ندیم قاسمی کا ایمان زندگی ہے، جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے، ندیم اردو ادب میں تنہا وہ آدمی ہیں جنہوں نے افسانہ نگاری اور شاعری دونوں انصاف ادب میں نئی سمتوں اور نئی منزلوں کی نشان دہی کی ہے۔“ (193)

☆ حفیظ جالندھری:

”اپنے سب جغادری ساتھیوں میں ندیم ہی ایک فردِ وحید ہیں کہ ان کے شعروں میں جدت خیال کے علاوہ جدت احساس بھی ہے اور قلوب تک پہنچنے والی گہرائی بھی۔“ (194)

☆ سید عابد علی عابد:

”انسان تو ایک شعر سے غیر فانی ہوتا ہے۔ انھوں نے تو مجموعی قلم بند کیے ہیں۔ جن میں ابدیت کی جھلک گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔“ (195)

☆ محمد احسن فاروقی:

”وہ نمایاں انفرادیت کے مالک ہیں اور ان کی یہی عظمت میرے لیے دلیل تھی۔“ (196)

☆ محمد احتشام حسین:

”کیا افسانہ نگاری اور کیا شاعری، دونوں قاسمی کے ذہنی ارتقا اور تخلیقی لگن کی ایک دلکش داستان سناتی ہیں۔ وہی مشاہدہ کی گہرائی اور تازگی، وہی انداز کی فسوں گری، وہی اہم اور غیر اہم کا امتیاز، وہی رومانی و نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حقیقت پسندی، وہی گداز قلب اور وہی انسان دوستی، وہی احترامِ فن اور وہی انفرادی اندازِ نظر ایک اچھے شاعر اور افسانہ نگار، اچھے دوست اور اچھے انسان کی ساری خوبیاں قاسمی میں جمع ہو گئی ہیں۔“ (197)

☆ ڈاکٹر سید عبداللہ:

”ندیم کی شاعری پڑھ کر (بہت سی یادیں زندہ ہو جاتی ہیں، اصل میں شاعری کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یوں لگے گویا کوئی کھوئی ہوئی شے پائی ہے..... ندیم کی آواز اور ندیم کا فن منفرد ہے۔“ (198)

☆ اختر اورینوی:

”ندیم کا مشاہدہ گہرا ہے۔ وہ بہت ہی ذکی احساسات کے مالک ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی بھی ہے اور روشنی بھی۔ ان کی شاعری کے شعلے کبھی غیر مہذب طور پر نہیں بھڑکتے۔ ندیم تہذیبِ جذبات کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بڑی شائستگی ہے۔ ندیم کا تخیل بھی بے راہ رو نہیں ہوتا، ان کی تشبیہات واستعارات میں بڑی جدت پائی جاتی ہے۔“ (199)

☆ ڈاکٹر عبادت بریلوی:

”ندیم انسان کو فطرت کا شاہکار سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ ارتقا کا پیشوا اور ترقی کا پیامبر ہے اس کا نصب العین ترین حیات ہے۔ ندیم کے خیال میں زندگی عمل سے عبارت ہے اور انھیں کائنات کی ہر شے میں حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ ندیم کی شاعری میں ایک سنجیدگی اور وقار ہے، رکھ رکھاؤ ہے، وہ ترشی ہوئی اور بجی سجائی شاعری نہیں ہے۔ اس میں تو وہ حُسن ہے جو تکلف سے بری ہوتا ہے اور جس کو حُسنِ فطرت کہہ سکتے ہیں، ان کے یہاں تو سیدھے سادے انداز میں بات کہنے کا سلیقہ ہے۔“ (200)



☆ وقار عظیم:

” (ندیم) افسانہ نگار کی بصیرت ہیں۔ نظر نے جو کچھ دیکھا ہے اور جس کی تصویر کھینچی ہے وہ اس کے لیے سچ سچ ایک زندہ حقیقت ہے، اس نے کبھی کبھی ایسی باتیں کہی ہیں جنہیں مشاہدے سے آگے بڑھ کر ادراک کی باتیں کہا جاسکتا ہے، ندیم کے افسانوں میں کہیں کہیں حقیقت سے ماوراء ایک اور حسین حقیقت کی چھوٹی چھوٹی تصویریں ملتی ہیں جسے کوئی اور اپنے مکمل روپ میں نہیں دیکھتا۔“ (201)

☆ اسلوب احمد انصاری:

”پریم چند کے دور کے بعد جن افسانہ نگاروں نے افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے سستے پروپیگنڈے کا آلہ کار نہ بناتے ہوئے زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لیے استعمال کیا، ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔“

”ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دلسوزی، متانت اور میانہ روی اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں، جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بلا کم و کاست جھلک اٹھیں اور ایک معیار بھی، جہاں تک انھیں پہنچنا ہے۔“ (202)

☆ وقار انبالوی:

” (ندیم) قاسمی نے جب سے تازیانہ طنز و مزاح ہاتھ میں لیا ہے، زندگی پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے دل بھی ہلا کر رکھ دیے ہیں، غم کدہ حیات میں کہ تنادات سے عبارت ہے، ہر دل کی تیرگی میں مسرت کی ایک نضحیٰ سی کرن رجا نیت کے نور سے چمکتی رہتی ہے۔ قاسمی کی نظر بڑی حد تک اسی کرن پر مرکوز رہتی ہے، اسی نے اپنے ”حرف و حکایت“ کے کالم میں لکھا ہے:

”یہ کالم زندگی میں ذرا سی شگفتگی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اگر اس شگفتگی کے پردے میں معاشرے کی کسی خرابی کی اصلاح ہو جائے تو سبحان اللہ۔“ (203)

☆ ڈاکٹر انوار احمد:

”احمد تیم قاسمی کی تخلیقی شخصیت متنوع رنگ تھی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے معیار اور مقدار کے لحاظ سے احمد تیم قاسمی نے اپنی طویل زندگی میں جتنا تخلیق کیا۔ اس کا مقابلہ ان کا کوئی معاصر نہیں کر سکتا۔“

”ان کی تنقیدی بصیرت کے مظہر ان کے کئی مضامین ہیں۔ ان کے مضامین کے چار مجموعے (”ادب اور تعلیم کے رشتے“، ”تہذیب و فن“، ”پاس الفاظ“ اور ”معنی کی تلاش“ جب کہ شخصی خاکوں کے دو مجموعے: ”میرے ہم سفر“ اور ”میرے ہم قدم“) شائع ہو چکے ہیں، ”معنی کی تلاش“ میں شامل اپنے ایک مضمون ”تنقید کے سانچے میں“ وہ لکھتے ہیں:

”تنقید کے لیے جب چند سانچے گھڑ لیے جائیں اور تنقیدی ادب ان سانچوں میں ڈھل ڈھل کر برآمد ہونے لگے تو تنقید کے افق سمٹ جاتے ہیں۔“

(جب کہ) ”میرے ہم قدم“ میں مختار صدیقی اور ریاض شاہد کے خاکوں میں ان کی ایک بے حد اہم نقاد کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔“ (204)

اپنے شعر و ادب کے بارے میں احمد تیم قاسمی وضاحت کرتے ہیں کہ:

”میں نے پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو مناظرِ فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معیشتی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور میں رومانوں میں اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں مگر اس وقت مجھ پر یہ حقیقتیں محض رقت کی کیفیت طاری کر سکتی تھیں اور میں اسی کیفیت کو اپنی کہانیوں میں منتقل کر دیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ وغیرہ اور جب میں نے یہ سب کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے روپوں کی تھیلی چھنچھنی سُنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں۔ میں واڈھی، موٹھی منڈا دینے یا کوٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی نہیں سمجھتا، لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے اور سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف برسرِ باز رائی اٹھا کر اسے ظالم کہہ دینے کو بہترین

اخلاق تصور کرتا ہوں..... میں تو ابھی کھل کر بات کرنے کا انداز ہی سیکھ رہا تھا..... کہ ایک خوش گوار صبح کو میرے گھر کے دروازے پر پولیس کے ایک انسپکٹر نے کہا: ”یو آر انڈر ریسٹ!“ تو کیا اپنا شہ پارہ لکھ کر مجھے پھانسی کا منتظر رہنا چاہیے۔“ (205)

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیم  
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

### ندیم مقام انفرادیت و اہمیت (شخصی و ادبی):

جس بھی فن کار کے شہ کار ہو تم  
اُس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

(ندیم)

ندیم کے دوست محمد خالد اختر دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ:

”وہ اب سمن آباد میں اپنے ایک متواضع اور صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ ایک نرم دل باپ، ایک اچھا خیال رکھنے والا شوہر، ہمیشہ خوش اخلاق، متواضع، ہنس مکھ، کسی قدر محتاط اور مطلقاً راست رو اور بری عادتوں سے پاک، آمدنی کے محدود ذرائع کے باوجود اس کا ہاتھ بڑا کھلا ہے۔“

”ندیم نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ دوسرے اصناف میں بھی اپنی لیاقتوں کا استعمال کیا ہے، اس نے اردو میں اوپیرا بھی لکھے ہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم سکرپٹ روائی سے اور قلم برداشتہ تحریر کیے ہیں پھر اس کی روزانہ اخبار میں مزاحیہ کالم نویسی ہے۔ ہر روز کی ہر تکان مشقت اور تخلیق فن کار کے لیے ایک بے روح عمل (Hard Work) یہ روزانہ کالم اس کی اور اس کے کنبے کی بقا کے لیے ضروری ہیں، اس کا ذریعہ معاش ہیں۔“

”وہ ادبی دنیا کی اس بلندی پر پہنچ چکا ہے کہ ادبی انجمنوں، کالجوں کی مجالس اور ہر ایک قسم کے مشاعروں کی صدارت کے لیے اس کی کافی مانگ رہتی ہے۔ ایک ”بیبا“ انسان ہونے کی وجہ سے وہ انکار نہیں کر سکتا اور اکثر طوعاً و کرہاً اسے یہ اعزاز اپنے سر منڈھنا

پڑتا ہے۔ ایک ادبی محلے کے مدیر کو خالص کاروباری شخص ہونا چاہیے، جو وہ اصلاً نہیں۔ وہ حساب کتاب نہیں رکھ سکتا اور میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ وہ ”فنون“ میں اشاعت کے لیے آنے والے مسودات کو کیوں کر سنبھال کر رکھتا ہے۔“ (206)

قیصر حمکین نے تحریر کیا ہے کہ:

”اے حضرات تو تقریباً عفا ہیں کہ جو ادب و فن کی خدمت کے ساتھ ہی دوسری گھریلو اور سماجی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ حال یہاں بھی قاسمی صاحب کا ایک حیرت انگیز انفرادیت سے مملو ہے۔“ (207)

ڈاکٹر سلیم اختر کا کہنا ہے کہ:

”زندگی سے بھرپور، ہنسی سے معمور، دوستوں سے پیار کرنے والا اور اپنے بیگانے کا ساتھی، ایسا شخص کیسے مر سکتا ہے، کیلنڈر عمر بسر کرنے والے افراد کے پاس محض شخصیت ہے جب کہ تخلیق کار، تخلیقی شخصیت کا بھی حامل ہوتا ہے اور تخلیق کار کا ”گرزما“ اس کی تخلیقی شخصیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ خدا داد ہے ”کرزما“ی شخصیت“ میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ بلاوجہ اس سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسے خوش کر کے خوشی حاصل ہوتی ہے تو خوش دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور خدمت سے راحت حاصل ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد ندیم قاسمی بھی ایسی ہی ”کرزما“ی شخصیت“ کے حامل تھے، اسی لیے ان سے ”جو بھی ملا انھی کا ہو کر رہ گیا۔“ (208)

ڈاکٹر خورشید رضوی ندیم کی ایک انفرادیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

”قاسمی صاحب لوگوں (کی آوازوں) کی دلچسپ نقل اُتارتے تھے..... پھر..... خود پر ہنس سکنے کی سکت اُن میں بہت تھی۔ اُس روز انھوں نے اپنے نقل سماعت کے حوالے سے خوب خوب بذلہ سخی فرمائی۔“ (209)

اشفاق حسین اپنی یادیں کچھ اس طرح تازہ کرتے ہیں کہ:

”قاسمی صاحب وقت کے بہت پابند تھے، میں نے ان مشاعروں میں ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ قاسمی صاحب نے ہمیشہ ابتدا میں اپنا تازہ کلام پیش کیا اور بعد میں حاضرین کی فرمائش پر اپنی پرانی تخلیقات بھی پیش کیں۔ جب کہ ان دنوں دیکھا جا رہا ہے کہ



بڑے بڑے شاعر اپنے پرانے اور مشہور ہو جانے والے کلام ہی کو شاعرے میں بار بار پڑھ رہے ہیں۔ قاسمی صاحب جو اپنا نیا کلام لازمی سناتے تھے اس کی وجہ ان کی مکمل خود اعتمادی تھی۔“ (210)

اطہر رضوی رقم طراز ہیں کہ:

” (بقول اختر الایمان: ) ”مجھے بہت دنوں سے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ بڑے آدمی جو پیدا ہوا کرتے تھے، اب پیدا نہیں ہوتے۔“ جمیل الدین عالی نے (ندیم صاحب پر) اپنے کالم کا نام ”آخری بڑا آدمی“ رکھا تھا، احمد ندیم قاسمی اپنے عہد، اپنے دور، اپنے وقت کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کی شخصیت ایک ایسے بڑے گھنیرے پیڑ کی مانند تھی جس کی ٹھنڈی اور روح افزا چھاؤں سے اردو شعر و ادب کے شیدائی گزشتہ تقریباً چھ عشروں سے فیض یاب ہو رہے تھے اور پھر انھوں نے خود کہا ہے کہ:

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے

میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں

”میرے نزدیک ایک ان کی شخصیت کے تعلق سے چند ایسے حقائق وابستہ ہیں جن کی بدولت وہ مشاہیر اہل قلم کی صف میں سب سے ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں۔“ قاسمی صاحب اپنے عہد کے معروف ترین فن کار تھے۔ انھوں نے مختلف مخالفتوں کا سامنا کیا، ایوب کے دورِ آمریت میں دو مرتبہ جیل گئے لیکن ساری زندگی اپنا انداز، اپنی فکر، اپنا مزاج، اپنا موقف، اپنا فلسفہ اور اپنی اقدار برقرار رکھیں:

دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم

سب جا رہے ہیں جا ب در، تو مگر نہ جا

”احمد ندیم قاسمی اپنی شرافت، بردباری، متانت، بزرگی، نرمی، گفتار، میانہ روی، اخلاص، تحمل اور بے پناہ محبت کی خصوصیات سے دنیا جہاں میں پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کا ایک مقبول شعر ہے:

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا“ (211)

اور ضرب المثل بن جانے والا شعر:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن  
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

منصورہ احمد بتاتی ہیں کہ:

”بابا (ندیم) کا طرزِ تپاک اتنا والہانہ ہوتا کہ آپ اپنی نظروں میں خود ہی معزز و محترم ہو جاتے، ہر پریشانی پر کہتے: ”پریشان کیوں ہوتی ہو؟ میں ہوں نا، کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔“ اور میں بے فکر ہو جاتی۔ امجد اسلام امجد کی ڈو کو میٹری میں مشتاق احمد یوسفی صاحب نے کیا خوب کہا تھا کہ ”اردو دنیا میں کون ہے جو قاسمی صاحب کا مقروض نہیں؟“ وہ سب کچھ چپ چاپ کرتے تھے، کبھی ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے، انھوں نے ہر ہر لمحہ میری تربیت کی، لفظ کی نشت و برخاست میں، عروض میں، تنقیدی شعور میں، لفظ میں، اگر مجھ میں کوئی کمی ہے تو وہ میری ذات میں انجذاب کی کمی ہے۔ ورنہ بابا کا طرز استادِ تو با کمال تھا۔“ (212)

مجتبیٰ حسین کی رائے میں:

”احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر نہایت شریف، باظرف اور شائستہ انسان تھے، انھوں نے قلم کو ذریعہ معاش بنایا اور قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت خوددار اور باوقار زندگی گزاری۔“ احمد ندیم قاسمی نے عوام سے اپنا رشتہ بنائے رکھا، البتہ صاحبانِ اقتدار سے ہمیشہ ایک شریفانہ دوری برقرار رکھی، انھوں نے اپنے فن کے ذریعے اپنے زمانے کے لب و لہجہ کو ایک نیا آہنگ دیا۔ انھوں نے سینکڑوں افسانے لکھے، ہزاروں شعر کہے، ہزاروں کالم اور مضامین لکھے اور اپنی بات کو وضاحت، صراحت، فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کی دیا نندارانہ کوشش کی۔ ان کی تخلیقات ہمارے ادب کا ایک انمول خزانہ ہیں اور ان کی اس دین کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔“ (213)

آفتاب اقبال شمیم لکھتے ہیں:

”وہ تین چوتھائی صدی تک بے تھکان لکھتا ہی چلا گیا۔ اُس کا قلم کبھی دم لینے کے لیے بھی نہیں رکا۔ کوئی ہے جس نے ادب کی اتنی اصناف میں معیارِ ہنر کو برقرار رکھتے ہوئے

اتنا لکھا ہو۔ لیکن ایک امیج، ایک علامت، ایک لپچنڈ، خیال کا ایک روشن پیکر بننے کا اعزاز جو اسے اس وقت مل رہا ہے، اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ وہ وجہ ہے اس کا بڑا آئیڈیل جس کے ساتھ اس کی کومنٹ منٹ تا دم آخر رہی ”احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری تو اپنی جگہ لیکن اس کے چالیس سال کے مجاہدے (“فنون”) اور ریاضت نے ہمارے ادب کو مسلسل تخلیقی و فور میں رکھا، اسے کسی انتہا پسندی یا بنیاد پرستی سے بچ کر جمہور پسندی کے راستے پر چلنے کی سمت دکھائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی کی یہ چالیس سالہ شخصی واردات، مستقبل میں کئی تخلیقی مقالوں کا موضوع بنے گی۔“ (214)

☆ امجد اسلام امجد

”ان کی طبیعت میں جوڑی، گداز، برداشت اور معاف کردینے کی حیرت انگیز خوبی تھی، اس کا مظاہرہ میں اکتالیس برس سے دیکھتا آ رہا ہوں۔“ (215)

☆ عطا الحق قاسمی:

”یوں چالیس برسوں میں پھیلے ہوئے اس عرصے میں مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کی شخصیت میں سب انسانی خوبیاں دیکھیں جو آہستہ آہستہ زندگی کے تمام شعبوں کے افراد بشمول ادبا، شعرا، میں دم توڑتی جا رہی ہیں۔ وہ عجز و انکسار کا پیکر تھے۔ پسے ہوئے طبقوں کے لیے ان کا قلم ہی نہیں، ان کا دل بھی رونا تھا۔ وہ بائیں بازو کے نظریات سے تھے۔ پاکستان اور اس کے عوام سے باندھے ہوئے عہد و وفا پر وہ آخری سانس تک قائم رہے۔ اسی طرح اسلام کی موجودہ مسخ کی گئی شکل اور اس کے جعلی پیروکاروں سے وہ متنفر تھے مگر وہ مذہب کے باغی نہیں تھے بلکہ اس پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔“ (216)

☆ محمد اظہار الحق:

”دنیا نے ادب کا بے تاج بادشاہ ہونے کے باوجود انکسار اور وضع داری کا یہ عالم تھا کہ حقیر سے حقیر اور گم نام سے گم نام آدمی کے خط کا جواب اپنے قلم سے دیتے۔“  
”آخر احمد ندیم قاسمی کی درویشی اور فقری کا تذکرہ کیا جائے تو کچھ پیشانیوں پر ہل

کیوں پڑ جاتے ہیں؟ وہ ثنائی کی طرح صوفی نہ تھے لیکن اس میں کیا شک ہے کہ انھوں نے دنیا کو جو سمجھا، انھوں نے جن پے ہوئے طبقات کی ہم نوائی کی، اپنے آپ کو آخری دم تک ان سے وابستہ رکھا۔ وہ چاہتے تو شادمان یا ڈیننس یا کسی امیرانہ بستی میں منتقل ہو جاتے اور محطراق والی سواری رکھ سکتے تھے۔ اس لیے کہ ان سے کئی گنا کم مرتبے کے ادیب اور شاعران بستیوں میں منتقل ہوئے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں لیکن احمد ندیم قاسمی نے ایسا کرنا گوارا نہ کیا۔ ان کا جنازہ کچی کھٹھی سے نکلا:۔“

وقت بدلا پہ نہ بدلا مرا معیار وفا  
آندھیوں میں سر کہسار چراغاں جیسے

(ندیم)

”احمد ندیم قاسمی نے اپنے اوپر کوئی خول نہیں چڑھایا، وہ سچا اور کھرا مسلمان تھا۔ سچائی میں تلوار کی طرح برہنہ اور باطن اور ظاہر ایک رکھنے والا۔ انھوں نے کوئی ڈرامہ نہیں رچایا۔ ان میں اتنی عجز و انکساری تھی کہ اُن کی تعریفیں سن کر چیں بہ جیں ہونے والے اس عجز و انکساری کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“ (217)

☆ فیاض عزیزی:

”شعر و ادب میں جس قدر کام ندیم صاحب نے کیا، شاذ ہی کوئی دوسرا شاعر اور ادیب اس کا دعویٰ بھی کر سکے، نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کی جس طرح آپ نے حوصلہ افزائی کی اس کی مثال کسی اور کے ہاں نہیں ملتی، شعر و ادب کی تاریخ میں اتنی ہمہ جہت شخصیت خال خال ہی پیدا ہوئی ہے۔ اقبال، میر، غالب اور فیض کے بعد کم ہی کسی کو اتنی شہرت و مقبولیت، اتنا مقام اور اتنی شان حاصل ہو پائی۔“ (218)

☆ طاہر سرور میر:

”قاسمی صاحب ایسی شخصیت تھے، جنھوں نے اپنے عہد کے تمام لوگوں کو متاثر کیا۔ بلا شبہ وہ جس دور میں جینے اسے احمد ندیم قاسمی کا دور کہا جائے گا۔“ (219)



## مدّیم کی اور فروگزاشت:

میں مرے نقاد بہت ہی بُرا سہی  
اتنا بُرا نہیں ہوں ، جتنا اچھا ہوں

(مدّیم)

میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو  
بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں

(مدّیم)

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ احمد مدّیم قاسمی اپنی 80 ویں سال گرہ کے موقع پر کیا کہتے ہیں:  
”میں یہ سوچ کر ایک عجیب سی تسکین محسوس کرتا ہوں کہ میں اس معیارِ حیات میں نہ کسی  
کفریب دینے کا مرتکب ہوا ہوں اور نہ میں نے کبھی اپنے ضمیر کو فریب دینے کی کوشش  
کی ہے۔ یقیناً اس مدت میں بعض لغزشیں بھی ہیں، بعض کوتاہیاں بھی ہیں، بعض  
ناوانیاں بھی ہیں اور ان کا جواز بھی نہیں ہے مگر یہ عام انسانی فروگزاشتیں ہیں بلکہ میرا  
موقف تو یہ ہے کہ مجھ سے یہ فروگزاشتیں سرزد نہ ہوتیں تو بحیثیت انسان میری تکمیل ہی  
معرضِ خطر میں پڑ سکتی تھی۔“ (220)

مدّیم صاحب خاں سے محتاط تھے اور اکثر ایک غلطی کو کبھی دوہراتے نہیں تھے۔ میرے نزدیک  
صرف دو باتیں ایسی ہیں جو ان سے بار بار سرزد ہو جاتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسروں پر حد سے زیادہ  
اعتبار کر لیتے اور دوسری بات یہ کہ وہ معاف کرنے میں بہت جلدی کرتے۔ نتیجے میں انھیں چند  
فریبوں اور دھوکوں کو سہنا پڑتا۔ لیکن اُن کی وسعتِ قلب انتہائی تھی، سو یہ سب وہیں جذب ہو جاتا  
اور وہ بظاہر ہلکے پھلکے ہو کر اپنے معمول کے سفر پر رواں دواں ہو جاتے۔ اپنے ابا جی کے بارے  
میں ماہید قاسمی نے بتایا کہ:

”وہ عام انسانوں سے لے کر معتبر شخصیات تک، سب کا ذکر انتہائی اپنائیت سے  
کرتے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا کہ وہ خواہ مخواہ حمایت کر رہے ہیں یا یہ کہ کسی کو ضرورت  
سے زیادہ قابلِ توجہ سمجھ رہے ہیں۔ لیکن بالآخر میں اسے اپنی نگاہ دلی ٹھہراتی اور ان کی  
لاحہ و وسعتِ قلب و نظر کی قائل ہو جاتی۔“ (221)

ندیم کی بیگم رابعہ ندیم نے ایک انٹرویو میں کہا:

وہاں تو ہم کبھی کبھار کو بھی لیتے ہیں مگر شاعری کی وجہ سے کبھی ایک لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ لڑائی عموماً خرچ اخراجات کے مسئلے پر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ندیم صاحب روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملہ میں بہت تیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پاس جو روپیہ ہے، وہ اسے ایک دم خرچ نہیں کر دیں گے تو پیار ہو جائیں گے، روپیہ خرچ کرنے کا معاملہ ہو تو آنے والا دن ان کے لیے بالکل بے معنی ہو جاتا ہے سوان کی اس عادت پر بعض اوقات تلخی ہو جاتی ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج ہیں، بے حد صاف گو ہیں۔ کبھی کوئی لگی لپٹی اٹھا کے نہیں رکھتے۔ اس طرح بعض اوقات مشکلات میں بھی گھر جاتے ہیں مگر مجھے ان کی صاف گوئی سے پیار ہے۔ (222)

جہاں تک ندیم کے فن کی بات ہے تو 1946 میں ندیم کے پہلے شہری مجموعے ”جلال و جمال“ کا ذکر کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے کچھ پہلوؤں کی تعریف کی، ساتھ میں یہ بھی کہا کہ:

”اُن کے فن میں خامیاں بھی ہیں لیکن ان کی کوشش ایک سچے شاعر کی کوشش ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ”جلال و جمال“ اردو کے شعری ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جس مجموعہ میں ”پرتو“، ”کروٹیں“، ”میری زمین“، ”نسیم کے نام“، ”شکاری“، ”ترکِ محبت کے بعد“، ”حریتِ فکر“، ”افشائے راز“، ”شکست و ریخت“، ”ردِ عمل“، ”راستے کا موڑ“، ”ماہتابِ فردا“، ”اور“ ”گریز“ ایسی نظمیں موجود ہیں۔ اس کے دل پذیر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے!“ (223)

روایت پسندوں نے کہا کہ ندیم کے کچھ الفاظ شاعری کی ڈکشن سے میل کھاتے الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں پہلے مولانا عبد المجید سالک صاحب کی رائے دیکھیے۔ 1953 میں ”شعلہ گل“ کے تعارف میں انھوں نے لکھا ہے:

”ندیم الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط ہے، وہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھتا ہے اور بعض اوقات ان کے استعمال میں ایسا امتیاز کرتا ہے کہ پڑانے شعر امنہ تکلتے رہ جاتے ہیں اور انھیں انکار اور اعتراض کی جرأت نہیں ہوتی۔“ (224)

اور 2002 میں ڈاکٹر ناہید قاسمی نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

”اردو غزل میں ندرتیم نے انوکھے، بامعنی، سادہ اور آج کل کی اردو زبان کے مقبول، قابل قبول اور مستقبل گیر الفاظ بہت سلیقے سے برتے ہیں، مجموعی طور پر ندرتیم کے الفاظ احساس، جذبے، حقیقت، شعور، فکر اور نظریے کے اظہار و ابلاغ کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کردہ ایسے انوکھے الفاظ بھی ہیں جن کو کچھ نقادوں نے اردو غزل کے مزاج سے مختلف بتایا ہے لیکن یہی غزل کے مزاج سے ہٹ کر الگ سے مستعمل سمجھے جانے والے الفاظ ندرتیم کی منفرد غزل میں جس جس مقام پر استعمال ہوئے ہیں، بر محل و بر موقع ہیں۔ ایک جری مضبوط مزاج کے حامل توانا لہجے کے لیے نزاکت مناسب ہی نہیں ہے۔ البتہ ندرتیم کی غزل میں نرمی اور نفاست ضرور ہے اور خاص شے، جسے میں ان کے تعزل کی اہم پہچان کہوں گی کہ ہر طرح کی شدتوں میں بھی ہمیشہ توازن اور اعتدال پسندی کا پاس رکھا۔“ (225)

کچھ کا خیال ہے کہ ندرتیم نے م راشد کی طرح ندرتیم کے فکر انگیز کلام میں بھی ایک آنچ کی کمی ہے لیکن یہ تو ندرتیم کی انفرادیت سے نظریں چرانا ہوا۔ حالاں کہ ندرتیم کے خلوص کی شدت (جو شاعری کی اصل ہے) اور ان کے دل کی بے حد پرتا شیر تڑپ (جو ندرتیم کی خاص پہچان ہے) نے کسی بھی طرح کی کمی بیشی کو متوازن کر کے ان کے کلام کو کشش اور تاثیر دی ہے۔ ندرتیم نے کہا ہے کہ: ”فکر کا شاعر ہوں لیکن حسن کا گھائل بھی ہوں۔“ دراصل وہ صرف دلوں کو متاثر کرنے ہی میں نہیں لگے رہنا چاہتے تھے بلکہ وہ شعور اور آگہی کو بھی ساتھ میں بیدار رکھنا پسند کرتے تھے۔ اصلی اور سچا فن کار کسی بھی معاشرے کا سب سے زیادہ آگاہ شخص ہوتا ہے۔ یہ آگاہی صرف احساسات و جذبات اور آرزوؤں تک محدود نہیں رہتی بلکہ عقل و شعور سے بھی وابستہ ہے جب کہ فن کار کو کسی بھی طرح کے خطرے اور خوف سے آگہی کو بھی صرف اپنے تک محدود کر کے، اپنے ہی اندر چھپا کر نہیں رکھنا ہوتا بلکہ قاری اور سامع کو بھی شامل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اسے محض تسکین دینا اور تھپکنا نہیں بلکہ بیدار کرنا اور متحرک رکھنا بھی ہوتا ہے اور ندرتیم نے بحیثیت شاعر اور ادیب یہ ذمہ داری بحسن و خوبی ادا کی ہے اور کسی بھی طرح کی ذمہ داری پورے خلوص سے ادا کرنا کوئی خامی نہیں ہوتی۔

منصورہ احمد ہمارے شاعر، ہمارے ادیب ندرتیم کی کچھ کمیوں کا اس طرح ذکر کرتی ہیں:

”سنو بابا!“  
 تمھارے پاس سب سکے پرانے ہیں  
 نئے بازار میں ان کی کوئی قیمت نہیں.....  
 تمھارا دوش یہ ہے، تم ابھی تک  
 حُسن کی تخلیق کو کافی سمجھتے ہو.....  
 سنو! یہ لمحہ زدید ہے  
 دوری ہے  
 اس کے کچھ آداب تو سیکھو.....  
 نیا دستور یہ بھی ہے  
 کہ ایوانوں کی پیچیدہ گزرگاہوں کے چکر کاٹتے  
 سیارہ بن جاؤ  
 انا کو دان کر کے، جنتِ ارضی خریدو.....  
 یہ سب اعزاز ہیں صدچرگی کے  
 تمھارا مسئلہ ہے  
 ایک چرے لے کے پھرتے ہو  
 غریب شہر بن کے جی رہے ہو  
 ..... تمہیں اصرار ہے سکے پرانے ساتھ رکھنے پر؟  
 تو پھر آنسو تو پونچھو.....  
 جنہیں تم اس تڑپ سے یاد کرتے ہو  
 وہ سارے اگلی منزل کے مسافر تھے  
 تمھارے پاس دم بھر کوڑ کے تھے  
 تم اس کو زندگی کی انتہا سمجھے  
 ابھی تک ان کے قدموں کی  
 اڑائی گرد میں بیٹھے ہو!“

(”لظم سنو بابا!“) (226)



ندیم کے دوست محمد خالد اختر نے اُن میں یہ کمی محسوس کی کہ:  
 ”ندیم حد درجہ مخلص ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو بہت پرستی کی حد تک پوچنے لگتا اور آسانی  
 سے متاثر ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ زندگی میں شدید جذباتی دوستیاں بنانے کی کوشش کی  
 ہے۔“ (227)

جب کہ اس کے جواب میں ندیم کہتے ہیں:  
 محبت میں تو غم بھی نفع ہے، دکھ بھی کمائی ہے  
 محبت میں کبھی گنتی نہیں ہوتی خساروں کی

### ندیم اور نسل نو:

ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل  
 میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

احمد ندیم قاسمی نسلِ نو سے نہ صرف بہت پیار کرتے ہیں بلکہ ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کرتے  
 ہوئے اسے اپنا روشن مستقبل قرار دیتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے یوں بات کی کہ:  
 ”میں آج کے ادیب کے مثبت رجحانات کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اگر نئی نسل کے  
 ہاں نیا پن نہ ہو تو وہ مجہول نسل ہوگی۔ ہم لوگ اپنے زمانے میں نئے تھے۔ آج کے  
 نو جوان اپنے زمانے میں نئے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے عصر کے حوالے سے نئے  
 رویے اختیار نہ کیے ہوتے تو اب تک مرچکے ہوتے۔ ادیبوں کی نئی نسل اگر محض تقلید و  
 پیروی کے چکر میں گرفتار ہو جائے تو وہ نئی نسل کہاں ہوگی! بعض نو جوانوں میں  
 زندگی کی نفی کے رجحان موجود ہیں، یہ ”عارضی“ لوگ ہیں۔ سو ان کا نوٹس نہیں لینا  
 چاہیے۔ میں تو یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں کہ نو جوان نسل میں ایسے ایسے توانا عناصر  
 نمایاں ہو رہے ہیں کہ ہمارے ادب و فن کے ارتقائی سفر کے بارے میں کسی تشویش  
 میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ان سے قطع نظر کیجیے تو ہمارا ادب آگے بڑھ رہا ہے اور  
 اس کا مستقبل بے حد روشن ہے۔ اور اس مستقبل کے امین وہ نو جوان اہل قلم ہیں جن

سے عموماً مایوسی کا اظہار کیا جاتا ہے مگر مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔“ (228)

ایوب خاور لکھتے ہیں کہ:

”انہوں نے اپنی زندگی کا بہت سارا حصہ نوجوان نسل کو بنانے میں صرف کیا۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ اقبال فریدی بھی انہی میں سے تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ اس کے بارے میں مجھ سے پوچھتے تھے کہ وہ لڑکا مختلف لکھتا تھا۔ شاعری چھوڑ کر برا کیا اُس نے۔“

”میں 1981 میں لاہور سیٹل ہوا تھا۔ تب سے میں اس معنوی باپ کا خوب صورت، زندگی سے بھرپور، دل و دماغ کو موہ لینے والا بلکہ ہر پل دل کو اپنا عاشق بنا لینے والا جاذبِ نظر بڑھاپا دیکھ رہا ہوں، جو اتنا ہنس مکھ ہے کہ ہمارے سامنے لطیفہ گوئی سے بھی باز نہیں آتا۔ ہم چھوٹے چھوٹے لوگوں میں بڑے بڑے لوگوں کے قصے بانٹ کر وہ ہمارے عمومی رویوں کی تہذیب کرتے رہتے ہیں۔“ (229)

صلاح الدین حیدر کا کہنا ہے کہ:

”ندیم زندگی کے نئے قافلے کے آٹا کو پہچان لیتے تھے اور ہر انسان کو برادری کی سطح پر عزت دینا جانتے تھے۔ اُن کے اس قرینے میں بناوٹ یا وضع داری کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔“ (230)

ڈاکٹر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

”اُردو ادب کی تاریخ میں احمد ندیم قاسمی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے اظہارِ بیان کے لیے جس صنف کو بھی منتخب کیا، اسے قابلِ اعتبار بنا دیا اس طور پر کہ نئے لکھنے والے ان کے اسلوب میں لکھنا اور ان کے پیرایہ بیان کو اختیار کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ ادب میں اُن کی حیثیت ایک قطب نما کی تھی، جسے دیکھ کر اہل فن اپنی سمتیں درست کرتے تھے۔ ایک پورے عہد کا ادبی طرزِ احساس اُن کی ذات سے وابستہ تھا۔“ (231)

طاہر سرور میر بتاتے ہیں:

”ڈاکٹر محمد یونس بٹ نے کہا: ”میں بھی قاسمی صاحب کی ”پراڈکٹ“ ہوں۔ مجھے اچھی

طرح یاد ہے۔ میری پہلی کتاب اشاعت کے لیے تیار تھی۔ قاسمی صاحب نے حوصلہ افزائی کی غرض سے اس کے فلیپ کے لیے لکھا کہ: ”دوسرے مزاح نگار جو ایک پیرا گراف میں ہنساتے ہیں۔ یونس بٹ ایک جملے میں اتنا گدگداتے ہیں۔“ کیرئیر کا آغاز تھا۔ قاسمی صاحب جیسے بڑے ادیب کے قلم سے اپنے لیے ان الفاظ کو پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔“ (232)

حمید احمد سیٹھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

”قاسمی صاحب کی شفقت، دل جوئی اور محبت کا، اُن کے خلوص اور لحاظ کا انداز آج پھر مجھے شدت سے ہوا۔ جب میں نے اپنے پرانے ریکارڈ میں سے 1959-60 میں اپنے قلم سے لکھے اُن کے تین خطوط نکالے۔ ایک عام سے طالب علم کے نام پورے پورے صفحے کے خط اس طرز میں لکھے ہوئے تھے جیسے ایک اُستاد، ایک باپ، ایک محسن، ایک دوست کسی کو سمجھا رہا ہو۔ دُعا دے رہا ہو، اس کی اصلاح اور راہنمائی کر رہا ہو۔“ (233)

اسلام عظمیٰ گواہی دیتے ہیں کہ:

”ایک بار قاسمی صاحب مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے۔ صاحب نظامت نے اشارہ دیا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے مقامی شاعروں کو نہیں پڑھایا جائے گا۔ قاسمی صاحب کو اس بات کا پتہ چلا تو بولے: ”مقامی شاعر ہی تو ادب کو زندہ رکھتے ہیں۔ انھیں نہیں پڑھایا گیا تو میں بھی نہیں پڑھوں گا۔“ چنانچہ منتظمین کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔“ (234)

صوفیہ بیدار لکھتی ہیں کہ:

”میں آنٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی جب اپنی والدہ کے ساتھ کلب روڈ پر جناب قاسمی صاحب کو ان کے دفتر میں دیکھا، میں یہ ذرا سی لڑکی حیران پریشان، اس قدر ادب آداب والے لہجے، مخصوص شاعرانہ آواز والے انسان کو دیکھ رہی تھی۔ ان کے لبوں سے شعریوں ادا ہو رہے تھے جیسے واقعتاً یہ سلیقہ انھی کا حصہ ہو۔ ایک جاذبیت اور سحر تھا جو کمرے کی فضا کو باندھے ہوئے تھا کہ اچانک وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ”کیا آپ بھی

کچھ کہتی ہیں اپنی والدہ کی طرح؟“ میں سوال سے زیادہ ان کے اس قدر خوب صورتی سے ”آپ“ کہنے اور عزت بخشے پر انھیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ چونک کر بولی ”جی ابھی تو بس سوچتی رہتی ہوں۔ بہت چھوٹی ہوں لکھنے سے ڈرتی ہوں۔“ انہوں نے بڑی شفقت سے فرمایا: ”جب آپ لکھیں گی تمام ڈر بھاگ جائے گا۔“ آج سوچتی ہوں یہ کتنی سچی بات ہے۔“

”انہوں نے اپنی بیٹی (ناہید قاسمی) کے فن کی پرورش کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں (لڑکے، لڑکیوں) سے بھی سگی اولاد سے بڑھ کر سلوک کیا۔ دراصل وہ فن کی میراث، فن کے ہی حوالے کرنا چاہتے تھے۔“ (235)

اس سلسلے میں اب ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی تحریر کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے:

”بزرگوں سے مل کر اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو لیکن احمد ندیم قاسمی سینئر نسل کے ایک ایسے گلی سرسبد تھے جو بیک وقت اگلے وقتوں سے بھی متعلق تھے اور نئی نسلوں سے بھی ان کا رابطہ مضبوط تھا۔ یوں ان کی حیثیت قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل کی سی بن گئی تھی وہ قدیم متوسط، جدید اور جدید تر نسلوں کے مسائل و معاملات سے منسلک رہے ان کی شخصیت میں شعر و ادب، صحافت و سیاست اور مذہب و معاشرت کے ایسے ایسے پہلو مجتمع ہو گئے تھے جن کا امتزاج اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے (میرے خط کے جواب میں) علمی دنیا میں پائی جانے والی عام بے حسی کے برعکس ان کی طرف سے صاف دست خط میں سادہ کاغذ پر لکھا ہوا ایک پر خلوص مراسلہ موصول ہوا۔

”احمد ندیم قاسمی صاحب کی خدمت میں حاضری ہوئی اپنے سوالات کا جواب چاہا لیکن وہ اس وقت فیض احمد فیض کے چہلم کی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر اپنے سوالات لکھ کر چھوڑ جاؤں تو وہ خط کے ذریعے ان کا جواب ضرور دیں گے۔“

”ڈاک کے ذریعے جوابات موصول ہو گئے۔ احمد ندیم قاسمی نے جواب میں لکھا تھا: ”میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں میں انقلاب آرہا ہے، سو



میں اسے فکری انتشار نہیں بلکہ نوجوان نسل کے دل و دماغ کا انقلاب قرار دیتا ہوں اور اس لیے مجھے اپنی قوم اور اپنے ملک کا مستقبل خوش گوارا اور بھرپور نظر آتا ہے۔ اختلاف رائے کو انتشار نہیں کہتے۔ یہ غور کرنے، فکر کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کا عمل ہوتا ہے ہماری نوجوان نسل بحیثیت مجموعی، رجعت پسند نہیں ہے بلکہ وقت سے آگے بڑھ کر سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس لیے ہمارا مستقبل مخدوش نہیں ہے۔“ (236)

ایک جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کی تقریب میں ندیم صاحب کے نوجوانوں سے خطاب کا ایک اقتباس دیکھیے:

”مجھے جب بھی نوجوانوں کے کسی اجتماع سے خطاب کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے، مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں اپنے مستقبل سے مخاطب ہوں۔ آپ کی سرگرمیاں، آپ کا ذوق و شوق، زندگی کے بارے میں آپ کے اندازے اور نظریے، اپنے سے بڑوں اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ، اپنے ملک اور اپنی زمین کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر، یہ سب چیزیں مجھے اپنے مستقبل کے خدوخال کو واضح کرنے اور انھیں متعین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ پھر جب میں ’اپنے مستقبل‘ کے الفاظ استعمال کرتا ہوں تو ان کا مطلب میری ذات کا مستقبل نہیں ہوتا..... بلکہ پوری قوم سے بلکہ پوری انسانیت سے ہے۔ اس طرح وقت نے ایک بہت بڑی امانت آپ کی تحویل میں دے دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ صحیح معنوں میں ذمہ دار، امین اور دیانت دار ثابت ہوں گے اور جب بھی کوئی فیصلہ کریں گے تو اس جذبے کے تحت کریں گے کہ یہ صرف آپ کا فیصلہ نہیں، ہمارے پورے مستقبل کا فیصلہ ہے۔“

”ہماری نسل کے سپرد یہ کام تھا کہ ہم غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کریں۔ یہ کام ہم نے حسب استطاعت مکمل کر لیا۔ اب آپ کی نسل کے ذمے اس کی آزادی کے تحفظ کا کام ہے اور یہ کام ہمارے کام سے کہیں زیادہ مشکل ہے مگر مجھے اعتماد ہے کہ آپ بھی ہماری طرح سرخرو ہوں گے۔“ (237)

آخر میں ایک کڑے سوال کا جواب ملاحظہ کیجیے۔ 1990 کی ایک کانفرنس میں سامعین کے سامنے

احمد ندیم قاسمی سے سوال کیا گیا کہ: ”قاسمی صاحب! آپ کے دامن پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ آپ بہت سی کتابوں کے ڈسٹ کو راور فلیپ لکھ دیتے ہیں.....؟“ ندیم صاحب نے جواب دیا:

”آپ کا الزام بجا ہے مجھے تو بعض حلقوں میں فلیپ نگار کہا جاتا ہے۔ ایک بار میرے ایک عزیز دوست نے کتاب کے اجرا کے وقت، جب کہ صدارت میں ہی کر رہا تھا۔ کہا کہ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا فلیپ قاسمی صاحب نے نہیں لکھا۔“

”میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ میں دریا کے کنارے بیٹھا ہوں۔ چھاننی میرے ہاتھ میں ہے۔ میں ریت کو چھان رہا ہوں۔ جب سونے کے ذرات ملتے ہیں تو دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ پچھلے تیس برس سے ”فنون“ نکال رہا ہوں۔ ایک سو سے زیادہ شاعر اور افسانہ نگار متعارف (INTRODUCE) کروا چکا ہوں۔ جواب ادبی دنیا میں مانے جاتے ہیں۔ میں جب فلیپ لکھتا ہوں تو جھوٹ نہیں لکھتا۔ (کسی نہ کسی طرح سچ ضرور کہہ ہی دیتا ہوں اور سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں)“ (238)

اور ناہید قاسمی نے گواہی دی:

”وہ ہمیشہ کہتے کہ نو جوان ہمارا مستقبل ہیں اور یہی تو ہمارا آنے والا کل ہیں جب کہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ہر اپا امید تھے۔

روز اک نیا سورج ہے تری عطاؤں میں  
اعتماد بڑھتا ہے صبح کی فضاؤں میں“ (239)

### ندیم آرزوئیں اور امیدیں:

ندیم کی لافانی، زندہ جاوید اور بے حد مقبول نظم کے دو اشعار سنئیے:

ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوج کمال  
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو  
خدا کرے کہ میرے اک بھی ہم وطن کے لیے  
حیات مجرم نہ ہو زندگی وبال نہ ہو

ندیم جب اپنے پُرنا شیرالفاظ میں یوں اظہار آرزو کرتے ہیں تو ان کی سچی تڑپ دل موہ لیتی ہے:

”جب ادیب چاہتے ہیں کہ اس مملکت کی حیثیت مثالی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت سے محبت کرتے ہیں اور اسی محبت کی بنا پر وہ اسے سر بلند اور باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ادیبوں کو اپنے قومی مسائل کی اہمیت کا بدرجہ اتم احساس بھی ہوتا ہے اور ان مسائل سے تخلیقی سطح پر نمٹنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے، وہ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ یہ مملکت ایسی ہو جس میں ان کے سہانے خواب حقیقت بن کر پنپ سکیں۔ جہاں کا ایک ایک فرد خود کفیل اور خوش حال ہو اور مادی اور روحانی استحصال سے محفوظ ہو، جہاں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو، کوئی بھوکا نہ ہو، کوئی بے روزگار نہ ہو۔ کوئی بیمار علاج سے اور کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ ہو۔ جہاں کوئی کسی کا حق نہ ہتھیا سکے، جہاں نفرت کی بجائے محبت کا راج ہو، جہاں فرقہ پرستی کی بجائے بھائی چارے کی فضاء ہو، جہاں منافقت نہ ہو، دشنام بازی اور بہتان طرازی نہ ہو، جہاں کشیدگی کی بجائے باہمی تعاون کا فرما ہو، جہاں بے مقصدیت کے بجائے وہ مثبت مقاصد پروان چڑھیں جن کا ایک واضح رخ اور ایک متعین جہت ہو اور جن کا سفر ارتقائی ہو، جہاں مادی اور قلبی اور روحانی سکون ہو اور جہاں تنقید کی آزادی ہو اور یہ تنقید برداشت کی جاتی ہو۔ جہاں زندگی کا ڈھرا ایسا ہو کہ سب انسان بہترین اخلاقی اصولوں کے مطابق زندہ رہیں اور یہ اصول ان لوگوں کے ایمان اور عقیدے اور مقدس قدروں اور بلند تہذیبی معیاروں کی برکت سے، ان کے اندر سے، ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے، ان کی نفسیات و عادات کا قدرتی حصہ بن کر، ان کی شخصیات میں رچ بس کر خود بخود بے ساختگی کے ساتھ، یوں پھوٹیں جیسے کہسار سے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ یعنی یہ سب کچھ ان پر یکدم عائد ہونے کی بجائے ان کے دلوں اور دماغوں میں اُترا ہوا ہو اور یہ تعلیم سے ممکن ہے، تربیت سے ممکن ہے، پاکیزہ اور پُر سکول ماحول سے ممکن ہے، چھوٹوں کے سامنے بڑوں کے، ایک مثال بن کر زندہ رہنے سے ممکن ہے اور صرف ایسی فضاء میں ممکن ہے جہاں ذاتی مفادات پر قومی اور مملکتی مفادات کو بہر صورت اور بہر حالت صد فی صد فوقیت حاصل ہو۔“ (240)

ایک انٹرویو میں معاشرے پر ادب کے اثرات کے حوالے سے ندیم کہتے ہیں:

”جہاں تک عوام کا تعلق ہے ہمارے ہاں خواندگی بارہ چودہ فی صد سے زیادہ نہیں ان میں سے بھی دس فی صد کو اردو کتاب تو پڑھنا کیا دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔ باقی رہ گئے دو چار فی صد وہ مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے لوگ ہیں جو کتاب خرید کر پڑھتے ہیں لیکن کتابیں بھی اتنی مہنگی ہو گئی ہیں کہ خریدنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس طرح بھلا ہم (ادیب شاعر) کیا انقلاب لائیں گے۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہوگی اور عوام ہماری تحریر نہیں پڑھیں گے، ہم ان کی سوچ پر کس طرح اثر انداز ہوں گے۔“ (241)

ندیم صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ چند برس قبل اپنی ایف ایس سی کی اردو کلاس سے دوران لیکچر میں نے پوچھا کہ آپ کو اردو کی کون سی کتاب پسند ہے۔ کلاس کی ٹاپر نے کہا کہ ”احمد ندیم قاسمی کی کتاب تہذیب و فن“۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ یہ تنقید کی کتاب ہے۔ پوچھنے پر اس نے کہا یہ کتاب اُسے ایک کوز جیتنے پر انعام میں ملی تھی۔ ”اُسے پڑھ کر مجھے اور میری کلاس فیلوز کو بے حد خوشی ہوئی کہ نہ صرف میرے ذہن میں اُنھتے سوالوں کے جواب ملے بلکہ اپنے ملک اور اپنے شعروادب بھی مجھے اچھے لگنے لگے۔ اس لیے یہ کتاب ہر طالب علم کو ضرور پڑھنی چاہیے۔“

ندیم نوجوانوں سے اپنی تمنا کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

”آئندہ زندگی میں آپ کا طریقہ کار ایسا ہو کہ آپ میں سے ایک ایک فرد پر ہماری پوری تاریخ فخر کر سکے کڑھ ارض پر آج جو شکست خوردگی اور خوف زدگی سے پیدا ہونے والی تحریکیں چل رہی ہیں۔ ان سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھیے گا، کیوں کہ آپ ایک ایسی قوم کے فرد ہیں جسے مایوس ہونا آتا ہی نہیں ہے اور جسے خوف و شکست کی عیاشی میں مبتلا ہونے کی بجائے سعی اور کوشش سے زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بنانا ہے۔“ (242)

ایک اور آرزو جس کا ندیم نے اکثر جگہ ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

”اس آخری عمر میں ایک منصوبہ میرے ذہن میں ہے کہ اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔ وہاں ایک ننھے سے پرسکون مکان کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کم سے کم ایک ماول اور ایک طویل نظم اور اپنی سوانح ضرور لکھوں گا۔ ملک الموت سے مجھے بس اتنی مہت درکار



ہے مگر وہ کسی کی کہاں سنتا ہے۔“ (243)

ندیم کی مانگ یہ بھی ہے کہ:

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذنِ کلام  
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں  
اور اُن کی یہ بھی تمنا ہے کہ:

گل ترے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں  
اسی رشتے میں ہر انسان کو پرونا چاہوں  
ساتھ ہی ہمارے اس دانش ور درویش نے یہ بھی بتا رکھا ہے کہ:

”قدرت نے دیانت اور محبت کو میرے وجود میں خون کی طرح رواں رکھا ہے۔ سو میں  
ذہنی اور روحانی طور پر بھلائی آسودہ شخص ہوں۔ بعض تشنہ آرزوؤں کے باوجود آرزو کرنا  
انسان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آرزو کا پورا ہونا ضروری  
نہیں۔“

یہ بھی واضح کر دوں کہ بعض ہم عصروں کی طرح میں نے انسانوں کو دوسرے درجے کی  
مخلوق سمجھی نہیں سمجھا۔ میرے نزدیک تو انسان ہر مخلوق سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی  
طرح میں نے انسان کے بہر صورت مرجانے کے دکھ سے خوف زدہ ہو کر انسانی زندگی  
کو لایعنی اور بے معنی سمجھی قرار نہیں دیا کیوں کہ میرے نقطہ نظر کے مطابق تو جہاں سے  
شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے اور یہ تسلسلِ حیات بنی نوع انسان کی فنا کی نفی  
کرتا ہے۔“ (244)

اور سول سروس اکیڈمی لاہور کے طلباء سے گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ:

”آرزو اگر تھی تو یہ تھی کہ میں انسانی برادری کو بے احتیاج دیکھوں اور وہ کسی کی محتاج نہ  
ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وقت ضرور آئے گا جب ہر انسان باوقار قرار پائے گا۔“ (245)

وہ وقت آئے گا چاہے آج آئے، چاہے کل آئے  
جب انسان دشمنی، اپنے خدا سے دشمنی ہو گی!

## مدتیم اداسی:

بڑوں کے دکھ بھی بڑے ہوتے ہیں۔ مدتیم ان کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتے آئے تھے کیوں کہ ایک تو وہ بے حد جانتیت پسند تھے اور دوسرا ان سے پیار کرنے والے بہت تھے۔ البتہ آخری آٹھ دس برسوں میں پیار کرنے والوں کے وسیع دائرے کے اندر چاہنے والوں کی ایک اور تنگ سی چار دیواری بن گئی جس میں انھیں محدود کر کے رکھنے کی اور ایک طرح سے تنہا کر دینے کی کوشش کی گئی۔ وہ یہ سب بھی اچھی طرح جان گئے تھے۔ اس لیے ظاہر کیے بغیر دیکھی تھے۔

احمد عقیل روبی نے کہا:

”میری نظر میں احمد مدتیم قاسمی کے اندر چھپے بیٹھے اس کشتہ رنج عالم پر ہے وہ ازل سے دکھ جھیلنے والا آدمی ہے۔ جو کچھ نہیں کہتا۔ اس کا دکھ مدتیم صاحب کے رگ و پے میں خون کی طرح سرایت کر گیا ہے۔ ایک ایسا دکھ جس کے بارے میں انگریزی شاعر بازن نے کہا تھا:

"A PAIN WHICH IS CONSUMING MY BONES" یہ ایک ایسا دکھ ہے، فن کار جس کا اظہار ساری عمر نہیں کرتا۔ اظہار کے مختلف پیرائے میں سب کچھ تو کہہ دیتا ہے لیکن اصل پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ ساری عمر خود اس دکھ کی دھیمی دھیمی آگ میں جلتا رہتا ہے..... (اظہار) میں کبھی سماجی اور معاشرتی دیواریں اس کا راستہ روک لیتی ہیں اور کبھی اسے کوئی محرم راز نہیں ملتا اور وہ شاہ حسین کی طرح بے چین رہتا ہے۔ ”مائے فی میں کیوں آکھاں“ احمد مدتیم قاسمی دکھ کی یہ دھونی اپنے ساتھ ساتھ لے کر پھرتے ہیں مگر مجال ہے اس کی آنچ دوسرے تک پہنچے۔“ (246)

مسعود اشعر بتاتے ہیں کہ:

”قاسمی صاحب کے اور بھی غصے ہم نے دیکھے مگر جس غصے نے انھیں آخری عمر میں بہت تنگ کیا، وہ مجلس ترقی ادب کی عمارت کے سلسلے میں تھا۔ یہ غصہ انھیں اس وقت آیا جب نظریہ پاکستان کے ٹھیکیداروں نے نرسنگھ داس گارڈن کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے نرسنگھ داس گارڈن کی اہمیت اور اس کی خوبصورتی کا خیال کیے بغیر اس پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی اور ایک دن انھوں نے مال روڈ کے ساتھ ملنے

والے باغ کے حصے پر قبضہ بھی کر لیا اور وہاں عمارت بنانا شروع کر دی۔ قاسمی صاحب اس کے خلاف کھڑے ہو گئے، اُن کی مخالفت اصولی تھی لیکن حکومت اپنے اقتدار کے نشے میں سب کچھ بھول چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کوٹھی کے ساتھ قاسمی صاحب کا اپنا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا۔ وہ تو ایک اصول کے لیے لڑ رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی نوکر شاہی قاسمی صاحب کے خلاف ہو گئی۔ بھلا افسر یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان کے راستے کی رکاوٹ بنے اور افسر حکومت کے ملازم ہوتے ہیں، جو بھی اقتدار میں ہو گا وہ اسی کی مانیں گے۔ اس لیے میرا تو خیال یہ ہے کہ بعد میں مجلس ترقی ادب کی سربراہی کے سلسلے میں سرکاری افسروں نے قاسمی صاحب کو جس طرح تنگ کیا، اس کی وجہ بھی یہی تھی۔“

”اب جہاں تک مجلس ترقی ادب کی سربراہی کا قصہ ہے وہ ایک سیدھا سادا معاملہ تھا۔ مجلس کا سربراہ تا حیات سربراہ ہوتا ہے۔ بُری یا بھلی، یہ ایک روایت ہے۔ آخر سید امتیاز علی تاج اور پروفیسر جمید احمد خان تا حیات سربراہ رہے تو اب یہ روایت کیوں توڑی جا رہی ہے؟ یہ انتہائی تکلیف دہ صورت حال تھی جس کا سامنا قاسمی صاحب کو آخری عمر میں کرنا پڑا اور یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی طبیعت مستقل خراب رہنے لگی تھی۔ اس تنازع نے ان کی صحت پر اور بھی برا اثر ڈالا۔“ (247)

ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں:

”قاسمی صاحب کو دکھوں، پریشانیوں، آزر دگیوں اور دل آزاریوں کا خاصا حصہ ملا لیکن انھوں نے ان سب کو اپنے باطن میں چھپائے رکھا، کسی دوست یا ملاقاتی کے سامنے کبھی بھی شکوہ سنچ ہوئے نہ تلخ گفتار۔“ (248)

ظاہر ہے اس طرح ایک بے حد حساس شاعر کو دوہرے دکھ سہنا پڑے۔

علی اصغر عباس لکھتے ہیں:

”انھوں نے تمام عمر انسانوں ہی سے نہیں، ان کی خطاؤں سے بھی پیار کیا۔ وہ کبھی کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کے ناک میں دم کر رکھا تھا مگر ان کو بھی کچھ نہیں کہا اگر اظہار کیا بھی تو سنبھلے لفظوں میں۔“ (249)

حمید احمد سیٹھی کا کہنا ہے:

”خوش ہوتے تو ان کی نظریں بھی بولتی تھیں، تکلیف، تنگی اور غصے میں بھی پریشانی کا اظہار نہ کرتے۔ انھیں دکھ تھا کہ کچھ عرصہ قبل بعض سرکاری افسروں نے انھیں بھی گریڈوں میں تو لنے کی کوشش کی حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے مقام اور مرتبے تک تو سرکاری گریڈ ہی ختم ہو جاتے تھے۔“ (250)

مسعود مفتی بتاتے ہیں:

”جون 2006 کا مہینہ۔ دوپہر کا وقت۔ اپنا نیا افسانوی مجموعہ ”توبہ“ پیش کرنے کے لیے جب میں قاسمی صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ بالکل اکیلے بیٹھے تھے۔ بہت ہی نحیف و لاغر۔ جیسی آواز۔ مگر چاق و چوبند، فون پر بھی اور میرے ساتھ گفتگو میں بھی۔ کتاب کے مندرجات کی فہرست پر نظر دوڑائی تو کہنے لگے ”ان میں سے بیشتر تو ”فنون“ میں شائع ہوئے تھے۔“ پھر بولے ”آپ کو میرا خط مل گیا تھا نا!“ کہنے لگے۔ ”یہ افسانہ ”آسیب“ پڑھ کر میرے تو رو گئے کھڑے ہو گئے تھے۔“ میں نے کہا ”یہ اس لیے ہوا کہ آپ کے رو گئے ابھی قائم ہیں۔ ورنہ قوم کے رو گئے تو عرصہ سے غائب ہو چکے ہیں۔“ سر ہلا کر بولے ”واقعی! ہم جیسے لوگ جنہوں نے تحریک پاکستان کا جوش اور ولولہ دیکھا ہے۔ اب حیران ہوتے ہیں کہ یہی قوم پچاس ساٹھ برس میں اتنی بے حس کیسے ہو گئی!“

”پچھلے بیالیس برس کے دوران میں نے ان کے لہجے میں درد کی یہ شدت اور شکایت کا یہ انداز کسی بھی بات پر کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر لامحدود بے بسی اور کرب کے تاثرات دیکھ کر مجھے لگا جیسے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اسی دم بالکل اسی انداز میں میرے افسانے کا مرکزی کردار بن گئے تھے۔“ (251)

شبیم کلیل لکھتی ہیں:

”دنیا میں اہل دل نایاب ہوتے چلے جا رہے ہیں..... جب یہ احساس شدت اختیار کر لیتا ہے تو قاسمی صاحب کے پاس جا بیٹھتی ہوں۔ اپنے کہنے کے لیے۔ اپنے مسائل انھیں جا کر سنا آتی ہوں۔ وہ میری بات سن لیتے ہیں۔ خدا جانے میرے علاوہ اور کتنے لوگ اپنے دکھ درد ان کو جا کر سناتے ہیں اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے واپس آ جاتے



ہیں۔ میری طرح سے شاید اور بھی بہت سے ایسے ہوں گے جنہیں یہ احساس کبھی نہیں ہوا ہوگا کہ قاسمی صاحب کے اپنے دکھ درد بھی ہوں گے، ان کے اپنے مسائل بھی ہوں گے۔“ (252)

کشورنا ہید کہتی ہیں:

”مجھے یہ بات کبھی نہیں بھول سکتی کہ جب قاسمی صاحب مجلس ترقی ادب کے نگران بنے تو انھیں اڑھائی ہزار روپے معاوضہ ملا تھا، وہ اُن کے رکشے کے کرائے پر ہی خرچ ہو جاتا اور (ایک موقع پر) انھوں نے جب عملے کو بوس کی رقم دلوائی تو اُن کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔ اس تکلیف دہ رویے کے باعث انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر انھیں بار بار رکھا گیا کہ وہ دوبارہ آجائیں۔ پہلے تو وہ نہ مانے لیکن پھر بڑی مشکل سے راضی ہوئے۔“ (253)

افضل تو صیف اپنے خیالات کو یوں بیان کرتی ہیں:

”ندیم قاسمی! افسر بننے کی بجائے شاعر ہو گئے، ادیب ہو گئے، ترقی پسند ادب کے مضبوط رکن اور تخلیق کار۔ پھر جب یہ نئی ریاست وجود میں آئی تو بھی جو زخم زخم زندگی انھوں نے دیکھی ہوگی۔ اس کے لیے لکھا پھر بندش ورقید و بند کے زمانے، گھٹن کا ماحول، ادھوری زندگی مگر احمد ندیم قاسمی نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو اظہار دینے کے لیے راستے نکالے اور نکالتے ہی رہے۔ شاعری، کہانی، مضمون، کالم، تحریر، تقریر، ریڈیو، ٹی وی سب کچھ۔“ (254)

عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں:

”میں نے انھیں دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تو دیکھا لیکن اپنی کوئی پریشانی، اپنے احباب کو منتقل کرتے کبھی نہیں پایا۔“ (255)

حسن ثار نے لکھا:

”میرا احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ عجیب سا رشتہ رہا۔ انھیں اندازہ تھا کہ میرے دل میں ان کے لیے عقیدت تھی۔ جواباً وہ مجھے ہمیشہ اپنی محبت سے نوازتے۔ پھر ایک مرحلہ پر سرکاری سطح پر اُن کے ساتھ نا انصافی اور زیادتی ہوئی۔ اہل فن، اہل دل، اہل دماغ نے احتجاج کے لیے ”شیزان“ میں اکٹھے رکھا اور مجھے بھی مقررین میں شامل کر لیا۔ بہت

سے شرکاء تھے میں نے تقریر تو خاک کرنا تھی، صرف اتنا کہا کہ: ”اگر احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ ان کے شایان شان سلوک نہ کیا گیا تو میں خود سوزی کی حد تک جاؤں“ (256) “I MEAN IT”

ندیم صاحب کے بھتیجے محمد حیات قاسمی ایڈووکیٹ نے بتایا کہ:

”چچا جان (احمد ندیم قاسمی) کو عمر کے آخری برسوں میں، اُس وقت ایک سخت دکھ سہنا پڑا جب اُن پر ایک غلط الزام لگایا گیا۔ کہاں چچا ندیم اور کہاں کسی آمر حکومت سے ذاتی مالی فواد حاصل کرنے کے لیے درخواست کرنا! اٹھاسی برس کا بزرگ ادیب اور رہنما جس نے تمام عمر بڑی بہادری اور محنت سے پاکیزگی اور دیانتداری کے ساتھ گزاری ہو، کچھ اچھا ل دینا ظلم ہے اور یہ ظلم اُن کی اپنی اہل قلم برادری کے ہاتھوں ہوا۔ ایک ادبی رسالے کے مدیر نے اپنے ادارے میں یہ بہتان باندھا۔ اس کی خبر اخبارات کے ذریعے پوری دنیا میں پھیل گئی۔ چچا ندیم کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے بہت سے افراد کو اس الزام تراشی پر بہت غصہ آیا۔ خود ہمارے خاندان والوں اور بالخصوص بزرگوں نے کہا کہ ہم سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ تم مقدمہ کر دو۔ میری توقع کے مطابق، اکثر درگزر کر دینے اور معاف کر دینے والے چچا ندیم نے اس مشورے کی مخالفت کی۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ آکر معافی مانگ لے گا لیکن وہ تو اس کے بعد بھی غلط بیانی کرنے میں لگا رہا۔ تب خاندان کے بے حد اصرار سے مجبور ہو کر چچا جان مان گئے اور یوں 13 جنوری 2005 کو ہم نے ڈیفامیشن ایکٹ 2004 کے تحت مقدمہ دائر کر لیا۔ مدعی (چچا جان ندیم) کی طرف سے وکلاء پینل میں میرے ساتھ ندیم الدین ملک، ہر دارا ایم ایس طاہر اور محمد سہیل ٹیپو پیش ہوئے۔ یہ مقدمہ مختلف طویل قانونی و عدالتی مراحل سے گزرا۔ مخالفین کو بھی عدالت نے دفاع کرنے کے لیے مواقع دیئے لیکن وہ چچا جان پر لگائے الزام ثابت نہ کر سکے اور آخر 28 فروری 2006 کو جناب سلطان احمد ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کی عدالت سے چچا ندیم کے حق میں فیصلہ دیا گیا۔ جب کہ مدبر مذکور کو پچاس لاکھ روپے بطور ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ چچا ندیم کی شرافت اور بھلائی دیکھیے کہ اس کے بعد بھی چچا کو موقع تھی کہ وہ مدیر اب

کم از کم اپنے رسالے ہی میں غلط باتوں اور الزام تراشی کا اعتراف کر لے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔“ (257)

دانش ور اور کالم نگار ہارون رشید لکھتے ہیں:

”احمد ندیم قاسمی کا اپنا قبیلہ (شاعر، ادیب، صحافی) ایک چڑیل کی طرح اُن کا کلیجہ نوچنے اور چبانے کی کوشش کرتا رہا اور وہ زندہ رہے احمد ندیم قاسمی کوئی باغی نہ تھا مگر در یوزہ گر بھی نہیں:۔  
ہے دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم

سب جا رہے ہیں جا پ درتو مگر نہ جا  
”شہرت کی طرح اس کا رزق بھی اس کے قلم اور ہنر کی عطا تھی۔ اللہ کی عطا، جو لوگ یہ بات نہیں جانتے، وہ کچھ نہیں جانتے..... احمد ندیم قاسمی ان لوگوں کے درمیان جیسے مگر وہ اُن میں سے ایک نہیں تھے۔“ (258)

جب کہ ندیم اپنی ذات کی بجائے دوسروں کے لیے اُداس ہیں۔ کہتے ہیں:  
”میں نے شدید حالات میں بھی نہایت مطمئن زندگی گزاری ہے۔ دراصل میں نے جو کچھ لکھا ہے اور جو کام کیے ہیں وہ اپنے ضمیر کی رہنمائی میں کیے ہیں اور ضمیر کی اطمینان سے بڑی نعمت کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے اگر کوئی قلق ہے تو صرف یہ کہ انسانوں کو ان کا وقار واپس نہیں مل رہا اور کڑھ ارض کی ہر حکومت انھیں بے وقار کیے جا رہی ہے۔“ (259)

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی  
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

(ندیم)

اور فتح محمد ملک نے اپنے ندیم کے بارے میں اپنا ایک احساس اس طرح بیان کیا کہ:  
”مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی کے آخری سال بہت دکھی گزرے ہیں۔ وہ اس دنیا سے خوش خوش رخصت نہیں ہوئے۔ کیا ہمیں اپنے چلن پر غور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اتنے دکھی کیوں ہو گئے تھے۔“ (260)

## مدّیم کا آخری عرصہ حیات:

گوچ کے حکم کا امکان ہے ہر ہر لمحہ  
روز اول سے بندھا رکھا ہے بستر اپنا

(مدّیم)

ڈاکٹر خورشید رضوی بتاتے ہیں:

”تین جولائی 2006 کی اُس ملاقات کا تصور آج بھی میرے ذہن میں جوں کا توں ہے۔ وہ کمرہ آج بھی ویسا ہی ہے اور قاسمی صاحب اپنی نشست پر اُسی طرح بیٹھے ہیں۔ ضعف پیری کے باوجود گفتگو اور حاضر دماغ۔ اُس روز بھی وہ ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اُنھوں نے بتایا کہ ”صحت کے نشیب و فراز اب بہت غیر یقینی سے ہو گئے ہیں۔ کسی بھی وقت اچانک ہسپتال جانا پڑ جاتا ہے۔ سانس کی آمد و رفت بحال ہو جاتی ہے تو واپس آ جاتا ہوں۔ خیر آج تو بالکل ٹھیک ہوں“ اُس آخری جملے میں وہ پرانے قاسمی صاحب لوٹ آئے جو ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں..... آخر آخر میں البتہ اتنا فرق آگیا تھا کہ جب صحت کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے: ”بس جیسی اس عمر میں ہونی چاہیے۔ الحمد للہ میں ٹھیک ہوں۔“

”(تخصّص کی تکلیف پریشان کرنے لگی تھی لیکن) وہ مشاعروں میں شروع سے آخر تک آلتی پالتی مارے، بغیر ٹیک لگائے، سیدھے بیٹھے رہتے تھے۔ اُنھتے ہوئے کسی کا سہارا لینا بھی پسند نہ تھا۔“ اور بھی تصویریں اُمّی چلی آتی ہیں..... ان قاشوں سے جڑ کر ایک بڑی تصویر بنتی ہے جو ذہانت، تخلیقیت، محنت، دیانت، انسانیت، رواداری، دردمندی، ہمدردی، بذلہ بخشی اور رجائیت کے آمیز سے عبارت ہے۔

”قاسمی“ صاحب ایک انتھک انسان تھے۔ وہ آخری زمانے تک دن بھر محنت میں لگے رہتے۔ وقت کی تنظیم (TIME MANAGMENT) کا اُن میں فطری ملکہ تھا۔ وہ مصروف نظر آئے بغیر مصروف رہ سکتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ لطیفوں اور خوش گپیوں کے عین درمیان، جہاں اہل محفل ذرا دیر کو باہمی مکالمے میں مصروف



ہوئے، قاسمی صاحب نے اُسی طائرانہ جہلت کے ساتھ، میز پر بکھری ہوئی چیزوں کو ترتیب دے لیا۔ ڈاک پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی صف بندی کر لی اور شاید ایک آدھ خط کا مختصر سا جواب بھی لکھ ڈالا۔“ (261)

”قاسمی صاحب کا دل گویا ایک ورلڈ بینک ہے۔ جس میں ان گنت لاکر بچے ہوئے ہیں اور ہر ایک میں ایک اور صرف ایک شخص کا سرمایہ تعلق محفوظ ہے اور اس بینک کا نظام گویا کمپیوٹرائزڈ ہے۔ ادھر کوئی شخص سامنے آیا ادھر فی الفور اس کا مخصوص اثاثہ کھلا۔ یہ زندہ کمپیوٹر ان اثاثوں کو کبھی خلط ملط نہیں ہونے دیتا۔ اس دور میں گرد و پیش کی اتنی درست اور ایسی QUICK APPRAISAL بھی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔“ (262)

مسعودا شعر نے تحریر کیا ہے کہ:

”میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اُن سے آخری ملاقات ہوگی۔ میں اور کاظم صاحب حسب معمول انھیں سلام کرنے مجلس ترقی ادب کے دفتر گئے تھے۔ ہم مہینے میں ایک دو بار ان کے پاس ضرور جاتے۔ نہ جاتے تو ان کا فون آ جاتا۔ وہ شکایت کرتے کہ کتنے دن سے نہیں آئے تم، خیریت تو ہے؟ تمام کڑوی کیلی باتوں کے باوجود ان کے مزاج میں کوئی کڑواہٹ نہیں آئی تھی۔ ہم جب بھی اُن کے پاس جاتے، وہ اسی خوش گوار موڈ میں نظر آتے۔ ان کا ہنسی مذاق اور ان کے لطیفے اسی طرح چلتے رہتے لیکن اس دن وہ واقعی بہت بے چین تھے۔ فراز نے ہنسی مذاق کرنے کی کوشش بھی کی مگر اُن کے چہرے سے پریشانی دور نہیں ہوئی۔ وہ بار بار کرسی سے اٹھنے کی کوشش میں تھے اور آخر وہ کھڑے ہوئے، کہنے لگے: ”آپ لوگ بیٹھیں، میں ڈینٹل سرجن کے پاس جا رہا ہوں۔“ اور وہ چلے گئے، میرے دماغ پر وہ منظر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا جب وہ ذرا سے جھکے ہوئے اپنے کمرے سے باہر جا رہے تھے۔“ (263)

مقصودا الہی شیخ نے لکھا ہے:

”انہوں نے عمر عزیز (توے سال) کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ جوانی میں باشعور انسان

محنت کرتے ہیں، کر سکتے ہیں مگر بڑھاپے میں جب قویٰ مضحمل ہو جاتے ہیں، قلب و ذہن متاثر ہو جاتے ہیں، ہوش و حواس میں رہ کر تخلیقی کام کرنا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب وہ خوش نصیب انسان ہیں جو آخر وقت تک ہوش و حواس میں رہے۔“ (264)

فتح محمد ملک کے خیال میں:

”وہ ایک عجب نشاط کے عالم میں موت کے لیے خود کو تیار کرنے میں مصروف تھے۔ ندیم مرنے کو مٹنے کے مصداق نہیں مانتے اور بڑے یقین کے ساتھ اعلان کرتے ہیں:

میں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں  
میں شمع بن کے بجھوں، آفتاب بن کے جلوں“ (265)

شکیلہ رفیق بتاتی ہیں کہ:

”اتفاق سے ابھی چند روز قبل ہی میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ آواز کم زور تھی مگر ارادے، ویسے ہی تو انا! انھیں زندگی گزارنے کا فن آتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور اسے بھرپور طور سے برتا، جس کا ثبوت، ان کا آخری کالم ہے جو 7 جولائی، 2006 کو شائع ہوا۔“ (266)

ڈاکٹر خالد عبدالکریم لکھتے ہیں کہ:

”وہ دسمے کے مرض کی شدت کے باوجود بیماری کے سامنے سینہ سپر رہے اور اپنی زیر دست خود اعتمادی کے بل پر نہ صرف ادبی محافل کی رونق بڑھاتے رہے بلکہ تخلیقی اعتبار سے بھی شادابی ذہن کے ساتھ اردو ادب میں گراں قدر اضافے کرتے رہے۔ انھوں نے آخر وقت تک خود کو اتنا مستعد اور فعال رکھا کہ وفات سے چند روز قبل تک مجلس ترقی ادب کے دفتر میں کام میں مصروف رہے۔“ (267)

بالاکوٹ سے ہارون الرشید نے لکھا ہے کہ:

”اس سال جنوری میں لاہور گیا۔ ان کے دفتر کے باہر چڑا اسی کھڑا تھا اس نے اندر جانے سے منع نہیں کیا۔ بابا بڑی محبت اور شفقت سے ملے۔ میں اُن سے بغل گیر ہوا تو یہ دیکھ کر کانپ گیا کہ ان کا جسم کم زور لگ رہا تھا، البتہ اُن کے چہرے پر وہی لازوال

مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے کہا: ”بابا! آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔“ کہنے لگے: ”کوئی بات نہیں بس دُعا کریں۔“ (268)

عرفان جاوید تفصیل بتاتے ہیں کہ:

”میں بغیر دروازہ کھٹکھٹائے ان کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ کوئی مسودہ پڑھنے میں منہمک تھے۔ وقت اس کمرے میں تھم چکا تھا۔ قاسمی صاحب سر جھکائے کسی مسودے میں گم تھے۔ یہ ایک قدیم طرزِ تعمیر والا وسیع کمرہ تھا۔ اونچی چھت اور روشن دانوں والا کمرہ، کمرے میں قدامت کی ایک مقدس باس تھی، دائیں جانب ایک کھڑکی تھی، جو ایک سرسبز باغیچے میں کھلتی تھی۔ پرندوں کی چچہاہٹ کی نغمگی کمرے میں نرم زم زم موسیقی کی صورت آتی تھی مگر یہ سب اُن کے استغراق میں حائل نہ ہو رہا تھا۔ میں زور سے کھٹکھٹا رہا۔ اس پر قاسمی صاحب نے مسودے سے نظریں اٹھائیں اور مجھے دیکھا۔ یک دم شناسائی اور مسکراہٹ ایک شفیق روشنی کی طرح ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ کچھ دیر مسکراتے رہے پھر بولے: ”آپ تو بالکل ہی لاپتہ ہو گئے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ خیریت ہو۔ پہلے تو بہت باقاعدگی سے رابطہ تھا مگر اب کافی دنوں کے بعد تشریف لائے ہیں۔“ یہ تاریخ تھی جولائی کی چار اور سن تھا 2006 اور پھر 8 جولائی کو انتہائی نگہداشت وارڈ میں، میں فرطِ عقیدت سے اُن کے قریب ہوا اور اُن کے ہاتھ کو چوم لیا۔ اُنہوں نے مضبوط گرفت کے ساتھ میرے ہاتھوں کو دبایا اور ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر تازہ صبح کی مقدس روشنی کی طرح پھیل گئی۔“ (269)

”فنون“ کے کمپوزر اپنے مشاہدات یوں بیان کرتے ہیں:

”اگرچہ قاسمی صاحب کا تعلق کتابت کے دور سے تھا مگر وہ کمپیوٹر سے جلد ہی ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ اُس کی تمام فنی باتوں کو وہ اس طرح سمجھ لیتے تھے جیسے وہ کمپیوٹر چلانا جانتے ہوں۔ حالاں کہ وہ کس نفسی سے یہی کہتے رہے کہ میں کمپیوٹر کے دور کا نہیں ہوں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کمپیوٹر کے دور سے بھی آگے کے تھے۔

”سب سے بڑھ کر حیرت اس بات پر ہوتی کہ وہ ضعیف العمری میں بھی نوجوانوں کی طرح کام کرتے تھے اور کبھی ہمت نہیں ہارتے تھے۔ اپنے آخری ایام زندگی میں بھی وہ

اُسی طرح کام کرتے رہے تھے۔ آپ بے شمار خطوں کے جواب روزانہ لکھتے۔ حتیٰ کہ آخری پیام میں بھی آپ نے کئی خط لکھے۔ قاسمی صاحب صبح سے لے کر شام تک دفتر میں موجود رہتے۔ کبھی مجلس کے دفتر میں تو کبھی ”فنون“ کے دفتر میں مگر حیرت ہوتی جب وہ دیگر مسودوں کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقات کے مسودے بھی میرے حوالے کر دیتے۔ میں اکثر سوچتا کہ صبح سے شام تک وہ دفتر کی ہنگامہ آرائیوں میں اُلجھے رہتے ہیں، پھر کون سا وقت ہے جب وہ رُسکون ہو کر اپنی تخلیقات کے لیے وقت نکال پاتے ہیں!

”فنون کے دفتر میں سب سے عمدہ وقت وہ ہوتا جب سب لوگ چائے کے لیے اُن کے کمرے میں اکٹھے ہوتے۔ شام کی چائے قاسمی صاحب تمام سٹاف کے ساتھ پیتے تھے۔ اس وقفے میں وہ اپنی زندگی کے نہایت دلچسپ واقعات، لطیفے اور چٹکے سناتے اور سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہتے۔ قاسمی صاحب خود صرف مسکراتے تھے اور دوسروں کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے نہ چاہتے ہوئے بھی چائے کا یہ وقفہ ختم ہو جاتا مگر اُس وقت تک ہم بالکل تازہ دم ہو چکے ہوتے۔“ (270)

عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں:

”رمضان کا مہینہ ہے۔ میں لاہور میں ندیم صاحب کے دفتر جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ بیٹھے سلا دکاٹے رہے ہیں۔ میں حیران ہو کر پوچھتا ہوں کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ندیم صاحب بتاتے ہیں: میرے ایک پارسی دوست فیروز سنز میں کام کرتے ہیں۔ سارا شہر بند ہے۔ وہ بوڑھے آدمی ہیں۔ میں ان کے لیے کھانا گھر سے لایا ہوں اور اب ان کے لیے سلا دکاٹے رہا ہوں۔“ (271)

بھارت سے ڈاکٹر کیول دھیر نے لکھا ہے کہ:

”20 مئی 2006“ کی صبح کو ہم لاہور میں اُن کے روبرو تھے، عمر اور علالت کا اثر اُن کے چہرے پر نمایاں تھا لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اور آواز کی کھنک ان کے حوصلے کو نمایاں کر رہی تھی۔“ (272)

سلمیٰ افتخار صدیقی جو محکمہ اطلاعات و ثقافت پنجاب میں ایک افسر ہیں، لکھتی ہیں:

”اپنی تعیناتی کے دوران مجھے شدت سے ان رویوں کی بد صورتی کا احساس ہوا جو سر



کاری ادارے قاسمی صاحب جیسے لوگوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ شخص جس نے اردو زبان و ادب کی تہذیب کی، جس نے بے شمار لکھنے والوں کی کھیپ تیار کی، اپنی بیش قیمت تحریروں کا سرمایہ دیا، جو کئی نسلوں کے لیے آئندہ بھی مفید رہے گا۔ اُس کے ساتھ ہم نے کیسے ماروا روئے اختیار کیے۔ ذکر کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔“

”اپنی ملازمتی ذمہ داریوں کے دوران مجھے فائلوں میں قاسمی صاحب کی محکمہ کے ساتھ خط و کتابت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میں سوچا کرتی تھی کہ حساس اور باشعور قاسمی صاحب ان بے حس، بے رحم اور بے تہذیب باتوں سے کس قدر دل برداشتہ ہوتے ہوں گے لیکن وہ تو ان باتوں سے کہیں بلند ہیں۔ انھوں نے ان خطوط میں نہایت نپے ٹیلے پر وقار انداز میں مجلس ترقی ادب کی ضروریات کا ذکر، کام کی روداد، مسائل کے حل میں دیر پر مہذب لفظوں میں ہلکی فہمائش اور آخر میں آئندہ غلطی نہ ہونے کی امید کا اظہار۔ کوئی الجھاؤ نہیں کوئی ہیر پھیر نہیں، اور کوئی غیر ضروری بات بھی نہیں۔ ان خطوط کے مضبوط، جرأت مندانہ اور مہذب لہجے کی اہمیت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے بڑے بڑے ناموں کو ہاشما کی خدمت میں حاضری لگاتے اور سرکاری اداروں کی ناخلفی کا انتہائی نامناسب الفاظ میں رونا روتے دیکھا ہو۔ یہاں تو نہایت سمجھ داری اور اعتماد کے ساتھ صورت حال کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔ وجہ قاسمی صاحب کا حق پر ہونا تھا۔ ان خطوط کو پڑھنے کے بعد میرے دل میں وہ خلش تو نہیں رہی جو قاسمی صاحب اور ہمارے محکمہ کے درمیان کسی ناخوش گوار صورت حال کے بارے میں سن کر پیدا ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی ایک عجیب سا احساس جرم برقرار رہا کہ میں بھی اُسی قبیلے کا فرد ہوں جو قاسمی صاحب کا مجرم ہے۔ اسی دوران وہ بیمار ہوئے تو میں شدید خواہش کے باوجود نہ جاسکی کہ میں تو اُن کے پاس بیٹھ کر رونا شروع کر دوں گی اور روتی ہی رہوں گی۔“ (273)

رضوانہ سید علی حیرت کا اظہار کرتی ہیں کہ:

”آخری وقت تک ان کی توانائی اور شگفتگی اس حد تک برقرار تھی کہ زندگی کے آخری ہفتے میں بھی اخبار میں اُن کا کالم موجود تھا۔“ (274)

ندیم صاحب کی بیٹی ڈاکٹرناہید قاسمی نے بتایا کہ:

”2006 کے ماہ جون نے احمد ندیم قاسمی جیسے عظیم کہسار کو زیادہ تر زلزلے کی سی حالت میں رکھا۔ سخت گرمی اور بار بار کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ابا جی کی سانس کی تکلیف کا دورانیہ ذرا زیادہ اور ٹھیک رہنے کا وقفہ کچھ کم ہوتا گیا۔ ڈاکٹر محمود ناصر ملک، ہسپتال، گھرا ایک دائرہ سا بن گیا۔ اس دائرے کا ایک اہم سٹاپ دفتر بھی تھا۔ وہاں کے معمولات میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ کام، کام اور کام ساتھ ساتھ مسلسل جاری رہا۔ اس دوران انھیں اپنوں کے سکھ دکھ کا بھی خیال رہا، سال گرہوں پر مبارک دینا بھی یاد رہا اور وہ عزیزوں دوستوں کی مزاج پر سی بھی کرتے رہے۔ وہ کلینک میں تھے مگر اپنی طبیعت کے پورے ٹھیک نہ ہونے کے باوجود اپنی بھابھی (ہماری ثانی صاحبہ۔ مسز ایم۔ بی پیرزادہ) کی تدفین میں شرکت کے لیے میرے بھائی نعمان اور مجھے 29 جون کو وادی سون سکیسر کے دور دراز گاؤں ”انگٹہ“ بھیجا، ہم اسی روز واپس آ گئے تو ابا جی کو بہت بہتر پا کر تسلی ہوئی۔ اس سارے عرصے میں وہ جب بھی بہتر محسوس کرتے، دفتر چلے جاتے اور اپنے کاموں میں لگ جاتے لیکن جمعرات 6 جولائی کو وہ دفتر سے خلاف معمول جلد لوٹ آئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ گھر پر آکسیجن اور نیبو لائزر کا انتظام تھا۔ اس کے استعمال سے افاقہ محسوس کیا۔ ہمارے اصرار پر انہوں نے جمعہ اور ہفتہ کو چھٹی کر لینے کا ارادہ تو کر لیا لیکن کہا: ”میں گھر پر بھلا کیا کام کروں گا بیٹی؟“ میں نے کہا: ”ابا جی مجھے کالج سے چھٹیاں ہیں۔ آپ کی میز پر اور شیلڈ پر بہت سے کاغذ اور خطوط اکٹھے ہو گئے ہیں۔ ہم باپ بیٹی آپ کے کاغذات ترتیب دیں لیں گے۔“ دراصل ابا جی جیسے ہمہ جہت فن کار کے کاموں کے بہت سے سیکشن تھے جب کہ بے ترتیبی انھیں پسند نہیں تھی۔ جمعہ کو ابا جی نے اپنے نئے مجموعہ کلام اور شخصی خاکوں پر مشتمل اپنی نئی کتاب (”میرے ہم سفر“ کی دوسری جلد عنوان ”میرے ہم قدم“) کے مسودے اپنے بیگ سے نکالے۔ ان کے پروف چیک کیے۔ فہرستیں بنوائیں اور کہا: ”اب یہ پرنٹنگ کے لیے تیار ہیں۔ صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ میرا کوئی کالم یا اہم مضمون ان میں شامل ہونے سے رہو نہیں گیا۔“ دن بھر قابل رشک اور قابل فخر قوت

ارادی نے ان کا بہت ساتھ دیا۔“

”(لیکن طبیعت رات کو پھر خراب ہو گئی۔ نہ سنبھلنے پر ہم انھیں ہفتے کی صبح ہسپتال لے گئے۔) ہسپتال میں ڈاکٹرز کی بھرپور توجہ سے اتوار کو باجی خاں سنبھل گئے۔ مجھے بس یہ لگا کہ باتیں کرتے وقت انھیں ذرا زور لگانا پڑتا تھا۔ ورنہ ان کے کسی بھی عمل سے کمزوری ظاہر نہ ہو رہی تھی۔ اُن کے دوست احباب اُن کی مزاج پر سی کے لیے آتے رہے اور وہ ان سے بھرپور انداز میں نہ صرف ہاتھ ملاتے رہے بلکہ مختلف موضوعات پر گفتگو میں بھی شامل رہے۔ (اُن کے پاس ایک وقت میں دو افراد کے رکنے کی اجازت تھی اور جو باہر انتظار کر رہا ہوتا اُس کی بھی انھیں فکر ہوتی) وہ رات تک ہمیں ہنسانے کے لیے پُر لطف باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے گھر سے آیا کھانا بھی رغبت کے ساتھ کھایا۔ ہمیں تسلی تھی کہ بس ایک آدھ دن میں وہ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائیں گے اور حسب معمول پہلے ہی کی طرح ہم انھیں ہنستا بولتا ہوا، گھر لے جائیں گے، لیکن..... لیکن ہم اب کی بار جیتے جاگتے ندیم کو گھر نہ لے جاسکے۔“

”میں نے یہ تفصیل اس لیے لکھی ہے تاکہ آپ کو بتا سکوں کہ سانس کی تکلیف کے باوجود ان کا شعور آخر تک بالکل توانا تھا، ان کا احساس مکمل طور پر زندہ اور ان کا دل اچھی طرح سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے برداشت کی انتہا کو چھو لیا۔ دبلے پتلے وجود میں ہمت، حوصلے اور حقیقت کا بہادری سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نے قوتیں بھر رکھیں تھیں۔ ایک بار بھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا نہ ہی محسوس ہونے دیا کہ وہ لچہ، بلچہ، سانس بہ سانس ہم سے دُور جا رہے ہیں۔

”سوموار 10 جولائی 2006 کی صبح کو پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کاڈیالوجی لاہور میں میرے ابا جی کو سی سی یو سے اوپر کی منزل میں آئی سی سی یو لے جانے کے لیے جب ان کے پیہوں والے بیڈ کو ہسپتال کی بڑی سی نیم قوس بناتی سلائنڈ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو شیشوں کے اس پار کھڑی رہ گئی میں، دھیرے دھیرے پکار رہی تھی۔ ”ابا جی! مینڈے آپڑیں، ابا جی!“ تب میں نے ایک انوکھا منظر دیکھا، جو میری یاد میں ہمیشہ کے لیے جم کر رہ گیا۔ میں نے امداد لودہ صبح کی ہلکی سی گلابی روشنی میں دیکھا کہ

بڑے سے صاف ستھرے سفید بیڈ پر میرے ابا جی اپنے نیلے سے گرے رنگ کے نفیس لباس میں سیدھے لیٹے تھے۔ ان کا سنجیدہ پُرسکون چہرہ میرے سامنے تھا۔ ان کے سنورے ہوئے سفید بال آہستہ سے لہرا رہے تھے۔ وہ اس وقت بہت خوب صورت، بڑے مطمئن اور بے حد پُرقار دکھ رہے تھے۔ ایک فاتح کی مانند جیسے پُرسکون نیند میں، دو تین گھنٹے پہلے کی دھیمی دھیمی بل چل کے اب آٹا رنگ نہ تھے۔ ہسپتال کا عملہ ان کے بیڈ کو سلائڈ پر اوپر کی طرف ہموار رفتار سے دھکیل رہا تھا اور ہمارے ندیم کا وجود اس زمین سے اٹھتا، بلندی کی طرف سے نیلے آسمان کے کینوس پر قوت بناتا ہوا اوپر ہی اوپر، اونچے بڑے دروازے کے پار لے جایا جا رہا تھا۔ میرا دل تو نہیں مانا مگر میں سمجھ گئی تھی کہ اس لمحے میرے اپنے بہت ہی پیارے ابا جی سکون اور اطمینان کی کیفیت میں اپنے رب کے پاس جا چکے ہیں۔ اب ڈاکٹر زعفران اپنے پیشے کا آخری تقاضا پورا کریں گے اور بس! اس پہل اپنے ابا جی سے جدائی کے شدید دکھ کی بیسیں میرے دل میں کھب گئیں۔

”آخر میں یہ کہوں گی کہ اُن سے جدا ہونے کا دکھ تو بے انتہا ہے لیکن ہم سب گواہ ہیں کہ وہ بہت ہی اچھے انداز میں نہایت بہادری اور بے حد خوب صورتی سے جیے ہیں۔ مجھے ان کی گیارہ برس پہلے کہی ہوئی ایک فکر انگیز نظم ”آؤ جینے کی کوشش کریں“ یاد آ رہی ہے۔ یہ نظم ندیم کے نئے اور آخری مجموعہ کلام ”ارض و سما“ میں شامل ہے۔

اس کے کچھ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

آؤ جینے کی کوشش کریں  
 زندگی موت کی طرح اک بار ملتی ہے  
 اک بار جی بھر کے جی لیں.....  
 .....موت آئے تو ہم زندگی کا سفر ختم کرنے کو  
 تیار بیٹھے ہوں  
 کوئی تمنا ادھوری نہ ہو  
 یعنی کچھ اور جینا ضروری نہ ہو!!“ (278)



## مدتیم کے بعد:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی  
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

.....

پر اب تیرے جانے کے بعد  
ایک ایسی کک ہے جو اُس دن سے اب تک  
مرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر وہیں رُک گئی ہے،  
وہیں بس گئی ہے  
یہ لگتا ہے اب اس کی ٹیسیں مری آخری سانس تک  
میرے اندر رہیں گی  
اگر آہ کا تیر کھینچوں بھی تو کون آگے بڑھے گا؟  
اور اپنے حسین دل پہ لے گا!  
کہ اب کون ہے جو تیری ہی طرح زخمی پوروں سے  
کانٹے چُنے  
نرم لہجے کی ریشم سی ہمدرد تھکی کامرہم رکھے  
نہیں اب ترے جیسا کوئی نہیں!!

(”تب اور اب“ ناہید قاسمی)

☆..... ”اب سے چند ماہ پہلے صورت یہ تھی کہ ہمارے ادب کے ایوان میں ایک  
شخصیت صدر نشین تھی، جس کی طرف ہم رجوع کرتے تھے، جو ہمارا POINT OF  
REFERENCE تھی۔ شاعر ایک غزل یا نظم کہہ کر، مضمون نگار ایک مضمون تیار کر  
کے، افسانہ نگار ایک نیا افسانہ تخلیق کر کے اور سیاح سفر نامہ لکھ کر اس کو بھیجتا تھا، اس  
دُبدھا کے ساتھ کہ پتا نہیں وہ چیز اس شخصیت کے نزدیک قابل قبول ٹھہرے گی یا  
نہیں۔ اور جب اُسے سند قبولیت عطا ہو جاتی تو لکھنے والے کو لگتا تھا کہ اس کے پاؤں  
ٹھوس زمین پر ہیں اور اس قبولیت کے نتیجے میں جب وہ چیز ”فنون“ میں چھپ کر

سامنے بھی آجاتی تو انگریزی محاورے کے مطابق اسے اپنے ”پہنچ جانے“ کا احساس ہوتا تھا اور وہ اپنا تخلیقی عمل جاری رکھنے کا حوصلہ اپنے اندر پاتا تھا، یہ شخصیت احمد ندیم قاسمی کی تھی۔ جن تک صرف بڑے شہروں اور ادبی مرکروں کے رہنے والے ادیبوں، شاعروں ہی کی رسائی نہ تھی، بلکہ ملک کے دورافتادہ علاقوں کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر یا ادیب بھی اپنے تخلیقی عمل یا تو ڈاک کے ذریعے یا شخصی طور پر ان تک پہنچاتے تھے اور پھر ان کے بارے میں ان کی بے لاگ رائے سے مستفید ہوتے تھے اور اس کے مطابق اپنا آگے کا رخ متعین کرتے تھے یہ شخصیت جو اردو ادب کے ایوان کے مرکزی سٹیج پر ایک عرصہ سے براجمان تھی، اب نہیں رہی۔“ (محمد کاظم) (276)

☆..... ”ایک شخص جو سینکڑوں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صحافیوں، کالم نگاروں اور ادبی رسالوں کے مدیروں کا آئیڈیل ہو اور دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں لوگ اس کے مداح ہوں اور جو پچھلے پچاس برسوں میں ہر نئی آنے والی نسل کے افسانہ نگاروں، شاعروں کے لیے مشعلِ راہ ہو، اس کے وجود کے یوں اچانک بجھ جانے سے اندھیرا کس قدر گہرا ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ مجھے علی اکبر عباس کی آواز سننے سے جہاز میں بیٹھنے تک کے درمیانی عرصہ میں ہوا۔“ (ایوب خاور) (277)

☆..... ”امن و امان کے غیر متزلزل ایمان نے اسے حالات سے ایک عجیب قسم کی شمشیر زنی سکھائی تھی ندیم اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ”اعتدال اور احتیاط جی ہوئی منظم زندگی کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔“ (معنی کی تلاش۔ اساطیر۔ ص 79)

لاہور من آباد، غالب کالونی کے ایک معدوم ہوتے ہوئے رنگ و روغن والے مکان سے ایک عام آدمی کی طرح رخصت ہوتا ہوا ندیم اپنی ہی سطح کے انسانوں سے ایک مستقل استواری کی علامت ہے۔ اس کی معتدل جمع بندی، پُر استدلال نقطہ نظر اور جہی دامن کی اقداری فیصلے نے یہ ثابت کر دیا کہ خاص آدمی ہونے کے باوجود عام آدمی کی طرح زندہ رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے“ (ڈاکٹر شاہین مفتی) (276)

☆..... ”وہ بنیادی طور پر کھرے اور سچے انسان دوست تھے، وہ بزرگوں کے بھی دوست رہے نوجوانوں کے بھی دوست بنے اور بچوں سے ان کی دوستی بہت پیاری، شگفتہ سی، معصوم

سی تھی۔ آج ان کے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں، دوستوں، واقف کاروں کے بچوں کی ان کے لیے تڑپ اس دوستی کی گہرائی کو نمایاں کرتی ہے۔ ان کے جدا ہونے کا افسوس کرنے، آنے والوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ تھے، جوان کے لیے بے پناہ اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ندیم صاحب تو ہم سب کے ندیم تھے۔ بیشتر کا یہ خیال تھا کہ ندیم اُن سے ہی، سب سے زیادہ پیار کرتے تھے، بیرون ملک سے فون پر لاتعداد افراد نے آنسوؤں سے بھیگے لہجے میں تعزیت کی۔ وہ سب بہت غمزہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ عہد اس عظیم شاعر، ادیب اور دانشور کے جانے سے قہی داماں ہو گیا ہے۔“ (ناہید قاسمی) (277)

☆..... ”ہم ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو پون صدی تک میدانِ ادب میں سرگرم عمل رہی۔ وہ ممتاز افسانہ نگار، غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھنے والے نامور شاعر، موقر اخبارات و جرائد کے کامیاب مدیر، فکاہیہ کالم نویس کے ساتھ ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے میدان میں اپنی تخلیقات کو متواتر پیش کرنے والے واحد سرگرم ادیب تھے۔ انہوں نے شہرت کی ایسی بلندیوں کو چھوا جو بہت کم ادبا و شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی گراں قدر ادبی خدمات سے جو اُن مٹ نشان چھوڑے ہیں، وہ کبھی مٹ نہ سکیں گے اور اُردو شعر و ادب کی تاریخ اُن کے ذکرِ خیر کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکے گی۔“ (نند کشور وکرم) (278)

☆..... ”بیسویں صدی کی تاریخ کا ایک قد آور شخص دس جولائی 2006 کو بہت طمانیت کے اسلوب سے بزمِ جہاں سے رخصت ہوا۔ جناب احمد ندیم قاسمی محنت کش اور پسے ہوئے طبقے کے لوگوں کی محرومی کی زندگی میں معنویت اور تبدیلی کے خواب ستاروں کی طرح سجا کر ابھرے تہذیب و فن کے میدان میں اپنی غیر معمولی بصیرت کے نقش و نگار چھوڑ کر اس جہاں سے وادع ہوئے۔“ (صلاح الدین حیدر) (279)

☆..... ”گزشتہ صدی کی تئیس کی دہائی کے آخر میں، اُردو ادب کے افق پر جو ایک کہکشاں ظہور پذیر ہوئی تھی، قاسمی صاحب اس کا آخری ستارہ تھے۔ اس روشن اور انقلابی ادبی دور سے تعلق رکھنے والا اب کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔ قاسمی صاحب نے جتنا

☆..... ”احمد ندیم قاسمی کسی ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ ادارے کا لفظ بھی ان کی شخصیت اور فن و ہنر کا احاطہ کرنے کے لیے نا کافی ہے۔ ندیم صاحب جیسے لیجنڈری ادیب اس دنیا سے پردہ پوش ہونے کے باوجود اپنے پیچھے کوئی خلا نہیں چھوڑتے کیوں کہ ان کی تصنیفات اور چاہنے والوں کا جہوم رہتا ہے۔“ (ظفر اقبال) (282)

☆..... ”احمد ندیم قاسمی اپنی عمر کے دورانیے میں چراغ کی طرح روشن رہا اور جب یہ چراغ بجھا تو مشعل بن گیا۔ اپنی طبعی عمر سے نکل کر اب وہ ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ جو اُسے مزید روشنی ملنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے، اُس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ تین چوتھائی صدی تک بے تکان لکھتا ہی چلا گیا۔ اُس کا قلم کبھی دم لینے کے لیے بھی نہیں رکا۔ کوئی ہے جس نے ادب کی اتنی اصناف میں معیار بن کر برقرار رکھتے ہوئے اتنا لکھا ہو؟ احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری تو اپنی جگہ لیکن اُس کے چالیس سال کے مجاہدے اور ریاضت (”فنون“ کی ادارت) نے ہمارے ادب کو مسلسل تخلیقی و فوری میں رکھا اور اسے کسی انتہا پسندی یا بنیاد پرستی سے بچ کر جمہور پرستی کے راستے پر چلنے کی سمت دکھائی۔“ (آفتاب اقبال شمیم) (283)

☆..... ”اُن کے جنازے پر جب بانو قدسیہ آپا نے اُن کی میت کا چہرہ دیکھنے کے دوران دو تین بار کہا کہ بیٹا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پوری اُردو کی دنیا کی ترجمانی کر رہی ہوں کہ ندیم صاحب کے جانے کے بعد اب دور دور تک کوئی اُن جیسا دکھائی نہیں دیتا اور کسی کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ (امجد اسلام امجد) (284)

☆ ابھی ابھی انھی کنجوں میں اُس کے سائے تھے

ابھی ابھی وہ تھا انھی برآمدوں میں یہاں

یقین نہیں آتا کہ قاسمی صاحب رخصت ہو گئے حالاں کہ میں اُن کا معالج تھا اور خوب اچھی طرح سے جانتا تھا کہ عمر نے عناصر کے اعتدال کا کیا حال کر دیا تھا مگر وہ شخص ہی کچھ اور تھا۔ اتنا بڑا اور معتبر اور بے حد مصروف آدمی، لیکن اتنا نفیس بیماری کی حالت میں بھی انتہائی نفیس اور پھر ہمیشہ اُجلا لباس، گفتگو انتہائی تحمل سے، اُن کی گفتگو سے کبھی ایسا نہیں لگا کہ



ایک شخص جو موت کی آہٹ سن چکا ہو۔ اتنا شانت، مطمئن اور آسودہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ قاسمی صاحب تو اپنی تکلیف کا ذکر بھی بے حد مدہم انداز میں کرتے، جیسے کسی دوسرے آدمی کا قصہ بیان کر رہے ہوں۔ ”ڈاکٹر صاحب! آج سانس کی تکلیف کچھ زیادہ ہے۔“ ”کبھی کبھی ہمارے درمیان بے تکلفانہ گفتگو بھی ہوتی تھی۔ کبھی ادب، کبھی مصوری اور خطاطی، کبھی روزمرہ کے معاملات پر لیکن اس گفتگو میں بھی میری جانب سے جد ادب اور اُن کی طرف سے ایک خاص حدِ متانت قائم رہتی تھی۔

”جس دن قاسمی صاحب رخصت ہوئے، میں اسلام آباد میں تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس تو ہے کہ آخری لمحوں میں اُن کی خدمت نہیں کر سکا۔ لیکن مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ اتنی عزیز ہستی اور اتنے پیارے وجود کو اپنی آنکھوں سے رخصت ہوتے دیکھنا اور اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا بھی انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہوتا۔ مجھے ابھی بھی ایسا لگتا ہے کہ قاسمی صاحب آئیں گے۔ میرا عملہ اُن کو عزت و تکریم سے کلینک کے کسی خالی کمرے میں بٹھائے گا اور میں!..... ”محبت، دوستی، تعلق آنکھوں کو کتنے بہت سے آنسو دیتے ہیں رفتیدولے نہ از دل ما“ (ڈاکٹر محمود ناصر ملک۔ ندیم صاحب کے معالج) (285)

☆..... ”میں شکاگو میں ہوں! گزشتہ روز میرے ہوٹل کے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف افتخار نسیم تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ احمد ندیم قاسمی انتقال کر گئے ہیں اور آج انھیں سپرد خاک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد چند لمحوں تک ہم دونوں کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ غالباً ہمیں ایسے لگا جیسے اس ایک شخص کے ساتھ ایک پورا عہد ہم سے رخصت ہو گیا ہے۔ چناں چہ ہم دونوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک شخص کا ماتم تو کیا جاسکتا ہے۔ پورے عہد کا ماتم کیسے کیا جائے؟“ (عطا الحق قاسمی) (286)

☆..... ”احمد ندیم قاسمی نے ایک بھر پور زندگی گزاری اور ایک آدھ نہیں پانچ میدانوں میں ستر برس تک دادِ شجاعت دی۔ شاعری، افسانہ نگاری، ترقی پسند تحریک، صحافت اور ادبی سیاست..... انھوں نے ایک شاندار جنگ کھیلی اور ایسی کہ تین نسلوں میں ان گنت لکھنے والوں نے اُن پر رشک کیا۔ وہ آمد و مندی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت

ہوئے۔“ (ہارون الرشید) (287)

☆..... ”اُردو ادب کو نہ مندمل ہونے والے زخم دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے والے احمد ندیم قاسمی بہت بڑے شاعر تھے لیکن وہ محض شاعر تو نہیں تھے۔ وہ طبقاتی استحصال کے بہت بڑے دشمن تھے۔ انھوں نے جس بہادری سے HAVES اور لوٹ مار کرنے والوں کو اور سطروں اور عماموں کو لٹکایا، اس کی مثال اُردو ادب میں تو کیا دنیا بھر کے ادب میں شاید ہی ہو، میرا دعویٰ ہے کہ ندیم قاسمی کے بے شمار فن پاروں کی اُردو ادب ہی نہیں، عالمی ادب میں کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔“ (محمد اظہار الحق) (288)

☆..... ”میں نے سوچا المیہ دیکھیے اس ملک میں احمد ندیم قاسمی جیسی ہستی 90 سال کی عمر میں بھی فکرِ معاش سے آزاد نہ ہو سکی۔ انھیں ادب کی 70 سال تک کی خدمت کے بعد بھی تنخواہ کے چیک کا انتظار رہتا تھا۔ وہ آخری وقت تک نوکری کے دکھ میں مبتلا تھے۔ یہ سلوک تھا جو ہم اس ملک کے سب سے بڑے دانشور کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں وہ دریا تھے اور ہمارا سارا سماجی گند سمیٹ کر چپ چاپ سمندر میں اُتر گئے۔ لیکن ان کی موت یہ ثابت کرتی ہے، ہم لوگ یونان کے باسیوں سے پانچ ہزار سال پیچھے ہیں۔ یونان کے لوگ ہم سے کہیں زیادہ سیولائزڈ اور مہذب تھے۔ قاسمی صاحب کا انتقال ثابت کرتا ہے، اگر احمد ندیم قاسمی پانچ ہزار سال پرانے یونان کے باسی ہوتے تو وہ ایلینا (دانش وروں کے لیے آباد کی گئی بستی) کے سردار ہوتے اور وقت کے بادشاہ تک جوتی اُتار کر اُن کے دربار میں حاضر ہوتے۔“ (جاوید چوہدری) (289)

☆..... ”اُداسی کا صحیح اندازہ اُردو ادب کے مستقبل کو دیکھ کر ہوتا ہے، جس کی تلافی ممکن نہیں..... اے اہل دل! اب ہم میں مثبت اندازِ فکر اور تعمیرِ رویے بانٹنے والا وہ بڑا انسان نہیں رہا..... جس نے تخریب کے جواب میں تعمیر اور نفرت کے جواب میں محبت تقسیم کی۔“ (بشری اعجاز) (290)

☆..... ”پنجاب کے وزیر اعلیٰ پرویز الہی نے سیاست دان ہونے کے باوجود بڑی دانش مندانہ بات کہی ہے کہ بابائے ادب احمد ندیم قاسمی کی وفات پورے معاشرے

کے لیے نقصان دہ ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا تعزیتی پیغام (بذریعہ فرزانہ راہ) اور جماعت اسلامی کے لیڈروں کا مرحوم کے گھر جا کر تعزیت کرنا بھی ثابت کرتا ہے کہ مختلف نظریات رکھنے والے سیاست دان بھی درویشوں کا دلی احترام کرتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی دائمی جدائی سے دل اور آنکھیں اشک بار ہیں۔“ (خولچہ پرویز) (291)

☆..... ”ان کی شخصیت کے ارد گرد محبت، احترام انسانیت اور انسان دوستی کا ایک ایسا ہالہ تھا کہ جو بھی اس کی زد میں ایک بار آ جاتا، پھر عمر بھر نہ نکل سکتا تھا۔ ان کی محبت کا ہر شخص کے لیے انفرادی اظہار ہی دراصل اس تعلق داری کا سبب تھا، جو ان کی رفاقت میں بیٹھا ہوا ہر شخص محسوس کرتا تھا۔ کچھ عرصہ اگر کسی کی خبر نہ ملتی تو ندیم صاحب خود رابطہ کرتے، فون کرتے یا خط لکھ دیتے، نہیں تو اس شہر کا کوئی فرد ان سے ملنے آتا تو انفرادی طور پر دوسروں کی خیریت معلوم کرتے۔ گزشتہ برس شمالی علاقہ جات میں زلزلے کے سبب جب ہزاروں لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے تو سب سے پہلے آپ نے اپنے کالم ”رواں دواں“ میں ان علاقوں سے تعلق رکھنے والے عام ادیبوں سے لے کر بڑے ناموں تک کبھی کا ذکر اپنے کالم میں کیا اور خیریت دریافت کی۔“ (غافر شہزاد) (292)

☆..... ”میرے قاسمی صاحب نے لکھنے والوں کی سرپرستی دل کھول کر کیا کرتے تھے، ان کے لیے نئے راستے تراشتے تھے۔ ادیب کی تخلیقی شخصیت، بہت سے خانوں میں بیٹی ہوئی ہو تو ناقدین اور قارئین کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسے کس خانے میں رکھا جائے۔ جناب احمد ندیم قاسمی ایک ہی وقت میں منفرد شاعر، صاحب اسلوب، افسانہ نگار، واضح سوچ رکھنے والے کالم نویس اور مدبر مدیر تھے۔ میرے خیال میں ان کی چاروں ہی تخلیقی حیثیات مضبوط ہیں لیکن مجھے ان کی شاعرانہ شخصیت نے ہمیشہ اپنے زیر اثر رکھا۔ ان کی شاعری ایک مکمل انسان کے مکمل تجربوں کی عکاس ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو بات کہی، آفاقی تھی قاسمی صاحب کے لائق شعرا آج زبان زد عام ہیں، بعض تو ضرب المثل بن چکے ہیں قاسمی صاحب کی شاعری اور شخصیت میں رتی برابر بھی تضاد نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی شاعری میں جس آدرش و نظر پر پائے کا پرچار کرتے تھے، وہی ان کی شخصیت اور کردار کا حصہ تھا، اور یہ ایسی صفت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔“ (ناصر بشیر) (293)

☆.....”احمد ندیم قاسمی کی رحلت کی خبر کا سن کر کون شخص ہوگا جس کی آنکھوں میں نمی نہ اتری ہوگی۔ اُن کی وفات نے سب کو سوگوار کر دیا۔ یوں لگتا ہے کہ ادبی منظر نامہ دہند کی دبیز تہ کے پیچھے چھپ گیا ہو۔ اُن کے جانے کا دکھ سب سے زیادہ لکھنے والوں کو ہوا۔ کہتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے دل میں ایک چراغ جلا رکھا تھا، جس کی لو سے ہر اُس شخص کو فائدہ پہنچتا تھا جو لفظ کی حرمت پہنچاتا تھا۔ وہ ایک سایہ دار درخت کی مانند تھے جس کی چھاؤں میں ہر کوئی سستانے بیٹھ جاتا اُن کی اپنی تحریروں میں درد، رچاؤ اور محبت کا ایسا پیغام ہے جو ہر ذی روح محسوس کر سکتا ہے وہ چاہتے تو بڑے آرام کے ساتھ کوئی بڑا عہد وصول کرتے اور شاہانہ زندگی بسر کرتے لیکن وہ تو پیدا ہی ادب کی خدمت کے لیے ہوئے تھے۔“ (طارق مسعود) (294)

☆.....”آج ایک بات کہہ دینا چاہتی ہوں میں! کہ آج کتنے لوگ افسردہ ہیں، مگر کچھ لوگ شرمندہ بھی ہوں گے، بہت بے شرم ہیں، آج بھی ہیں، کچھ سرکاری وغیرہ سرکاری نمائندے، ان کی وجہ سے میں نے اس انسان کو افسردہ دیکھا تھا۔ وہ جولا ہو رہا تھا۔ اور پاکستان کا احمد ندیم قاسمی۔“ (افضل تو صیف) (295)

☆.....”فی الجملہ ان کی ذات میں پورا عہد سانس لے رہا تھا۔ ایسی ہستیاں صدیوں بعد جنم لیتی ہیں۔“ (علی تنہا) (296)

## عَدِیم مستقبل:

☆.....”احمد ندیم قاسمی قسمت کے ڈھنی تھے پون صدی (1931 سے 2006) تک تخلیقی لحاظ سے فعال رہے۔ بہت کچھ کتابوں میں محفوظ ہوا لیکن بہت کچھ جرائد اور بالخصوص اخبارات میں ہنوز منتشر ہے۔ مستقبل کا ادبی مورخ یا ڈاکٹریٹ کا امیدوار جب ان کے بارے میں کام کرے گا تو تمام قلمی آثار کی تلاش اور فراہمی آسان نہ ہوگی کہ چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری!!“ (ڈاکٹر سلیم اختر) (297)

☆.....”مختصر کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی ابتداء میں ہم سے ایسی شخصیات جدا ہو گئی ہیں جو اپنے مخصوص فکری و شعوری ارتقاء میں نشاۃ ثانیہ لے کر اٹھا رویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے عالمی دانش مند تقاضوں کا نچوڑ بھی تھی اور اب نئی صدی میں کم از کم



اردو جہانِ ادب میں تو ہمیں قاسمی صاحب کے نام سے ہی ابتدا کر کے آگے بڑھنا ہوگا، معیار میں بھی اور اقدار میں بھی۔“ (قیصر حمکین) (298)

☆..... ”اس کوزہ کی گھڑت میں وادی سون کے پرتوں کی رنگت اور انگہ کی مٹی کا بانگین آمیز ہے، جو تخلیقی تجربے کی چاک پر چھڑا ہے اور سیکسر کی ہواؤں کی تازگی میں پخت ہوتا ہے۔ اس کوزہ گر کی مہارت کو، حسن عمل اور عظمتوں کو جانچنے کے لیے اک عمر کی ریاضت اور اک وقت کا بہاؤ درکار ہے۔ یہ کوئی دو چار صفحوں کی استعداد نہیں ہے۔“ (طاہر اقبال) (299)

☆..... ”گزری نصف صدی میں برصغیر میں کوئی علمی و ادبی شخصیت ایسی نہیں ہوئی جس کا رشتہ قاسمی صاحب سے نہ ہو، چاہے، اس رشتے کا نام رقیب یا حریف کیوں نہ ہو۔ قاسمی صاحب ایسی شخصیت تھے، جنہوں نے اپنے عہد کے تمام لوگوں کو متاثر کیا۔ بلاشبہ وہ جس دور میں جیے، اسے قاسمی صاحب کا دور کہا جائے گا، احمد ندیم قاسمی بہت سی کتابوں کے بہت سے صفحات کے ساتھ ساتھ بہت سارے انسانوں کے دل و دماغ میں ادب، فن اور محبت کی ایک حسین یادگار کے طور پر بہت برسوں تک زندہ رہیں گے!“ (طاہر سرور میر) (300)

☆..... ”احمد ندیم قاسمی کا چہرہ ایک فرد کا چہرہ نہیں تھا، ان کے چہرے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں چہروں کا کرب سمٹ آیا تھا۔ ان کا نورانی چہرہ ہمارے عصر کا آئینہ تھا۔ وہ ہمارے عہد کی پہچان تھے۔ اسی سرمائے سے محرومی ہمارے دلوں کو ایک عرصہ دکھ سے بوجھل رکھے گی۔“ (ایم آر شاہد) (301)

☆..... ”علامہ اقبال کی نظریاتی تقلید میں اپنی قوم کو روشن خیالی اور بالغ نظری سے روشناس کروانے والے دانش وروں میں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی بہت نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کی بعد کی تین نسلوں کو اپنے کردار اور افکار سے براہ راست متاثر کرنے والے یہ دانش ور شرح خواندگی میں اضافے کے ساتھ آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے رہیں گے۔“ (منو بھائی) (302)

☆..... ”احمد ندیم قاسمی یوں تو ایک نابغہ روزگار کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی قدرو منزلت ہر حلقے میں پائی جاتی تھی مگر ان کی اصل انفرادیت یہ تھی کہ وہ دوسروں کو بڑا

بنانے میں غیر معمولی خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے دامنِ تربیت میں کتنے ہی چاند ستارے بنتے اور آب و تاب حاصل کرتے رہے اور بعد میں شعر و ادب کے افق پر جلوہ گر ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر ایک شفیق استاد اور ایک بے غرض تخلیقی رہنما تھے۔ یوں ایک ایسا دبستانِ علم و فن قائم ہوا جس کا فیض مدتوں جاری رہا اور اس سے لاکھوں افراد مستفید ہوئے جو اپنے اپنے عہد میں جلوہ گاہِ شوق کی ترکیں کرتے رہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کا جسدِ خاکی تو مٹی میں دفن ہو گیا لیکن ان کی عظیم سوچ، انسانیت کے ساتھ ان کا محبت بھرا رشتہ اور اپنی ادبی صلاحیتوں کے ذریعے نوجوانوں کا ادبی مستقبل سنوارنے کا پُر خلوص عمل زندہ و تابندہ رہے گا۔“ (الطاف حسن قریشی) (303)

☆..... ”قاسمی صاحب نے اپنے پیچھے جو فکری کاوش کا سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ اردو ادب کی تاریخ میں روشن مینار کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔“ (جاوید اختر چوہدری) (304)

جب کہ احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ:

☆..... ”اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو میرا لفظ مجھے زندہ رکھے گا۔ اس لفظ میں جان نہیں ہے تو میں کیوں کسی کو یاد رہوں گا۔ چناں چہ میری کسوٹی وہ لفظ ہے جو میرے فن میں وارد ہوتا ہے۔“ (305)

ندیم اگر ایک شعر میں یہ کہتے ہیں کہ:

ایک دل میں بھی مری یاد اگر زندہ ہے  
کیا ضروری ہے کہ چرچا رہے گھر گھر اپنا

اور یہ بھی کہ:

سوچتا ہوں، مری مٹی کہاں اڑتی ہوگی  
اک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

تو وہ پورے یقین سے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

میں تو مر جاؤں گا، لیکن یارو  
کبھی آئے گا زمانہ میرا

## مدتیم سوانحی کوائف:

- نام: احمد شاہ
- ادبی نام: احمد مدتیم قاسمی (اپنے پردادا ”محمد قاسم“ کی رعایت سے ”قاسمی“)
- تخلص: مدتیم
- تاریخ ولادت: 20/نومبر 1916
- جائے پیدائش: انگہ (گاؤں) وادی سون سکیسر۔ ضلع خوشاب (پنجاب۔ پاکستان)
- قبیلہ: اعوان
- مادری زبان: پہاڑی پوٹھوہاری پنجابی (ہند کو اور سرانگی آمیز)
- آبا و اجداد: عرب سے ایران اور پھر افغانستان آئے پھر وہاں سے ملتان میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں تبلیغ کے سلسلے میں خوشاب وادی سون سکیسر میں تشریف لائے اور ”انگہ“ آباد کیا۔
- والد کا نام: پیر غلام نبی عرف پیر نبی پخن (وفات: 1924)
- والدہ کا نام: غلام بیوی (وفات: 1956)
- بہن، بھائی: بڑی بہن: سعیدہ بانو (وفات: 1960)، جن کے اکلوتے بیٹے ظہیر باہر بطور صحافی اور افسانہ نگار مشہور ہوئے۔ بڑے بھائی: پیر زادہ محمد بخش (وفات: 2001)۔ ایک بڑے بھائی اللہ بخش اور ایک بڑی بہن سکینہ کم سنی میں وفات پا گئے تھے۔
- سرپرست: آٹھ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد مزید تعلیم و تربیت کے لیے اپنے چچا پیر حیدر شاہ صاحب اور چچی شرفاں بیوی صاحبہ کے پاس کیمبل پور (انک) آ گئے۔
- شادی: 06 جولائی 1948 (قریبی عزیزوں میں ہوئی جو کہ وادی سون سکیسر کے ایک گاؤں نر کی میں مقیم تھے۔)

**رفیق حیات:** رابعہ ندیم (پیدائش: 1930 - وفات: 1992) جو ندیم کے خالہ زاد بھائی پیر ضیاء الدین کی صاحبزادی تھیں۔

**سعادتِ حج:** 1988 (ہیگم بھی ہمراہ تھیں)

**اولاد:** دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی (پیدائش: 1949)، نشاط ندیم (پیدائش: 1951 - وفات: 1995)، نعمان ندیم قاسمی (پیدائش: 1956)

**نواسے نواسیاں:** نیر، نصیبہ، نسیم اور ناموس (ناہید قاسمی)  
نوشین، خرم اور نوشاہہ (نشاط ندیم)

**پوتا، پوتیاں:** نمود، نوین، نایاب اور رضا (نعمان ندیم قاسمی)

**دورانِ تعلیم:** 1920-21، انگلہ کی مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔  
1925، چوتھی جماعت میں وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اول آئے۔  
1926، گورنمنٹ ہڈل اینڈ مارل سکول، کیمبل پور (انگلہ)  
1929، آٹھویں جماعت میں ریڈ کراس سوسائٹی کے منعقدہ مقابلہ مضمون نویسی میں پنجاب بھر میں اول رہے۔  
1931، گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے میٹرک پاس کیا۔  
1931، شائع ہونے والی پہلی نظم (دورانِ میٹرک) مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر نظم لکھی۔ جو روزنامہ ”سیاست“ لاہور، کے صفحہ اول پر شائع ہوئی۔  
1931، صادق امجدیٹن کالج بہاول پور میں داخل ہوئے۔  
1933، انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ تھرڈ ایئر میں تھے کہ سرپرست چچا کا انتقال ہو گیا۔  
1935، پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔  
1935، ایم۔ اے انگلش کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور کی میرٹ لسٹ پر نام آگیا تھا۔ لیکن فیس نہ ہونے کی وجہ سے داخلہ نہیں لے سکے۔  
1936، پہلا بابا قاعدہ افسانہ ”بد نصیب بت تراش“ رسالہ رومان میں شائع ہوا۔



- ملازمت:** 1936-37، ریفاؤنڈیشن لائبریری میں بطور محرر مقرر۔  
1939-41، ایکسپریس سب انسپکٹر، ملتان۔  
1946-48، ریڈیو پاکستان پشاور میں بحیثیت سکرپٹ رائٹر کام کیا۔  
1977-87، ”بزمِ اقبال“ کے اعزازی سیکرٹری۔  
1974-2006، ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب، لاہور۔
- ادارت:** 1931-35، کالج میگزین ”منگلستان“ (صادق ایجرٹن کالج۔ بہاول پور)  
1942-46، ہفت روزہ ”پھول“، لاہور (بچوں کا رسالہ)  
1942-46، ہفت روزہ ”تہذیب نسواں“، لاہور (خواتین کا رسالہ)  
1943-46، ادبی ماہنامہ ”ادب لطیف“، لاہور  
1947-48، رسالہ ”سوریا“، لاہور (ابتدائی چار شمارے)  
1948-50، رسالہ ”نقوش“، لاہور (ابتدائی دس شمارے)  
1950، ماہنامہ ”سحر“، لاہور (صرف ایک شمارہ)  
1953-59، روزنامہ ”امروز“، لاہور  
1977-88، رسالہ ”اقبال“، لاہور (اعزازی مدیر)  
1963-2006، ادبی رسالہ ”فتون“، لاہور (آغاز سے تا عمر۔ 126 شمارے)  
1974-2006، رسالہ ”صحیفہ“، لاہور۔
- صحافت:** 1952، روزنامہ ”امروز“، لاہور میں کالم ”حریف و حکایت“۔  
1953-58، روزنامہ ”امروز“، لاہور میں کالم ”بچہ دریا“۔  
1959، روزنامہ ”ہلال پاکستان“ میں ”موج در موج“ اور ”بچہ دریا“ کے نام سے  
فکاهی کالم نویسی۔  
1960، روزنامہ ”احسان“، لاہور میں کالم ”مطاببات“۔  
1964-72، روزنامہ ”امروز“، لاہور میں دوبارہ کالم ”عنقا“ کے نام سے لکھے۔  
ساتھ ہی ادبی اور تنقیدی مضامین ”تہذیب و فن“ کے عنوان سے تحریر کیے۔  
1970، روزنامہ ”جنگ“، کراچی میں سماجی، ثقافتی اور تہذیبی کالم ”لاہور لاہور ہے“۔

روزنامہ ”حریت“ کراچی میں روزانہ شائع ہونے والی کالم ”موج در موج“ اور ہفتہ وار کالم ”لاہوریات“۔  
1972-2006، روزنامہ ”جنگ“ لاہور میں کالم ”رواں دواں“ (آخری کالم  
وفات سے پانچ روز پہلے شائع ہوا۔) اس کے علاوہ کئی اخبارات و رسائل میں مختلف  
عنوانات کے تحت کالم لکھے۔

**نظر بندی:** سیفنی ایکٹ کے تحت مئی 1951 تا نومبر 1951 اور پھر اکتوبر 1958  
تا فروری 1959۔ (1944 میں جب ندیم رسالہ ”ادب لطیف“ کے مدیر تھے۔  
اس وقت کی حکومت پنجاب نے ایک مضمون سے خفا ہو کر ڈیفنس آف انڈیا رولز کے  
تحت گرفتار کر لیا۔ جلد ہی ضمانت ہو گئی۔ البتہ مقدمہ ایک برس چلتا رہا۔)  
غیر ممالک کا سفر: چین، انگلستان، سکاٹ لینڈ، جرمنی، ماروے، امریکہ، کینیڈا، بھارت، متحدہ عرب  
امارات، سعودی عرب اور سنگاپور وغیرہ۔

### تصنیفات و تالیفات احمد ندیم قاسمی شاعری کے مجموعے:

- 01۔ ”دھڑکنیں“ (قطعات) 1941
- 02۔ ”رم جھم“ (قطعات و رباعیات) 1944
- 03۔ ”جلال و جمال“ 1946
- 04۔ ”شعلہ گل“ 1953
- 05۔ ”دشت وفا“ 1963
- 06۔ ”محیط“ 1976
- 07۔ ”دوام“ 1979
- 08۔ ”لوح خاک“ 1988
- 09۔ ”جمال“ (نعتیہ) 1992
- 10۔ ”بسیط“ 1995
- 11۔ ”ارض و سما“ 2006
- 12۔ ”انوار جمال“ (حمد، دعا، نعت، سلام) 2007

### افسانوں کے مجموعے:

- 01۔ ”چوپال“ (1939) دارالاشاعت، پنجاب۔ لاہور، 14۔ افسانے
- 02۔ ”گولے“ (1941) مکتبہ اردو۔ لاہور، 20۔ افسانے
- 03۔ ”طلوع وغروب“ (1942) نیا ادارہ۔ لاہور، 9۔ افسانے
- 04۔ ”گرداب“ (1943) ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد (دکن)، 15۔ افسانے
- 05۔ ”سیلاب“ (1944) ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد (دکن)، 12۔ افسانے
- 06۔ ”آنچل“ (1945) مکتبہ فروغ اردو۔ لاہور، 11۔ افسانے
- 07۔ ”آبلے“۔ تین طویل افسانے (1946) ادارہ فروغ اردو۔ لاہور، 3۔ افسانے
- 08۔ ”آس پاس“ (1948) مکتبہ فسانہ خواں۔ لاہور، 8۔ افسانے
- 09۔ ”درود یوار“ (1949) مکتبہ اردو۔ لاہور، 8۔ افسانے
- 10۔ ”سناٹا“ (1952) نیا ادارہ۔ لاہور، 10۔ افسانے
- 11۔ ”بازار حیات“ (1955) ادارہ فروغ اردو۔ لاہور، 13۔ افسانے
- 12۔ ”برگِ حنا“ (1959) ناشرین۔ لاہور، 10۔ افسانے
- 13۔ ”سیلاب و گرداب“۔ (دو مجموعوں سے منتخب افسانے) (1961)، 11۔ افسانے
- 14۔ ”گھر سے گھر تک“ (1963)۔ راول کتاب گھر۔ راولپنڈی، 11۔ افسانے
- 15۔ ”کپاس کا پھول“ (1973) مکتبہ فنون۔ لاہور، 17۔ افسانے
- 16۔ ”نیلا پتھر“ (1980)۔ غالب پبلشرز۔ لاہور، 9۔ افسانے
- 17۔ ”کوہِ پیا“ (1995)۔ اساطیر۔ لاہور، 10۔ افسانے
- 18۔ ”پت جھڑ“۔ (افسانے، ناولٹ) (2007)۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور، 9۔ افسانے اور ایک مکمل ناولٹ

### ناولٹ:

- 01۔ اُس رستے پر (2016)

### تقدیر:

- 01۔ ”ادب اور تعلیم کے رشتے“ 1974

- 02۔ ”تہذیب و فن“ 1975
- 03۔ ”اقبال۔ ایک محاکمہ“ 1977 (کتابچہ)
- 04۔ ”پس الفاظ“ 2003
- 05۔ ”معنی کی تلاش“ 2004
- 06۔ ”تذکرے (زیر طبع)“

#### شخصی و سوانحی خاکے:

- 01۔ ”میرے ہم سفر“ 2002
- 02۔ ”میرے ہم قدم“ 2006

#### ترتیب و تدوین:

- 01۔ ”انگڑائیاں“ (مردافسانہ نگاروں کا انتخاب) 1944
- 02۔ ”نفقوش لطیف“ (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب) 1944
- 03۔ ”کیسریا ری“ (منتخب طبع زادا و رما خود تحریروں کا مجموعہ) 1944
- 04۔ ”کیسریا ری“ (ندیم کے فکاہی کالم) 1999
- 05۔ ”منٹو کے خطوط بنام ندیم“ 1966
- 06۔ ”پاکستان کی لوک کہانیاں“ (ترجمہ) 1972
- 07۔ ”نذ رحید احمد خان“ (مرتب) 1977

#### کلیات و انتخاب:

- 01۔ ”ندیم کی غزلیں“ 1991
- 02۔ ”ندیم کی نظمیں“ 1991
- 03۔ ”ندیم کے افسانے“ (خود منتخب کردہ افسانے) 1991
- 04۔ ”احمد ندیم قاسمی کے افسانے“ (جلد اول اور جلد دوم) 2008۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور
- 05۔ ”منتخب غزلیں..... احمد ندیم قاسمی“ (انتخاب ڈاکٹرناہید قاسمی) 2015
- 06۔ ”منتخب افسانے..... احمد ندیم قاسمی“ (انتخاب ڈاکٹرناہید قاسمی) 2015
- 07۔ ”احمد ندیم قاسمی کی منتخب نظمیں“ (انتخاب ڈاکٹرناہید قاسمی) 2016



### بچوں کا ادب:

- 01۔ ”آسمان کے گوشے میں“ (کھیل) 1943
- 02۔ ”دوستوں کی کہانیاں“ 1943
- 03۔ ”نئی نوبلی کہانیاں“ 1944
- 04۔ ”باغ کے گوشے میں“ (کھیل) 1944

### زیر طبع و تدوین:

- 01۔ ”آنکھ مچھولی“ (بچوں کا ادب)
- 02۔ ”خوشاب کا پتیسرا“ (بچوں کا ادب)
- 03۔ ”بہت سے بچوں کا گھر“ (بچوں کا ادب)
- 04۔ ”جلیبیاں“ (بچوں کا ادب)
- 05۔ ”اپریل فول“ (نظمیں، بچوں کا ادب)
- 06۔ ”ایک پیسے کی ریوڑیاں“ (بچوں کا ادب)
- 07۔ ”دوستی اور چچی دوستی“ (بچوں کا ادب)
- 08۔ ”سبز جھنڈا“ (بچوں کا ادب)
- 09۔ ”کتابی کیرا“ (کھیل، بچوں کا ادب)
- 10۔ ”روداد“ (ندیم کے سیاسی کالموں کا مجموعہ)
- 11۔ ”تذکرے“ (شاعروں اور ادیبوں کے متعلق ندیم کی آرا اور ندیم کے تبصرے)
- 12۔ ”ادبی تنقیدی مضامین“ (جلد اول)
- 13۔ ”ادبی و تنقیدی مضامین“ (جلد دوم)
- 14۔ ”عنقا“ فکاہی کالم (جلد اول)
- 15۔ ”عنقا“ فکاہی کالم (جلد دوم)
- 16۔ ”موج در موج“ فکاہی کالم (جلد اول)
- 17۔ ”موج در موج“ فکاہی کالم (جلد دوم)
- 18۔ ”رواں دواں“ معاشرتی، سماجی، سیاسی کالم (جلد اول)

- 19- ”رواں دواں“ معاشرتی، سماجی، سیاسی کالم (جلد دوم)
  - 20- ”احمد ندیم قاسمی کا منتخب کردہ کلام میر تقی میر“
  - 21- فلم ”دورستے“ کے مکالمے
  - 22- حمایت علی شاعر کی فلم ”لوری“ کے لیے مکالمے
  - 23- ٹی وی کے لیے لکھا اور بیکٹل ڈراموں کے سکرپٹ کا مجموعہ
  - 24- ندیم کے نام مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ
- (ان کے علاوہ ندیم صاحب کے تحریر کردہ دیگر فلموں کے سکرپٹ، مکالمے اور ریڈیو اور ٹی وی فچر بھی شائع کرنے کا ارادہ ہے۔)

### احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے متعلق کام کی کچھ تفصیل: (یہ فہرست مکمل نہیں)

- 01- ندیم کی شاعری اور شخصیت (جمیل ملک) 1972
- 02- رسالہ ”افکار“ کراچی کا ندیم نمبر (مدیر صہبا لکھنوی) 1975
- 03- ”ندیم نامہ“ ملتان لاہور (مرتب: محمد طفیل، موجود بشر) 1976
- 04- ”احمد ندیم قاسمی۔ شاعر اور افسانہ نگار“ (پروفیسر فتح محمد ملک) 1991
- 05- ”مٹی کا سمندر“ (ندیم کے فن اور شخصیت پر دستاویز) (مرتب: ضیا ساجد) 1991
- 06- ”گل پاشی“ (ندیم کے لیے کہی نظموں کا مجموعہ) (مرتب: منصور آفاق اور منصور ہاشمی) 1996
- 07- رسالہ ”عبارت“ (حیدر آباد۔ ندیم ایڈیشن) (مدیر: مسرور احمد زئی) 1996
- 08- جریدہ ”عالمی اردو ادب“ (دہلی)۔ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن (مدیر: نند کشور کرم) 1996
- 09- ”ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“ (ڈاکٹر ناہید قاسمی) 2002
- 10- ”احمد ندیم قاسمی..... ایک لچند“ (ڈاکٹر کلیل الرحمن) 2003
- 11- (نیا) ”ندیم نامہ“۔ وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی (مرتب: ڈاکٹر اسلم فرخی) 2006
- 12- امجد اسلام امجد نے احمد ندیم قاسمی کی زندگی ہی میں ان کی شخصیت اور فن پر ڈوکومینٹری فلم بہ عنوان ”احمد ندیم قاسمی..... ٹریبیوٹ ٹو اے لونگ لچند“ تیار کی، اسے بہت پسند کیا گیا۔
- 13- مئی 2006 میں کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے نصیبہ حیات

- قاسمی نے ایم ایف اے (پینٹنگز) تھیسز ندیم کی شاعری میں اُمید و جستجو کے پہلو پر مکمل کیا۔
- 14۔ اکتوبر 2005 میں پنجاب یونیورسٹی آف آرٹ اینڈ ڈیزائن کے پروفیسر بلال احمد نے اپنے معاونین کے ہم راہ احمد ندیم قاسمی سے بالمشافہ گفتگو پر مبنی اہم دستاویزی فلم تیار کی۔
- 15۔ ماہنامہ ”بیاض“ لاہور۔ ”میزر نظم و نثر“ احمد ندیم قاسمی نمبر (مدیر: خالد احمد اور عمران منظور) نومبر 2006
- 16۔ سہ ماہی ”ادبیات“ اسلام آباد۔ خصوصی شمارہ: احمد ندیم قاسمی۔ اکادمی ادبیات پاکستان، دسمبر 2006
- 17۔ ”نذر ندیم“۔ سہ ماہی ”مونتاج“ لاہور (مدیر: منصورہ احمد) اگست 2007
- 18۔ سہ ماہی ”ادب سرائے“ انٹرنیشنل۔ خصوصی شمارہ: احمد ندیم قاسمی۔ ستمبر 2007
- 19۔ سہ ماہی ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ ندیم نمبر۔ (مدیر: عطاء الحق قاسمی)۔ مارچ 2008
- 20۔ سہ ماہی ”سورج“ انٹرنیشنل۔ (مدیر: تسلیم احمد قصور)۔ اپریل 2008 دیگر کئی ممالک اور غیر ملکی رسائل نے گوشہ ندیم قاسمی مختص کیے اور اخبارات و جرائد نے ندیم ایڈیشن شائع کیے۔
- 21۔ احمد ندیم قاسمی صدی کے سلسلے میں رسالوں ”تہذیب الاخلاق“، ”بیاض“، ”ماہ نو“ اور ”فنون“ نے ندیم صدی نمبر شائع کیے۔ 2016
- 22۔ ”صبح صدرنگ ندیم (شخصیت فن)۔“ تحریر ڈاکٹر ناہید قاسمی (2016)
- 23۔ احمد ندیم قاسمی کے فکر و فن اور شخصیت پر کئی ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں متعدد وائیم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے تحریر کروائے جاکے ہیں اور مزید لکھوائے جا رہے ہیں۔
- 24۔ بہت سے ممالک میں اور بہت سی زبانوں مثلاً، ترکی، چینی، جاپانی، روسی، عربی، ہندی اور انگریزی سمیت دیگر میں ندیم کے فن پاروں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔
- 25۔ نعتیہ رسالہ ”مدحت“ لاہور نے 2015 میں ”گوشہ ندیم“ مختص کیا۔
- چند انگریزی تراجم:

- 26...1- Selected poems of Ahmed Nadeem Qasmi  
(tr.by Baidar Bakht & Parveen Shakir)
- 27...2- Four contemporary  
(tr.by Daud Kamal) Poets

- 28...3- Selected short stories of Ahmed Nadeem Qasmi  
(tr. Prof. Sajjad Sheikh)....(1981 to 1996)
- 29...4- Selected poems of Ahmed Nadeem Qasmi  
(tr.by. Prof. Sajjad Sheikh)....(2004)
- 30...5- The old Banyan and other stories  
(tr.by. Farooq Hasan)....(2000)
- 31...6- Collected short stories of Ahmed Nadeem Qasmi  
(tr.by. Prof. Sajjad Sheikh)....Under Print.
- 32...7- Ahmed Nadeem Qasmi....War stories & poems  
(tr.by. Prof. Sajjad Sheikh)....Under Print.
- 33...8- Flower on a grave - Poems from Ahmed Nadeem Qasmi, (tr.by. Daud Kamal)

34- ”اشاریہ“ (احمد ندیم قاسمی سے متعلق مضامین پر مبنی) (مسعود الرحمن) (16 صفحہ)

سہ ماہی ”نئی عبارت“ - حیدر آباد - ندیم ایڈیشن 1997

35- ”احمد ندیم قاسمی کے مفصل سوانحی کوائف“ (مرتبین: نفیسہ، نیلم اور ناموس)،

”فتون“ ندیم نمبر - 2009

36- احمد ندیم قاسمی کے سارے افسانوی مجموعوں، ان میں شامل سب افسانوں کی تفصیل اور

ان کا جائزہ مع ان سے متعلق دیگر اہم معلومات پر مشتمل طویل مقالہ 55 صفحات -

پروفیسر سجاد شیخ ”نذرندیم“ سہ ماہی ”مونتاج“ - لاہور - 2007

37- مختلف یونیورسٹیز کی لائبریریوں میں موجود ندیم کے فکر و فن اور شخصیت کے مختلف

پہلوؤں پر لکھے گئے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مقالے -

#### اعزازات:

37-1936، اول انعام اور گولڈ میڈل - کل پاکستان مقابلہ اردو نظم بہ عنوان ”پیغام عمل“

بہ اہتمام انجمن حمایت اسلام (گولڈن جوبلی پر) بابائے اردو مولوی عبدالحق سے

حاصل کیا -

1947، 14 اگست 1947 کو آزادی کے موقع پر ریڈیو پاکستان پشاور نے اپنے

پروگراموں کا آغاز احمد ندیم قاسمی کے نغموں اور ترانوں سے کیا -

49-1947، جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین، پنجاب -



1949-54، جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین، پاکستان۔ (حکومت کی طرف سے بین لگائے جانے تک)

1964، آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ”دشت وفا“۔

1968، پرائیڈ آف پرفارمنس۔

1976، آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ”محیط“۔

1979، آدم جی ادبی ایوارڈ برائے ”دوام“۔

1979، دوہ ادبی ایوارڈ (یو۔ اے۔ ای)۔

1979، غالب ادبی ایوارڈ (دہلی، بھارت)۔

1980، ستارہ امتیاز۔

1997-98، پہلا کمال فن ایوارڈ۔

1999، نشان امتیاز۔

2001، ”فیض محمد ٹرسٹ“ بھکر نے سال کی بہترین تخلیقات پر ”احمد ندیم قاسمی ایوارڈ“ کا اجرا کیا۔

2002، آراء گولڈ ادبی ایوارڈ۔

فیچر فلموں ”دوراستے“ اور ”لوری“ کے مکالمے لکھنے پر سال کے بہترین مکالمہ نویس کے ”نگارا ایوارڈ“ ملے۔

ملک اور بیرون ملک ٹی وی چینل ندیم کے متعدد افسانوں کو ڈرامائی تشکیل دے چکے ہیں۔ 23 مارچ یوم پاکستان کے حوالے سے پی ٹی وی لاہور کے لیے طویل منظوم فیچر لکھا۔ بہت سے ممالک اور بہت سی زبانوں مثلاً ترکی، چینی، جاپانی، روسی، ہندی اور انگریزی سمیت دیگر میں ندیم کے فن پاروں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

ندیم پر کئی غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی مقالے لکھے گئے۔ پی ٹی وی کی سیریز ”قاسمی کہانی“ کوئی وی ڈراموں کے سلسلے میں ٹی وی اٹا شرف قرار دیا جا چکا ہے۔

10 جولائی 2009 کو پاکستان، محکمہ ڈاک نے احمد ندیم قاسمی یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ نومبر 2017 میں اسلام آباد کی ایک بڑی سڑک سیونٹھ ایونیو کو احمد ندیم قاسمی کے نام

سے منسوب کر دیا گیا ہے۔  
 ریڈیو اور ٹی وی نے احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن پر خصوصی پروگرام پیش کیے۔  
 02 اپریل 2008 کو بچوں کے بین الاقوامی یوم کتب کے موقع پر دہلی (بھارت)  
 میں منعقدہ تقریب میں پیش کی گئی کہانیوں میں سے احمد ندیم قاسمی کی کہانی ”  
 جلیبیاں“ بچوں میں بے حد پسند کی گئی اور وہ HUGE HIT قرار پائی۔ (نیوز  
 پوسٹ انڈیا۔ بدھ۔ 06 اپریل 2008)  
 احمد ندیم قاسمی کی 100 ویں سالگرہ کے موقع پر 2016 کو ’ندیم صدی سال‘ قرار  
 دیا گیا۔

**وقات:** 10 جولائی 2006، (صبح) بوجہ: استھما، بمقام: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی،  
 لاہور، پاکستان۔

**مدفین:** شاہ مشاق قبرستان، ملت چوک، بمن آباد، لاہور، پاکستان۔  
 زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم  
 بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

(ندیم) (306)

☆☆☆

## باب سوم

### ندیمیات

#### ندیم فن:

جیسا کہ پہلے بھی لکھا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات بھی بہت ہیں اور ان پر لکھا بھی بہت گیا ہے۔ ناقدین و محققین نے بھی، طلباء اور قارئین نے بھی لکھا۔ یہ سلسلہ اب اور بھی تیزی سے رواں ہے۔ اس مختصر کتاب میں کم وقت میں اس سب پر حاوی ہونا تو ممکن نہیں۔ البتہ کچھ اہم اور جامع آرا کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

☆ محمد خالد اختر:

” (آغاز ہی میں) شاعری اور افسانہ نگاری میں اس کی (ندیم کی) انوکھی صلاحیتوں نے مولانا صلاح الدین احمد جیسے قدین سے داد وصول کی۔“ (1)

☆ سید عابد علی عابد

” انسان ایک شعر سے غیر فانی ہو جاتا ہے۔ انھوں نے (ندیم نے) تو مجھوئے قلم بند کیے ہیں۔ جن میں ابدیت کی جھلک گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ کر چکا ہے۔ گو وہ اس کے محتاج نہ تھے نہ ہیں۔“ (2)

☆ ڈاکٹر سلیم اختر:

” احمد ندیم قاسمی انسان دوست ادیب تھے۔ ان کا فنی منشوران کے اس مشہور مصرع کے مطابق یہ قرار پاتا ہے ”انسان عظیم ہے خدایا“ کسی نصب العین سے مستقل وابستگی رکھتے ہوئے، ادب کی اقدار اور شعر کی جمالیات کو مجروح نہ ہونے دینا مشکل کام ہے اور یہی مشکل کام احمد ندیم قاسمی نے بطریق احسن کر دکھایا (ندیم صاحب کہتے ہیں)

”دراصل آج میرا جو نظریہ ہے وہ ایک دم میرے ذہن میں نہیں پھٹ پڑا بلکہ میں نے اسے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں بالکل جدلیاتی انداز میں قبول کیا ہے۔“

”احمد ندیم قاسمی نے تخلیقی اظہار کے لیے دو بڑے میڈیم یعنی شاعری اور افسانے کا انتخاب کیا۔ یہ دونوں میڈیم ایک دوسرے کے برعکس سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں سے وابستہ ہیئت اور اسلوب کے تقاضے بھی جدا گانہ ہیں مگر قاسمی صاحب نے اپنی تخلیقی توانائی سے ہر دور کا حق ادا کر دیا اور یہ بڑی بات ہے۔“ (3)

☆ عبداللہ جاوید:

”جن لفظوں میں جذبوں کے لہو اور فکر کا متوازن رچاؤ ہوتا ہے وہ زندہ رہتے ہیں۔ ایسے لفظوں کا خالق اپنے لفظوں میں زندہ رہتا ہے مرتا نہیں۔ ندیم کے الفاظ کی جولان گاہیں مختلف اور متنوع ہیں۔ ہر صورت میں وہ بھرپور توانائیوں کے ساتھ ساتھ ہیں۔“ (4)

☆ اشفاق حسین:

”ندیم صاحب اس پڑھی کے آخری نمائندہ شاعر و ادیب تھے، جس میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، کرشن چندر، اختر الایمان، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، ن م راشد، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، میراجی، عصمت چغتائی سب ہی شامل تھے۔“ (5)

☆ اطہر رضوی (نورنو):

”مہم صغیر کے شعر و ادب، نثر و نظم کی تاریخ مشاہیر سے بھرپور ہے۔ شاعری میں میرو غالب سے فیض و فراز تک، نثر یا افسانہ نگاری میں پریم چند اور کرشن چندر سے لے کر شوکت صدیقی، انتظار حسین اور بانو قدسیہ۔ لیکن کسی بڑے شاعر نے بڑی کہانیاں نہیں لکھیں اور کوئی قصہ نویس بڑا شاعر نہیں بن سکا۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی تاریخ کی اولین شخصیت ہیں جنہوں نے ہر دو اصناف میں یکساں قدرت اور یکساں شہرت حاصل کی۔ یہ بذات خود ایک ایسا مرتبہ، ایک ایسی توقیر ہے جس سے صرف قاسمی صاحب کو نوازا گیا ہے۔“ (6)



☆ پروفیسر قیصر عجمی:

”وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب، ممتاز شاعر، بلند پایہ افسانہ نگار، معتبر نقاد، باخبر کالم نویس، بالغ نظر مدیر اور وسیع المشرّب دانشور تھے۔ انھیں علم و ادب کے کسی ایک خانے میں قید نہیں رکھا جاسکتا۔۔۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے میدانوں میں تو انھوں نے اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ فکری طور پر وہ ترقی پسند تحریک کے موبند تھے۔ لیکن اس مکتبہ فکر کے حوالے سے بھی ان کا کردار منفرد رہا۔ انھوں نے ترقی پسندانہ فکر کو شرف باسلام کیا۔ (کبھی بھی کج فہمی کا شکار نہیں ہوئے)۔۔۔ انھوں نے انسان کی سربلندی کے لیے گیت بھی گائے اور عظمت خداوندی کے ترانے بھی۔“ (7)

☆ مجتبیٰ حسین (دہلی):

ہمارا ذاتی خیال ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کے ساتھ ہی جس اعلیٰ درجے کے ادب کو تخلیق کیا تھا اس درجے کے اعلیٰ معیار کو بعد میں ستر برس تک برقرار رکھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ندیم صاحب نوے برس تک نہ صرف جوان اور تنو مند رہے بلکہ تخلیقی اعتبار سے آخر وقت تک سرگرم عمل بھی رہے۔ جہاں وہ بہترین افسانہ نگار تھے، وہیں وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر کے علاوہ بے مثال مزاح نگار، نقاد، صحافی اور مدیر بھی تھے۔ پاکستان کے ادبی حلقوں میں وہ بے حد احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے البتہ نقاد شاعر اور انشائیہ نگار، وزیر آغا، مدیر اوراق سے ان کی معاصرانہ چشمک کا بڑا چرچا رہا کرتا تھا لیکن یہ یک طرفہ ہوا کرتی تھی۔ کیوں کہ ندیم خود اس میں شامل نہ رہتے تھے (ان کے مداح اور معتقدین خود صف آرا رہتے تھے) جب کہ ندیم بنیادی طور پر نہایت شریف، باظرف اور شائستہ انسان تھے۔“ (8)

☆ عبدالقادر حسن:

”میں ادیب یا نقاد نہیں ہوں صرف ایک قاری ہوں اور میں نے ہمیشہ ان کے افسانوں کو پڑھ کر جسم میں سنسنی اور ان کی شاعری پڑھ کر ایک روحانی راحت محسوس کی ہے۔“ (9)

☆ افضل تو صیف:

”مجموع ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل ہو کر جیل جانا ایک اعزاز ہی تو ہے اور اتنے

سال اس دنیا میں رہ کر قلم ہاتھ میں رکھے رکھنا، تخلیقی عمل جاری رکھ کر لفظ کی حرمت بڑھاتے رہنا، اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہے۔“ (10)

☆ محمد اظہار الحق :

”احمد ندیم قاسمی بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن وہ محض شاعر تو نہیں تھے، وہ طبقاتی استحصال کے بہت بڑے دشمن تھے۔ انھوں نے جس بہادری سے Haves کو اور لوٹ مار کرنے والوں کو اور سطروں اور عماموں کو لٹکا را۔ اس کی مثال اردو ادب میں تو کیا دنیا بھر کے ادب میں بھی شاید ہی ہو۔ میرا دعویٰ ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے بے شمار فن پاروں کی اردو ادب نہیں عالمی ادب میں کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔“ (11)

☆ جاوید چوہدری :

”تاریخ نے ثابت کر دیا۔ دنیا کو شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں، مصوروں اور سائنس دانوں سے محبت کا گریوٹان نے سکھایا۔ چنانچہ ہر دور کے سمجھ دار بادشاہوں اور مہذب معاشروں نے ان کی یونان والوں کے سے جذبے کے ساتھ خدمت کی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے ادیب، شاعر اور تخلیق کار کو معاش کی فکر سے آزاد نہ کیا تو معاشرہ تخلیقی جوہر اور فکری کلچر سے محروم ہو جائے گا۔۔۔ لیکن ہمارے معاشرے میں جتنا محروم دانشور ہے اتنا محروم شاید ہی کسی شعبے کا کوئی کارکن ہو۔۔۔“

”میں نے ایک بار اس ملک کے آخری بڑے تخلیق کار احمد ندیم قاسمی صاحب سے پوچھا تھا۔ پاکستان نے آج تک عالمی سطح کا کوئی شاعر، کوئی ادیب پیدا کیوں نہیں کیا تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا کیوں کہ ہمارا شاعر پوری زندگی چو۔ لہا اور رکابی کی فکر سے آزاد نہیں ہوتا۔ تب میں نے سوچا المیہ دیکھیے اس ملک میں احمد ندیم قاسمی جیسی ہستی 90 سال کی عمر میں آخری وقت تک نوکری کے دکھ میں مبتلا تھے۔ یہ وہ سلوک تھا جو ہم اس ملک کے سب سے بڑے دانشور کے ساتھ کرتے رہے۔“ (12)

☆ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم :

”احمد ندیم قاسمی وہ خوش قسمت ادیب و شاعر ہیں جن کے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔“ (13)

☆ بشری اعجاز:

”ہم اس معاشرے میں رہنے والے اپنے اپنے مفادات کے دائروں میں گھومتے گھومتے، سچے فن اور ادب کو اپنے اپنے اجتماعی سرد رویوں کی مار مار تے رہے مگر سون سکیسر کی وادی سے اٹھ کر مجلس ترقی ادب تک کے طویل ادبی سفر میں احمد ندیم قاسمی کی شخصیت پر گرد کا ایک ذرہ تک نہ پڑا۔ وہ آخر وقت تک اتنے ہی صاف شفاف نظر آتے رہے جتنے کہ اس سفر کی ابتداء میں تھے۔ دنیاوی معاملات کی کوئی میل کچیل ان پر کبھی نظر نہ آئی۔“ (14)

درج ذیل اہل قلم کا خراج عقیدت ”جگ“ اخبار میں:

☆ رؤف ظفر:

”اپنی تخلیقات کے حوالے سے ادب کو جو سرمایہ دیا۔ وہ لازوال ہے۔“

☆ انتظار حسین:

”ندیم ترقی پسند تحریک کے ہراول دستہ تھے۔ اس کی آخری کڑی تھے۔ وہ ایک بہت بڑی ادبی شخصیت تھے۔ کیوں کہ ادیب ہونا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن ان جیسا ادبی قد کاٹھ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ ادیب گربھی تھے۔“

☆ شہزاد احمد:

”قاسمی صاحب کی پوری زندگی چیلنجوں کو قبول کرتے ہوئے گزری۔ وہ ان سب میں کامیاب بھی ہوئے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔“

☆ خواجہ محمد زکریا:

”اردو ادب کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری مثال ایسی ہو کہ کسی مصنف کا قلم پون صدی تک مسلسل رواں دواں رہا ہو۔ قاسمی صاحب کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ بڑے شاعر ہیں یا بڑے افسانہ نویس۔ غالباً دونوں میں ان کی اہمیت ترازو کے دو برابر پلڑوں کی طرح ہے۔“

☆ وحید الحسن ہاشمی:

”انھوں نے کئی اصناف میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ شاعری یا نثر نگاری میں

ان کا اسلوب سب سے نرالا اور دلکش تھا۔ پریم چند اور علی عباس حسینی کے بعد افسانے کے میدان میں تنہا شہسوار تھے۔ گفتگو میں نرم گو، عمل میں پر عزم تھے۔ انھوں نے جیلیں کاٹیں مگر کوئی ان کے ضمیر کی طاقت کو نہ زیر کر سکا۔ نہ خرید سکا۔“

☆ خالد اقبال یاسر:

انھوں نے نہ صرف مقدار کے اعتبار سے بہت کچھ لکھا بلکہ معیار کو بھی سامنے رکھا۔ میرے نزدیک وہ Grand old man of letters ہیں۔“

☆ مشکور حسین یاد:

”احمد تیم قاسمی کی بڑی خصوصیت ان کا ڈسپلن اور نظم و ضبط تھا۔ انھوں نے گریس فل زندگی بسر کی۔ ان کا نظم و ضبط تخلیق و تہذیب کے حسین پہلوؤں سے مزین تھا۔ وہ ملنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔“

☆ ڈاکٹر سعادت سعید:

”انھوں نے آخری دم تک اپنی پروگریسو اپروچ برقرار رکھی۔ ان کی یہی وہ کمٹمنٹ ہے جسے لوگ آج بھی پسند کرتے ہیں۔ اس کمٹمنٹ کے تحت انھوں نے عوام، ملک اور معاشرے کا سوچا، وہ پروگریسو (ترقی پسند) ہونے کے باوجود مذہبی تھے۔“

☆ اسلم کولسری:

”وہ چھاؤں تھے۔ روشنی تھے۔۔۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم آئے، بہت کم آئیں گے۔“

☆ اعجاز احمد آزر:

”احمد تیم قاسمی کا فنی و فکری مقام تاریخ نے ان کی زندگی ہی میں طے کر دیا تھا۔ ان کا نام اردو شعروادب میں ایک معتبر علامت اور ان کی شخصیت اور فن تاریخ ادب کا ہم باب ہے۔“

☆ سید ثقلین حیدر:

”وہ ذات میں ادارہ اور مکتبہ فکر تھے۔“

☆ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن:

”ضرورت اس امر کی ہے کہ۔۔۔ ان کی انسان دوست شخصیت کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور ان کی علم دوستی اور ادب پروری کے معیارات کو قائم کیا

جائے تاکہ ہمارا شمار بھی زندہ قوموں میں ہو سکے۔“

☆ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی:

”ان جیسا دوسرا کوئی نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری اور افسانوں کے، دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اردو ادب کو پوری دنیا میں روشناس کرایا۔“ (15) (روزنامہ جنگ، لاہور)

☆ منشا یاد:

”اللہ تعالیٰ نے انھیں اس قدر زرخیز دماغ اور تخلیقی توانائی عطا کی تھی کہ ان کے خیالات و افکار کا دریا کسی ایک صنف ادب میں سما ہی نہیں سکتا تھا سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں خواہ شاعری ہو، افسانہ نگاری ہو، کالم نویسی ہو یا کالم نگاری، اپنی الگ اور منفرد پہچان رکھتے تھے، وہ افسانے کے اس دور کے جسے سنہری دور کہا جاتا ہے۔ آخری اور اہم ترین افسانہ نگار بھی تھے۔“ (16)

☆ محمد حمید شاہد:

”ایک سے زیادہ تخلیقی جہات رکھنا میری نظر میں ایک غیر معمولی عطا ہے اور احمد ندیم قاسمی غیر معمولی تخلیق کار تھا۔“ (17)

☆ ڈاکٹر فضل کریم:

”وہ مختلف موضوعات پر کالم لکھتے، میں ان کی فکر انگیز تحریروں سے بہت متاثر تھا، خاص طور پر جب وہ کسی سائنسی موضوع پر لکھتے، اپنے ان کالموں میں وہ کبھی کبھار کائنات کے بارے میں ایسی باتیں لکھ جاتے جو میرے ایسے سائنس کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا باعث اور معلومات افزا ہوتیں۔ 2004 میں ان کا کالم بعنوان ”یہ کائنات ابھی نامتناہی ہے شاید“ شائع ہوا، مجھے حیرانی ہوئی کہ قاسمی صاحب کائنات کے بارے میں بھی گہرا مطالعہ ہے چوں کہ یہ نظریات علم فلکیات کے جدید ترین نظریات ہیں اور ایسے موضوعات ہیں جنہیں ماسوائے ماہرین فلکیات کے دوسرے سائنسدان بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور ایک بلند پایہ ادیب بھی جب تک ان نظریات کا ادراک حاصل نہ کرے وہ اپنی تحریر میں جذب نہیں کر سکتا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی سائنسی علوم میں



خاصی دلچسپی تھی۔

ان ستاروں سے پرے اور ستارے بھی تو ہیں  
جن کے پرتو سے منور ہیں کئی اور جہاں  
ان جہانوں سے پرے اور جہاں بھی ہوں گے  
میرے سیارہ رقص کی طرح رقص کناں“ (18)

☆ انتظار حسین:

”ادیب ہونے کے علاوہ قاسمی صاحب ایک ادبی شخصیت کا مرتبہ بھی رکھتے تھے۔ ہر ادیب، ادبی شخصیت بن جانے کا اہل نہیں ہوتا کیوں کہ ان میں عام طور پر یہ کمی ہوتی ہے کہ ان میں انا بہت ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب دوسرے کے لیے بہت گنجائش رکھتے تھے۔ وہ اپنے خردوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور جن لوگوں میں ادبی صلاحیت نظر آتی، ہمیشہ ان کی سرپرستی کرتے۔ اس رویے نے انہیں ادبی شخصیت بنا دیا جو ہمیشہ بزرگوں اور نوجوانوں کی مدد اور تعاون کے لیے تیار رہتی۔

ادب سے یہ وابستگی جو ہمیں یہاں (قاسمی صاحب میں) نظر آتی ہے ہماری ادبی دنیا میں منفرد ہے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ شناخت اور شہرت حاصل کرنے کے بعد ایک ادیب اپنے آپ کو بہتر آمدنی کے امکانات کے درمیان پاتا ہے۔ اس بات کے لیے بڑے ضبط اور حوصلے کی ضرورت پڑتی ہے کہ اس قسم کی ترغیب کا شکار ہونے سے اپنے آپ کو بچائے رکھے۔ قاسمی صاحب میں یہ صفت بہت تھی۔ ادیب کے طور پر ان کی سلیبت اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں ادب سے وابستگی زندگی بھر کا معاملہ نظر آتی ہے۔ طوالت عمر نے ان کے قلم کو فعال رہنے اور زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے نہیں روکا۔ وہ پاکستان کے ادبی منظر سے غائب نہیں ہوئے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تحریری زندگی کا طویل عرصہ ان کی مدت العمر کے متوازی چلتا ہے۔ اس تحریری زندگی کی طوالت ایک ریکارڈ قائم کرتی ہے جس کی جدید اردو ادب کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

”دستک سے دست فن کو نہ آلودہ کر ندیم  
سب جا رہے ہیں چاہے در تو مگر نہ جا  
میں ندیم قریہ سیم و زر سے بھی کشیدہ گزر گیا  
جو مری انا کا غرور ہے، مری عمر بھر کی کمائی ہے“ (19)

☆ محمد ایوب واقف (بمبئی):

”جہاں تک احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ دونوں میدانوں میں ان کے کارنامے بے مثال اور لازوال ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ضرور تھے لیکن ان کے ذہن اور احساس کی انفرادیت نے ان کی راہنمائی کی۔ ندیم صاحب کے قلم کی سیاہی کبھی سوکھنے نہیں پائی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ تعمیر حیات اور تعمیر ادب میں گزارا۔ ان کا مستقل قیام اگر چہ لاہور (پاکستان) میں تھا لیکن ان کی مقناطیسی شخصیت کی خوشبو ہم ہندوستان میں بھی محسوس کرتے تھے۔“ (20)

☆ جاوید اختر چوہدری (برطانیہ):

”احمد ندیم قاسمی کی شخصیت نہ صرف اساطیر تھی بلکہ پارس بھی تھی۔ جس کو بھی ان کی معیت نصیب ہوئی وہ اردو ادب کا ایک گویا بن گیا۔ ایک اور عجیب بات قاسمی صاحب کی شخصیت میں موجود تھی وہ ان کی خود اعتمادی تھی۔ یہ خود اعتمادی انھوں نے طویل جدوجہد کے نتیجے میں حاصل کی تھی۔۔۔ یہ خود اعتمادی میں نے قاسمی صاحب کے ہم عمر دیگر شعرا کے کلام میں اتنی شدت سے نہیں پائی۔“ (21)

غرض یہ کہ ندیم صاحب کو قدرت نے ایک بے مثال ہمہ جہت ادبی شخصیت کا مالک ہونے سے نوازا۔ اب اگر وہ بیک وقت اچھے شاعر اور افسانہ نگار ہیں، ترقی پسند بھی ہیں اور اپنے مذہبی عقائد اور مشرقی اقدار کو بھی اپنائے ہوئے ہیں، بین الاقوامی شہرت کے ساتھ قومی اور عوامی مقبولیت بھی رکھتے ہیں تو یہ ایسی انفرادیتیں ہیں جن کی مثال اردو ادب میں نہیں۔ مندرجہ بالا آراء سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے فن پارے واقعی ایک اثاثہ ہیں اور اس اثاثے کی قدر رکھنے والے سے ہوئی بھی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ ان شاء اللہ

## ندیم شاعری:

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی، میں اس فرقے کا عاشق ہوں  
کہ بے دھڑکے بھری محفل میں یہ اسرار کہتے ہیں

(میر تقی میر)

شعر کہنا شعاعیں چلنا ہے  
شاعری نور جاودان جمال

(ندیم)

☆ محمد خالد اختر:

”نفسیات پر کتابیں ندیم نے شاید زیادہ نہیں پڑھی ہوں۔ مگر نفسیاتِ انسانی کا خلقی مشاہدہ اور فطری قوت بیان ایسی تھی کہ بہت کم لوگوں کو قدرت و دیعت کرتی ہے۔ ندیم نے کلاسیکی شعرا کے دیوان ایک طالب علمانہ شغف سے مطالعہ کیے اور علم و بحور میں بھی کمال حاصل کیا۔ اس کی جلال و جمال کے بعد کی شاعری میں ایک کلاسیکی کاملیت Perfection اور گہرائی ہے۔ ذاتی طور پر میں اس کے پہلے دور کی شاعری سے اس کی سادگی، نکھار اور چچی جذباتیت کی وجہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس میں سونڈھی سونڈھی زمین کی بو باس ہے۔“ (22)

☆ محمد ارشاد:

”ندیم کے خط کا اقتباس ”آج آپ کی رباعیات کے مطالعے کے دوران ایک دو مقامات پر رکا۔ میں عروض سے نا بلد ہوں۔ باطن کی موسیقی کی راہنمائی میں شعر کہتا ہوں۔ سو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں کیوں رکا۔ میری رہنمائی فرما دیجیے۔“ یہ ان کا انکسار تھا۔ ایک زمانے میں خود انھوں نے بھی رباعیاں کہیں تھیں اور یہ ناممکن ہے کہ وہ رباعی کے جملہ چوٹیں اوزان سے آگاہ نہ ہوں۔“ (23)

☆ پروفیسر فتح محمد ملک:

”نظامِ فطرت میں کا فرما تخلیقی ارتقا کے اصولوں سے آگاہی اور اسلام کے تصور کائنات کی معنویت سے گہری شناسائی کی منزل تک رسائی سے بہت پہلے 1940

میں ہی ندیم اپنی منفرد نظم ”ازلی مسرتوں کی ازلی منزل“ میں زندگی اور موت کے مفہوم کی کھوج میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔“ (24)

☆ جمیل ملک:

”ندیم کا نظریہ فن نہ صرف جمہور کی تخلیقی قوتوں سے عبارت ہے بلکہ اس کی آواز، رنگ و نسل، اونچ نیچ، مذہب و عقائد اور مشرق و مغرب کی حد بندیاں توڑ کر ساری انسانیت کی آواز بن گئی ہے۔“ (25)

☆ عبداللہ جاوید:

”شاید ہی کسی شاعر نے انسان سے محبت کو حشر کے میدان تک پہنچایا ہو اور نامہ اعمال کا حوالہ بھی بنایا ہو۔“

تو میرا نامہ اعمال تو دیکھ

میں نے انسان سے محبت کی ہے

ندیم کی شاعری کی فضا سنجیدگی بلکہ انتہائی سنجیدگی کی ہے۔ احتیاط کی ہے۔ شاعری ہو کہ افسانہ نگاری یا کالم نویسی، ندیم صاحبہ روقا سنجیدگی اور احتیاط کا دامن تھامے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اسے چھوڑ دینے کے بھی قائل تھے، جس کا نتیجہ وہ حسین توازن ہے جو کسی اور اردو شاعر کے ہاں مشکل ہی ملے گا۔“ (26)

☆ اطہر رضوی:

”احمد ندیم قاسمی کی نظموں میں جو گاؤں کی مٹی کی مہک ہے اس میں تازگی اور طہارت ہے کہ کوئی اور فن کا رایے شہ پارے تخلیق نہیں کر سکا۔“ (27)

☆ انجم جاوید:

”احمد ندیم قاسمی کا جمالیاتی وژن اور جمالیاتی احساس ہی شاعری کو ہمیز کرتا ہے۔ بہت سے افراد ”عمر“ پر اعتراض کرتے ہیں۔ شاعر پر کبھی بھی عمر جمالیاتی معاملات میں اثر انداز نہیں ہوتی، احمد ندیم قاسمی کے بارے میں عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ بہت انا پرست ہیں۔ ندیم صاحب کو انا پرست سمجھنے والے غلطی پر ہیں۔ وہ انا پرست نہیں خوددار ہیں اور خود داری اچھے انسان اور اچھی شاعری کے لیے جز و لازم شمار ہوتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی

شخصیت اور شاعری میں خودداری کی مہک نمایاں اور واضح ملتی ہے۔“ (28)

☆ آفتاب اقبال شمیم:

”عظمت آدم اور انسان پرستی احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ جن نظموں میں آدمی کی عظمت کا ذکر ہے ان میں شاعر کا عصری شعور و وجدانی تائید دونوں کا فرما نظر آتے ہیں۔ انسان سے غیر مشروط محبت کا اظہار ہی حقیقی معنوں میں وہ انسان پرستی ہے جسے ہم انسانیت کی اعلیٰ ترین قدر قرار دیتے ہیں۔ جسے مغربی میڈیا، ہیومن رائٹس وائے لیشن کی آڑ میں بطور نعرہ برتتا ہے۔ لیکن عجیب ہے کہ ایشیا میں جو خون بہایا جا رہا ہے وہ اس کی انسان دوستی کو متاثر نہیں کرتا۔“ (29)

☆ ناصر بشیر:

”ان کی شاعری ایک مکمل انسان کے مکمل تجربوں کی عکاسی ہے۔ انھوں نے شاعری میں جو بات کہی، آفاقی ہے۔ غزل کا شاعر اپنی پوری زندگی میں ایک بھی اچھا شعر کہہ لے تو تاریخ ادب میں کہیں نہ کہیں اس کا نام آ ہی جاتا ہے۔ قاسمی صاحب کچھ لاتعداد شعر آج زبان زد عام ہیں۔ بعض تو ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن

یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

☆

انداز ہو بہو تیری آواز پا کا تھا

دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

☆

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں

میں تیرا حسن ترے حسن بیاں تک دیکھوں



☆

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے  
میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہ گزر ہوں

☆

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں  
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

☆

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی  
تاج سر پہ رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

☆

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتہ  
ترے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

قاسمی صاحب کی شاعری اور شخصیت میں رتی برابر بھی تشناہ نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی شاعری  
میں جس آورش اور نظریے کا پرچار کرتے تھے وہی ان کی شخصیت و کردار کا حصہ تھا اور یہ  
ایسی صفت ہے جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔“ (30)

☆ ڈاکٹر محمد آصف قادری:

”قاسمی صاحب کی اجتماعی اور مزاحمتی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو اس کی اصول پسندی  
اور حقیقت نگاری ہی نہیں، اس کی مزاحمت کاری کا بھی سکہ ماننا پڑتا ہے۔ اس کی شاعری  
میں ہیئت اور مواد میں توازن اور تناسب سب ملتا ہے۔ نظم ”جنگل“، ”پابندی“،  
”ہم“ اور صبح آگئی“ ندیم کی حق گوئی و بے باکی کی عمدہ مثال ہیں یہ ایک طے شدہ حقیقت  
ہے کہ قاسمی کی شاعری یونیورسل اپیل رکھتی ہے جس نے دنیا کو اپنے حسین خوابوں کے  
مطابق ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ (یہ اور بات ہے کہ اس کے بقول وہ ناکام  
رہا۔) اپنے آخری انٹرویو میں اس نے کہا تھا جتنا اور جو لکھا اس سے میرا ضمیر مطمئن ہے  
اور جب ضمیر کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے بڑی نعمت نہیں ہو سکتی۔“ (31)

☆ اکرم بریلوی:

”یہ ایک حقیقت ہے کہ قاسمی صاحب کی شعری اور ادبی تخلیقات میں نہ کوئی فیض کا اثر ہے اور نہ ہی میراجی اور راشد کی شاعری جیسا بہام و ایہام ہے۔ بلکہ ایک طرح کی تہہ داری ہے جس کی تہہ میں اتر کر ہی ان کی ذہنی و فکری جذب و کرب کے ارتسامات کی نرمی و گرمی کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور دراصل یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں ہم عصروں میں جداگانہ، مختلف اور منفرد حیثیت بخشتی ہے۔“ (32)

☆ شبیر احمد قادری:

”انہجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک معتبر رہنما ہونے کے سبب حسن، صداقت اور انسان دوستی کو انھوں نے تازیت حرز جاں بنائے رکھا۔ ندیم نے دوسرے شاعروں کی بہ نسبت غزل میں تسلسل اور کثرت کے ساتھ فطرت اور انسان کے باہمی رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے ورلڈ آؤٹ لُک میں مذہب کی نفی کیے بغیر سائنسی ورلڈ لُک کے زیادہ اثرات ہیں۔ پھر وہ انسان کی کتاب زندگی میں کرب کے جتنے باب ہو سکتے تھے وہ انہیں نکال دینا چاہتے تھے۔ رفعِ شر اور طلبِ خیر ان کی شاعری میں مکمل فنی اور تہذیبی رچاؤ کے ساتھ موجود ہے۔ ندیم کی شاعری کا یہی وصف خاص انھیں معاصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔“ (33)

☆ طلعت اشارت:

”ان کی نظم عہد رواں کی نظم ہے، عصر رواں کی روح ہے بلاشبہ احمد ندیم قاسمی اس عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ایک Legend تھے۔“ (34)

☆ ڈاکٹر ناہید قاسمی:

”آج کسی بھی غزل گو کا اپنا مزاج اور اس کا منفرد لہجہ ہی اس کی شناخت کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ لہجے کا تعین مزاج کرتا ہے۔ جب کہ مزاج بنتا ہے تجربات اور مشاہدات کے بعد قائم ہونے والی طرز فکر سے۔ میر کے لہجے کی پہچان اس کی سادگی، سلاست اور سچائی ہے۔ انھوں نے احساسات کی انتہاؤں کو چھو لیا۔ غالب کے لہجے کو جان دار مردانہ لہجہ کہا گیا ہے۔ جس کے تیور تھکے اور جس کا انداز جارحانہ بتایا گیا ہے اور جس

میں عاجزی و انکساری اور مسکینی کی بجائے امانیت ہے۔ یہ ایسے مضبوط اور توانا لہجے کی آواز ہے جس سے اردو غزل پہلے آشنا نہ تھی۔ اقبال نے لہجے کی مردانگی کو جلال دیا۔ نذیم کے ہاں کھر دار پن، منضبط مضبوطی، بے حجاب سچائی، متوازن خود اعتمادی، بے حد خلوص اور قاری سے دیا نندار اندہ دوستی ہے۔ جب کہ فصاحت اور بلاغت کے باوجود سادگی اور سلاست ان کی سنبھلی ہوئی آواز کو مختلف کر دیتی ہے۔ نذیم کے مزاج اور ان کے لہجے میں میر، غالب اور اقبال کے لہجوں کی کچھ لہریں محسوس ہوتی ہیں لیکن یہ ان تینوں سے بالکل مختلف مزاج کے حامل شاعر کی آواز ہے۔ (جس میں سچائی اور خلوص کی منفرد کشش ہے) نذیم کے اہم ہم عصر غزل گو شعرا کے لہجوں میں فراق نے زندگی اور عشق کو ایک کر دیا۔ سادہ طرز اسلوب میں اپنے عہد کے افکار و احساسات کو اشعار کی صورت دے دی۔ فیض کا لہجہ انتہائی دل کش اور طلسماتی ہے۔ انھوں نے اپنے نظریات کو رمز و ایماء کے ذریعے پرکشش انداز میں ہم تک پہنچایا اور ماضی کے ادبی روایات کو زندہ رکھا۔ ناصر کاظمی کو میر ٹانی تو کہا جاتا ہے لیکن ان کا لہجہ میر کے لہجے سے زیادہ محتاط، مہذب اور شائستہ ہے۔ نذیم کے یہاں بھی تہذیب اور شائستگی ہے اور فراق کی طرح اپنے عہد کی فکر و احساس سے آگہی بھی ہے اور فیض کے نظریات سے مجموعی طور پر نذیم کو اختلاف بھی نہیں ہے لیکن نذیم ابلاغ اور ترسیل کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ قاری سے کچھ چھپا کر نہیں رکھتے۔ اس کی ذہانت اور احساس کو ہر پل آزمائش میں نہیں ڈالتے بلکہ اس پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اسے اپنا ہم راز و ہم زبان بنا لیتے ہیں۔ وہ اظہار اور لہجے میں کوئی خود ساختہ الجھاؤ یا ابہام یا پیچیدگی نہیں پیدا کرتے، انھیں خود پر اور اپنے قاری پر مکمل اعتماد ہے۔ اپنے ہم عصروں میں جرأت اظہار نذیم کے لہجے کا نمایاں ترین وصف ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اس سادہ طرز اسلوب میں بھی گہری اور سچی باتیں متاثر کر سکتی ہیں اور یہ بھی کہ غزل اس سب کچھ کو بخوبی سہا کر سکتی ہے۔“ (35)

☆ جلیل عالی:

”نذیم جب اپنے زمانے میں عالمی سطح پر حق و انصاف کی قدروں کو پامال ہوتے، بڑے بڑے دانشوروں کے افکار و نظریات کو جبر و استحصال کا آلہ کار بننے اور قلم کاروں کو

مصلحتوں کا شکار ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا دل شدتِ کرب سے تڑپ اٹھتا ہے۔ ندیم  
نے اپنی شاہکار نظم ”پتھر“ کی صورت میں انسانیت کے عالمگیر اخلاقی و تہذیبی زوال پر  
عبد آشوب قلمبند کر دیا ہے۔“ (36)

ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار!  
ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں  
میں ترے سامنے انبار لگا دوں، لیکن  
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا؟  
سرخ پتھر! جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا  
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر۔۔۔  
جس میں صدیوں کے تحیر کے پڑے ہوں ڈورے؟  
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی؟  
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے  
اک وہ پتھر ہے، جسے کہتے ہیں تہذیب سفید  
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے  
ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے مگر  
ہاتھ میں تیشہ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے  
جتنے معیار ہیں اس دور کے، سب پتھر ہیں  
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں  
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر  
میرا الہام، ترا ذہن رسا بھی پتھر  
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشان پتھر ہے  
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زباں پتھر ہے  
ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فنکار!!

(نظم پتھر۔ ”محیط“)

☆ عزیز حامد مدنی:

”ان کی نظم ”نیا ساز نئی تان“ کے بعد جو 1941 کی تخلیق ہے 1947 تک ان کی فکر کا یہی دور ملے گا جس میں ان کے تاثرات، معاشرے پر انسانی رشتوں پر، فطرت پر، ایک فطری رد عمل ہیں۔ ان حدوں میں ان کی شاعری اپنے ہم عصروں سے الگ تاثرات کا ایک حلقہ رکھتی ہے۔ جس میں زندگی کے متنوع منظر ہیں۔ اس کیفیت کی نظمیں ان کو اپنے ہم عصروں سے الگ کرتی ہیں۔ ندیم کے یہاں زندگی کے پھیلاؤ میں کسی بھی نوع کی ہم آہنگی کی کمی اور حسن کا فقدان، ایک کرب کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے خیال کی بنیاد، زندگی کے حسن کے شدید احساس پر ہے۔ اس کا کہیں سے بھی مسخ ہونا سارے نظام فطرت میں ایک بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔“ (37)

☆ پروفیسر قیصر مجنی:

”اپنی ایک مقبول ترین نظم ”انسان عظیم ہے خدایا“ میں انھوں نے انسان کے خالق اصغر کی حیثیت سے کردار کو ایسے فکری اثبات اور فنی شائستگی سے سراہا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی (خاکم بدہن) خلاقی پر کہیں زندگی پر پڑتی۔ ندیم کی سوچ کسی بھی شے کے بارے میں عمومی نہیں تھی۔ بالخصوص وہ انسان، زندگی اور کائنات کو ان کے فطری ربط و انسلاک باہمی کے تناظر میں دیکھتے تھے اور ان میں سے کسی پر بھی سطحی نگاہ ڈالنے کے روادار نہیں تھے۔ ان کے ہر مشاہدے میں خدا داد بصارت و بصیرت کے تعمق کا احساس ہوتا ہے۔ وہ حیرت انگیز حد تک انسان کی نفسیات، زندگی کے رموز اور کائنات کے مزاج سے واقف تھے۔ ترقی پسند ہونے کے باوجود خدا، کائنات اور موت و حیات کے بارے میں ان کے ہاں خالص اسلامی فکر و فلسفہ کے شواہد ملتے ہیں۔ موت کے موضوع پر جس قدر نو بہ نو افکار و خیالات انھوں نے پیش کیے ہیں ان کی نظیر کہیں نہیں ملتی کہ یہ افکار و خیالات متصوفانہ بھی ہیں یعنی عرفان و معرفت سے بھی سرشار ہیں اور ان میں علم و حکمت کی روشنی بھی پائی جاتی ہے۔ بلاشبہ موت کی تفسیر و تعبیر کے حوالے سے ان کا فکری تنوع بے مثال ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے میں آئی ہے کہ شخصی طور پر وہ زندگی کے ساتھ ساتھ موت کو بھی عظیم بنانے میں مصروف عمل تھے کیوں کہ یہ بات ان کے وجدان میں



سما چکی تھی کہ انسان میں بعض ایسی پر اسرار قوتیں موجود ہیں جنہیں بروئے کار لا کر وہ اپنی فنایت کو بقا کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔

میں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں  
میں شمع بن کہ بجھوں آفتاب بن کے جلوں

☆

بکھر تو جاؤں گا لیکن اجڑ نہ جاؤں گا میں  
حیات کھو کے بھری کائنات پاؤں گا میں

”وہ جتنے بڑے غزل گو تھے، اتنے ہی بڑے نظم نگار بھی تھے۔ ان کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انھوں نے غزل و نظم ہر دو انصاف میں سخن با وقار لہجے سے روشناس کرایا اور رواج بھی دیا ہے۔ جوئی نسل کو اعتماد و یقین کا لہجہ دیا وہ احمد ندیم قاسمی کی دین ہے۔ عصری غزل و نظم سے خود رچی و پادیت اور بے یقینی کے مضامین و خیالات کو خارج کرنے کا سہرا بھی قاسمی صاحب کے سر ہے۔ خاص کر ان کی ترقی پسندانہ فکر کی نظمیں عزم و عمل، جرأت و حوصلہ اور رجائیت کے جذبات و احساسات و افکار اور انسان کے بلند مقام و مرتبہ کی مظہر و ترجمان ہیں۔

”احمد ندیم قاسمی صاحب فکر شاعر تھے۔ ان کی فکر اچھوتی اور منفرد ہے۔ غزل ہو یا نظم وہ فکر و خیال کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی فکر متحیر کر دیتی ہے۔ یہ ایک معلومہ بات ہے کہ فکر ہی ہے جو شعر کے وقار میں اضافہ کرتی ہے جب کہ فکر کو شعر ہونے میں جمالیاتی اقدار کا پاس رکھنا بھی ایک فن ہے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ قاسمی صاحب اس فن میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ ان کی لفظیات کا انتخاب و استعمال دونوں حسنِ آفرینی کا عمل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی شاعری کی ایک اور نمایاں خوبی ابلاغ ہے۔ شاعری میں ابلاغ و ترسیل معانی کے حوالے سے فی زمانہ ان کے معیار و مرتبہ کا کوئی دوسرا شاعر موجود نہیں ہے۔ وہ بہت گہرے نکلتے اور پیچ در پیچ مسئلے کو نہایت سہل انداز میں بیان کرنے پر خصوصی قدرت رکھتے تھے۔ وہ سہل بیاں ایسے ہیں کہ کلام فوری یاد ہو جاتا ہے۔ اس معیار کی شاعری

بہت کم پڑھنے اور سننے کو ملتی ہے۔ (جو گہری ہوا اور سمجھنے میں سہل بھی ہوا اور یاد کرنے میں آسان بھی ہو۔) مثلاً:

مجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں  
نت نئے ارض و سما، ارض و سما سے آگے

☆

میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح  
ابھی وجود ہے میرا فسیل جاں میں اسیر

☆

طنابِ خیمہ گردوں ہوں اے فرشتہ موت  
میں آسمان کی خاطر زمین میں اتروں

☆

سحر کی کتنی دعائیں خدا سے مانگی ہیں  
اب التماس کروں گا جمال یار سے بھی

☆

فصلِ بہار میں بھی تھی وہ ہیبتِ خزاں  
دستِ دعا بنی رہی پتی گلاب کی

☆

اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا  
قبر میں انسان کیا اس کے سوا لے جائے گا

☆

جی چاہتا ہے فلک پہ جاؤں  
سورج کو غروب سے بچاؤں  
گر مرا بس ہو گردشوں پر  
دن میں بھی چاند نہ چھپاؤں

اور لا جواب نظم ”پابندی“  
 ”میر تقی میر اور نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر کسی شاعر نے انسان کی عظمت کو اپنی فکر  
 کا مرکز و محور بنایا ہے، وہ احمد ندیم قاسمی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ”انسان  
 عظیم ہے خدایا۔“ ایک شاندار مثال اور نظمیہ شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ غزل  
 ہو یا نظم ہو یا افسانہ، ان کا محبوب موضوع انسان ہے۔ ہمارے نزدیک وہ ”  
 شاعر انسان“ تھے۔“

خدا کے ذہن کا فن پارہ عظیم ہوں میں  
 تمام دہر کا دولہا ہوں میں، ندیم ہوں میں  
 ”انہوں نے بعد کمال فن غزل کو Passiveness کے مدار سے نکال کر تحریر اور  
 زندگی کی فضاؤں میں پہنچا دیا۔ ان کے طرز کلام میں جو ٹھہراؤ، افکار میں جو شائستگی اور  
 زبان و بیان میں جو تمکنت ہے۔ وہ آج بھی ان کے بعد دیگر غزل گو شعرا کے درمیان  
 خط امتیاز کھینچتے ہیں۔ علم و فن کا جو خوبصورت امتزاج ان کی تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے وہ  
 اور کہیں نظر نہیں آتا۔ درحقیقت احمد ندیم قاسمی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک دبستان کا نام  
 ہے، ایک قلمی وقار اور ادبی شان کا نام ہے۔“ (38)

☆ کشمیری لال ذاکر (چندی گڑھ):

”احمد ندیم قاسمی کے قطعات کی ایک خصوصیت دیہاتی زندگی کی خوبصورت عکاسی  
 ہے۔ میرے ذہن میں کوئی اور دوسرا شاعر نہیں جس نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو اور  
 اس کے رہنے والوں کی دھڑکنوں، احساسات اور جذبات کی اس خوبصورتی سے  
 ترجمانی کی ہو۔“ (38)

☆ احمد ہدائی:

”احمد ندیم قاسمی ایک باشعور، سنجیدہ اور متین شاعر ہیں جو اپنی تخلیقی فعلیت کے دوران  
 میں بھی اپنے تنقیدی جذبہ کو بیدار رکھتے ہیں ان کی نظریں ہمیشہ صحت مندانہ روایتی  
 اقدار کی دانش ورانہ اخلاقی اہمیت کی فہم پر جمی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی  
 شاعری نے نہ صرف نازکی اظہار بلکہ دانش وری کی سطح پر بھی احترام و اعتبار کا مقام

حاصل کیا ہے۔ وہ دراصل متوازن رویے اور ذوق سلیم کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اور ان کا یہ انداز صرف شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ روزمرہ زندگی میں توازن اور خوش ذوقی کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہیں اپنے دکھ اور اضمحلال کو رقت اور خود رچی کی رکاکت سے محفوظ رکھنے کا سلیقہ بخوبی آتا ہے۔ وہ تحمل و توازن کو بطرز احسن اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں۔ ”انہیں اپنی فکر کو جذبہ میں ڈھالنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔“ چند اشعار دیکھیے۔

دل کا پتھر نہ کسی سے پگھلا  
لوگ کرتے رہے دیں کی باتیں

☆

شاید اس دکھ سے اجڑتی چلی جاتی ہے زمیں  
اب تو انساں کا ستاروں پہ بسیرا ہوگا

☆

کتنے معصوم ہیں انساں کہ بہل جاتے ہیں  
اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام

☆

ہر قوم کا تمدن لیتا ہے رنگ و گہمت  
کچھ یاد رفتگان سے کچھ جلوہ بتاں سے  
قاسمی صاحب لفظوں کے مزاج دان ہیں۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

ہجر کی رات کا انجام تو پیارا نکلا  
وہی سورج کہ جو ڈوبا تھا دوبارہ نکلا

اس شعر میں لفظ رات اور لفظ انجام کو کھینچ کر پڑھنے سے جو آہنگ اور موسیقیت پیدا ہو رہی ہے۔ شاعر کے احساس کو روشن کرتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں لفظ ڈوبا تھا اور لفظ دوبارہ کھینچ کر پڑھنے سے نہ صرف مفہوم روشن ہوتا نظر آتا ہے بلکہ دلوں میں تقویت اور حوصلہ مندی کے لیے بھی راستہ

ہموار کرتا محسوس ہوتا ہے۔

”قاسمی صاحب کے استعارے اور ان کے ہاں استعمال ہونے والی احساس افروز و فکر انگیز تراکیب ان کے ذاتی تجربے اور انفرادی مشاہدے سے پھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعارے اور تراکیب ان کی شاعری کا جوہر ہیں۔ انہیں نظم و غزل دونوں اصناف پر یکساں قدرت حاصل ہے۔“

علامت نگاری ان کے نزدیک کوئی شعوری اور ارادی تکنیک نہیں ہے بلکہ ایک فطری عمل ہے مثلاً ان کی ایک نظم ”خواب“ دیکھیے:

چاندنی نے رنگ شب جب زرد کر ڈالا تو، میں  
ایک ایسے شہر سے گزرا، جہاں  
صرف دیواریں نمایاں تھیں  
چھتیں معدوم تھیں  
اور گلیوں میں فقط سائے تھے  
جسم غائب تھے

اس مختصر نظم میں دیواریں رکاوٹوں اور چھتیں تحفظ کی علامت ہیں جب کہ سائے انسان کے بارے میں تصورات اور جسم، انسان کی ٹھوس اور محسوس حقیقت کی علامت ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے کی جو کیفیت ہے اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں تو موجود ہیں لیکن حقیقی تحفظ کا کوئی نظام کہیں نظر نہیں آتا، نہ مشرق میں اور نہ مغرب میں۔ اس صورت حال کو دیواروں سے گھرے ہوئے بے چھتوں کے گھر کہنا بامعنی علامت نگاری کی خوب صورت مثال ہے۔ اسی طرح اپنی فردیت اور اپنی شخصیت سے محروم انسان ہر طرف چلتے نظر آتے ہیں۔ یہ خود سے زیادہ غیر خود یعنی (I is the other) کی مثالیں ہیں۔ قاسمی صاحب نے اس نازک اور پیچیدہ صورت حال کو جس انداز میں واضح کیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے ہاں علامتیں فطری طور پر آتی ہیں اور استعاروں کی طرح شاعری کا جوہر بن جاتی ہیں۔ علامت نگاری کے سلسلے میں ایک اور نظم ”جھکن کا ایک لمحہ“ ملاحظہ ہو:



سڑک کس قدر سخت، سفاک اور کھردری ہے

وہ جوتوں کے چمڑے

نئے ٹائروں کے ربڑ

رہ روؤں کے ارادوں کو

یوں چاٹ رہی ہے

جیسے کوئی اثر دھا ہے

جو صدیوں کا بھوکا ہے

اور زندگی کو گلٹا چلا جا رہا ہے

”اس نظم میں ”سڑک“ عہدِ حاضر کی جدیدیت و موجودیت کے نظریات کے راستے کی طرف اشارہ کرتی اور بتاتی ہے کہ یہ راستہ نہایت سخت سفاک اور کھردرا ہے۔ جس کی وجہ سے پورا سفر انسان دشمن اور سماج دشمن خیالات کے اثر دھمے کا نوالہ بن جاتا ہے۔ یہ مختصر نظم جدیدیت اور موجودیت کے موضوعات پر بڑی بڑی تحریروں سے زیادہ نتیجہ خیز معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ نظم کا اسلوب جدیدیت کے علمبرداروں کے اسلوب ہی کے انداز کے عین مطابق ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ نام نہاد جدیدیت کے علمبردار اہمال و بے معنویت کے غار میں گر جاتے ہیں جب کہ قاسمی صاحب کی نظم نہ صرف با معنی ہے بلکہ بہت بڑی حد تک فکر انگیز بھی ہے۔

مذکورہ نظمیں جدید ترین اسلوب یعنی علامت نگاری کے انداز میں لکھی گئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کے فنی ارتقا کا سفر برآمد جاری ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دو تین پشت پہلے کی نسل سے متعلق ہونے کے باوجود بھی آج کی نسل نو کے ہم عصر نظر آتے ہیں۔

مثلاً ان کی 1953 کی ایک نظم ”یہاں سے وہاں تک“ اور 1957 کی نظم ”یا ذہن کی تازگی آج بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔“

یہ مضمون قاسمی صاحب کے بارے میں فراق گورکھ پوری کی رائے پر ختم کرتے ہیں۔

”ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ ان کی آواز میں

زندگی کے خواب، زندگی کے درد، زندگی کی فتوحات، زندگی کی شکستیں، اور پر خلوص سوچیں جو ہمیں زندگی کی گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی ہیں۔ پنجاب کی سر زمین سے ایسا شاعر اٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین حکم نظر آئے اور توانائی و نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو، ندیم کے اشعار کے پیچھے نجی اور گہری سوچ کا بڑا پس منظر ہوتا ہے۔ یہی سوچ ان کے کلام میں جوشیلا پن اور کاٹ پیدا کر دیتی ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔“ (40)

☆ افتخار عارف:

”ان کی نظمیں اور غزلیں اقبال کے بعد کی اردو شاعری میں ہماری شعری شناخت کے حوالوں میں بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔ انھیں جہاں ایک طرف ملک کا سب سے بڑا سول ایوارڈ ”نشان امتیاز“ تفویض کیا گیا وہیں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ”کمال فن“ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی عالمی اور قومی سطحوں پر مختلف اداروں کی جانب سے ان کو وقتاً فوقتاً اعزازات دیے جاتے رہے ہیں مگر ان کا اصل اعزاز ان کی تخلیقات اور تحریریں ہیں جو کل بھی ہمارے لیے سرچشمہ فیض تھیں اور آنے والی نسلیں بھی ان سے استفادہ کرتی رہیں گی اور ان سب پر مستزاد یہ کہ زندگی کی ترجیح اول کے طور پر ”زندہ لفظ“ پر ان کا غیر متزلزل یقین اور ایمان ہمارے لیے سبب طمانیت و افتخار تھا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی لائق تحسین و تقلید ہوگا۔“ (41)

ایک دیا ہوں جس نے جل کے سحر کر دی  
اب سورج کے حوالے اب میں چلتا ہوں

(ندیم)

## مدتیم افسانہ:

☆ احمد مدتیم قاسمی:

”جنوری 1937 میں (اس وقت مدتیم کی عمر 20 برس تھی) منٹو نے اختر شیرانی کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں منٹو نے میرا ایک ایسا افسانہ پڑھ کر مجھ سے متعارف ہونا چاہا، جو افسانہ کم اور داستان زیادہ تھا۔ (یہ میرے سب سے پہلے مجموعے ”چوپال“ کا سب سے پہلا افسانہ ”بے گناہ“ ہے) مجھے آج تک حیرت ہوتی ہے کہ منٹو اس افسانے سے کیوں متاثر ہوا۔“ (42)

☆ سعادت حسن منٹو:

” (جنوری 1937 کا خط اختر شیرانی کے نام) رومان کے پرچے باقاعدہ مل رہے ہیں۔ اس شمارے میں جتنے افسانے شائع ہوئے ہیں سب کے سب فنی نقطہ نگاہ سے معیاری ہیں۔ خاص کر ”بے گناہ“ مجھے بے حد پسند آیا اور یہی وجہ ہے کہ میں اس کے قابل مصنف جناب احمد مدتیم قاسمی بی۔ اے سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم ان کے پتے سے بواپسی ڈاک مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔“ (43)

” (جنوری 1937 کا دوسرا خط مدتیم کے نام) آپ کا افسانہ ”بے گناہ“ واقعہ میں نے بے حد پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ Plastic ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کو چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔ میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آپ میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔“

”افسانے میں Objective سچ اور Atmospheric سچ بہت پیارے، موزوں و مناسب اور بے حد اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے مختصر افسانے میں دو تین عروجی مناظر بہت Appealing ہیں۔“ (44)

☆ محمد خالد اختر:

”مدتیم کی صلاحیتوں کا رخ مختصر افسانے کی طرف موڑنے میں غالباً میرا بھی تھوڑا بہت

ہاتھ ہے۔ میرے اُکسانے پر ندیم نے (17 برس کی عمر میں) رائیڈ ہیگر ڈ کی طرز پر ایک لمبے مہاتی ناول کا آغاز کیا۔ اس نے اس کے 80 یا 90 صفحات لکھ لیے اور مجھے پڑھنے کے لیے دیے اور پھر اس نے ہمت ہار دی۔ یہ اس کا Genre نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے دیہات کے اصلی لوگوں کی اصلی جیتی جاگتی کہانیاں لکھنا چاہتا تھا۔ بحری قزاق اور جنگلی آدمی اس کی طبیعت کو اس نہ آئے۔ میں نے اسے مختصر افسانے لکھنے کا حوصلہ دیا اور جلد ہی وہ (18 برس کی عمر میں) اس کام میں جت گیا۔ کئی دفعہ شام کو گھر سے کالج گراؤنڈ آتے ہوئے میں اسے گھاس پر لیٹے یا کسی بنچ پر بیٹھے اپنا افسانہ لکھنے میں منہمک پاتا۔ پہلی ہی کہانی شاید اختر شیرانی کے رسالے ”رومان“ میں اشاعت کے لیے قبول کر لی گئی جس سے اس کی ہمت بندھی اور اس نے چند ایک اور کہانیاں لکھیں (ان میں سے بعض کہانیاں بعد میں اس کے پہلے مجموعے ”چوپال“ میں اشاعت پذیر ہوئیں)۔ اس طرح شاعر کے علاوہ وہ افسانہ نگار بھی بن گیا۔“

”ندیم نے اردو زبان میں بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں اور مختلف اسالیب (Genres) میں بعد کی کہانیوں میں فارم کی پرفیکشن اتنی نمایاں ہے کہ وہ واقعی شاہکار کہی جاسکتی ہیں اور اگرچہ اُس کی پہلی کہانیاں اپنی اصلی اور سچی دیہاتی فضا کے ساتھ قدرے جذباتیت سے رنگی ہیں، اس کے نکتہ چین جو اس کو بڑا افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے اس کے پاسنگ بھی نہیں۔“ (45)

☆ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

”مقصد اور فن کا حسین توازن ان کی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں زمین اور انسان سے ان کی بے پایاں محبت اور بھی گھل کر سامنے آتی ہے۔ ان کا تخیل پنجاب کی فضاؤں میں چپے چپے پر سے اڑا ہے اور اس نے لہلہاتے کھیتوں، گنگناتے دریاؤں اور دھوپ سے جھلے ہوئے ریت کے ذروں کو ایک نئی زبان دی ہے۔ پنجاب کی رومانی فضا اور وہاں کے لوگوں کی معصومیت و زندہ دلی، جرأت و جفاکشی اور خدمت و ایثار کی تصویریں ان کے افسانوں میں آکر لازوال ہو گئی ہیں وہ ایک باغی کا دل، مجاہد کا عزم اور فنکار کی نظر رکھتے ہیں۔“ (46)

☆ حیات نظامی:

”پاکستان کے دیہات اور ان میں بسنے والوں کے مسائل حیات کے بارے میں بڑے موثر انداز سے تصویر کشی اپنے افسانوں میں کی ہے۔“ (47)

☆ عبداللہ جاوید:

”ندیم اردو افسانے کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ افسانے میں ان کا یہ بڑا پن افسانہ ”کفارہ“ سے آیا ان کے چند افسانے تو ”کلاسیک“ میں شامل ہو چکے ہیں۔ وہ پریم چند، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، غلام عباس کی صف میں ہونے کے باوجود اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ کرداروں کی تخلیق میں بھی وہ بے حد کامیاب ہوئے ہیں ”شعوری رو“ کی ٹیکنیک جہاں ان کے افسانہ نگار ساتھیوں کو بہا لے گئی، ان کو ان کے منفرد راستے سے ہٹانہ سکی۔“ (48)

☆ پروفیسر سجاد شہ:

”ندیم ایک بے باک فنکار ہے لیکن اکثر افسانوں میں جارحانہ رویہ نہیں بلکہ حیرت انگیز حد تک معروضی ہے (البتہ یہ پروپیگنڈا ہرگز نہیں) ندیم نے اپنے Known Enemies کے خلاف ایک لفظ Direct نہیں لکھا بلکہ ڈائلاگ بھی بے حد محتاط انداز میں قلم بند کیے گئے ہیں۔“

”Direct“ پروپیگنڈا کرنے کے بجائے ندیم جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ بڑے سلیقے، قرینے اور فن کارانہ مہارت سے کہانی کے تار و پود میں سمو دیتا ہے۔“ (49)

☆ پروفیسر قیصر منجی:

”قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا کیونس بے حد وسیع ہے، جو سماجی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور تقسیم کے بعد ہجرت سے پیدا ہونے والے متنوع مسائل پر محیط ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کو اعلیٰ ادبی عہدہ پاروں کا درجہ حاصل ہے ان کا تحریر کردہ افسانہ ”پرمیٹر سنگھ“ کلاسیکی ادب میں شمار ہوتا ہے۔“ (50)

☆ افضل تو صیف:

”دور دراز کے صاف ستھرے دیہاتوں سے آنے والے شہر میں آکر بھی مضبوط اور



خالص رہتے ہیں اب کون لکھے گا ”کپاس کا پھول“ اور ”گنڈا سا“ جس کے متبادل انگریزی میں لفظ ہی نہیں۔“ (51)

☆ آفتاب اقبال شمیم:

”بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کی بات ہے۔ جب اردو افسانہ اپنے سنہرے دور سے گزر رہا تھا۔ ندیم صاحب کے افسانے ”مامتا“، ”پریش سگھ“، ”ثواب“، ”الحمد للہ“، ”ہیر و شیمہ سے پہلے ہیر و شیمہ کے بعد“، ”گنڈا سا“ اور کتنے ہی دوسرے افسانے میں نے (جب میں طالب علم تھا) پڑھے تو مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنی دھرتی کو اور اسے درپیش مسائل کو پہلی دفعہ اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھ پر یہ بھی واضح ہوا کہ ایک عالمی استعمار ہے جو دنیا پر مکمل قبضے کا خواب دیکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں نے مجھے سوچنا سکھایا، میری محسوسات کو کچھ اس طرح کی تربیت دی کہ میں ایک ورلڈ آؤٹ لک وضع کرنے کے قابل ہوا۔ مجھ پر واضح ہوتا چلا گیا کہ استعمار بڑے ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام اور چھوٹے ملکوں میں جاگیرداری کی سرپرستی کرتا ہے۔ دنیا کی ساری ایلٹ یا اشرافیہ ایک سونے کی زنجیر سے آپس میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ حقیقت حال یا سچ جس کا ذکر میں نے چند لائنوں میں کر دیا ہے۔ اس سچ کا اظہار احمد ندیم قاسمی ساری عمر اپنے افسانوں، نظموں اور اداریوں میں کرتا رہا۔“ (52)

☆ زاہدہ حنا:

”احمد ندیم قاسمی نے واقعی بہشت پہلو زندگی گزاری۔ اور افسانے لکھے تو ایسے کہ اردو ادب میں یادگار ٹھہرے۔ بھلا کون ہے جو ’رئیس خانہ‘ پڑھے اور زندگی میں اسے کبھی بھلا سکے۔ کس کے ذہن سے ’ہیر و شیمہ سے پہلے ہیر و شیمہ کے بعد‘ جیسی دہلا دینے والی کہانی محو ہو سکتی ہے۔ لاہور کی مٹی میں پیرزادہ احمد ندیم اور پریش سگھ ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے آرام کر رہے ہیں کس کی مجال ہے کہ اس افسانے کو گریہ کیے بغیر پڑھ سکے اور اسے فراموش کر سکے۔ میں پنجاب کے اس پریم چند کو یاد کرتی ہوں جس کے پاؤں آخری لمحے تک رکاب سے نہیں نکلے۔“ (53)

☆ بشری اعجاز:

”ندیم صاحب نے ان گنت زندہ کہانیاں لکھیں جن میں انسانی احساسات و جذبات کا گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ ہم سب کی نیازمندی کا جو حقیقی تقاضا تھا افسوس وہ (ان کی زندگی میں) ہم سے ادا نہ ہو سکا اور ایک بڑا انسان چھوٹے چھوٹے دفتری اور گروہی مسائل میں الجھا رہا اور اس دوران ”رئیس خانہ“، گھر سے گھرنیک“ اور ”مامتا“ جیسی نہ جانے کتنی ہی شعور کو چھینوڑنے والی زندہ کہانیاں ضائع ہو گئیں۔“ (54)

☆ پروفیسر نعیم مسعود:

”قاسمی صاحب کا پہلا افسانہ جو میں نے پڑھا، وہ ”کپاس کا پھول“ تھا۔ اس چھوٹے سے مگر جامع افسانے میں اس قدر حقیقت تھی اور فکشن کا وہ عالم تھا کہ یوں جیسے میں ہر ہر حرف میں جھانک رہا تھا اور ہر ہر لفظ مجھ میں اتر رہا تھا۔ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میں آبدیدہ ہو گیا۔ جب افسانہ پڑھ کر ختم بھی کر لیا۔ پھر بھی اس کے سحر، سچائی اور منظر کشی سے باہر نہ نکل سکا۔ واقعی وہ اپنے منفرد انداز سے اردو فکشن کو اس بلند یوں تک لے گئے تھے کہ وہاں پہنچ کر بندے کو سب کچھ، فلسفہ کیا، سچ کیا اور جھوٹ کیا، سب کچھ صاف صاف دکھائی دیتا۔“ (55)

☆ گوینلا گل:

”اردو افسانے کو عالمی معیار پر لانے کے لیے جن افسانہ نگاروں نے کاوش کی ان میں احمد ندیم قاسمی صف اول میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ایسے کرداروں کو چنا جو ہماری نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتے اور چینے کا حوصلہ دیتے ہیں۔“ (56)

☆ طاہرہ اقبال:

”ہم جب قاسمی کہانی پڑھ رہے ہوتے ہیں تو جیسے لفظ ہماری نظروں کے سامنے سونے کی کٹھالی میں پکھلتے اور اپنی ماہیت تبدیل کرتے اور خوبصورت گھڑت والے گہنوں کی ڈائی تیار کرتے ہیں۔ قاسمی صاحب کی کہانی جس اسلوب اور تکنیک میں ڈھلتی ہے۔ اس کے اختصار میں عجب جامعیت ہے۔ ایک ایک جملہ ریاضیت کی معراج نظر آتا ہے۔ قاسمی کہانی غزل کی سی ایمانیت، جامعیت اور سوز و ساز رکھتی ہے۔“ (57)

☆ فوزیہ اختر:

”قاسمی صاحب کے تمام افسانوی تجربات اپنی مٹی، تہذیب، روایت اور تجربے اور جڑ سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ماضی کی روایت، حال کے تقاضوں اور مستقبل کے امکانات سے مزید دکھائی دیتے ہیں۔“ (58)

☆ الطاف فاطمہ:

”((”سنا“ میں شامل) ہر افسانے کے موضوع اور صورت پر مصنف کی بھرپور گرفت، حیرت ناک حد تک پڑھنے والے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ آخر قاسمی صاحب اپنے ماحول اور تجربے کے ہر طبقے کے کرداروں سے کس طرح اس حد تک قریب نظر آتے ہیں کہ نہ صرف اس ماحول اور صورت حال کا حصہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ اپنے قاری کو بھی اسی ماحول کا حصہ بنا دیتے ہیں“ (59)

☆ ڈاکٹر سعادت سعید:

”چوپال“ سے لے کر ”کپاس کا پھول“ اور ”نیلا پتھر“ تک کے افسانوی مجموعوں میں انھوں نے دیہاتی اور شہری زندگی کے بے شمار اہم مسائل کو گرفت میں لیا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لوگ انھیں پڑھنے کے بعد پکاراٹھتے ہیں کہ یہ سب کچھ تو ہم نے بھی محسوس کیا ہے۔ جو کچھ قاسمی صاحب نے لکھا ہے۔ ہم نے بھی دیکھا ہے۔“ (60)

☆ انتظار حسین:

”اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قاسمی صاحب تمام وقت دیہی پنجاب کی تصویر کشی میں مشغول تھے۔ دراصل اس دیہی دنیا کے باہر جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ اس سے بے خبر نہیں تھے۔ اس لیے ان کے ادبی سرمائے میں ایسی کہانیوں کی بھی بڑی تعداد ہے جو جدید دنیا (شہروں) کی صورت حال کے بارے میں ہیں۔“ (61)

☆ سید وقار عظیم:

”ندیم کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت انسان اور اس کی انفرادیت اور یگانگت بہ حیثیت فنکار، ترازو کے دونوں پلڑوں کو یوں ایک سطح پر لے آتی ہے کہ وہ انسان بھی

عظیم تر ہی نظر آتا ہے اور فن کا بھی۔ اس کی وجہ میری اپنی نظر میں یہ ہے کہ ندیم جو باطن میں ہے وہ ظاہر میں بھی ہے اور جو اس کا ظاہر ہے وہی اس کا باطن بھی ہے۔“

”کوئی مجھ سے ندیم کے زیر بحث افسانوں کا خلاصہ دو جملوں میں بیان کرنے کو کہے تو کہوں گا کہ ان کی کہانیاں زندگی کے زہر اور اس کے تریاق کی کہانیاں ہیں اور ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کی بہترین قدروں کی غیر واعظانہ تلقین کی کہانیاں ہیں۔“ (62)

☆ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری:

”ندیم قاسمی کے یہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے اور ان کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار۔ ندیم قاسمی فطرت انسانی کے بہت اچھے نبض شناس ہیں۔“

”ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دل سوزی، متانت اور میانہ روی اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بلا کم و کاست جھلک اٹھیں اور ایک معیار بھی، جہاں تک انھیں پہنچنا ہے۔“ (63)

☆ پروفیسر فتح محمد ملک:

”احمد ندیم قاسمی نے رومانی حقیقت نگاری اور ترقی پسند حقیقت نگاری کے اسالیب میں یادگار کہانیاں لکھنے کے بعد اس اسلوب خاص میں کمال حاصل کیا ہے۔ جسے خود انھوں نے ”صداقت پسندی“ کے نام سے موسوم کیا ہے، اپنے اپنے پسندیدہ اسالیب کی محبت میں اسیر نقادوں کی داد اور بے داد سے بے نیاز احمد ندیم قاسمی صداقت پسندی کے فنی مسلک پر قائم ہیں۔“ (64)

☆ ڈاکٹر کلیل الرحمان:

”پریم چند، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی اردو کہانیوں کے یہ تین بڑے تخلیقی فنکار ہیں، تینوں کی حیثیت لچند کی ہے۔ یہ تینوں فنکار جب اپنے کرداروں، کہانیوں کے

واقعات اور حادثات میں گم ہو جاتے ہیں تو ایک باشعور قاری کی حقیقت کی نئی جمالیاتی صورت سے انبساط حاصل کرنے لگتا ہے۔

”احمد نجیم قاسمی کے حقیقت پسندانہ رویے کی تشکیل میں ہیومنزم (HUMANISM) یا انسانی دوستی کے جذبے نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ فنکار نے اپنی کہانیوں میں ہیومنزم کا رس نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس رس نے کہانیوں میں بڑی شگفتگی اور رعنائی پیدا کر دی ہے۔ ”احسان، پریش سرنگھ، سلطان، وحشی، بیٹے بیٹیاں، جب بادل اُٹھیں، ارتقاء، ہیر و شیمہ سے پہلے ہیر و شیمہ کے بعد، کنگلے، جلسہ، قلی وغیرہ“ ندیم صاحب کی ایسی کہانیاں ہیں جن میں تخلیقی فنکاری ہیومنزم کے رس کی لذت موجود ہے۔“ (65)

☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

”موضوعات کی رنگارنگی بھی ان کے افسانوں کا خاص وصف ہے اور کائنات کی بوقلمونی کو ذات کے حوالے سے دیکھنے دکھانے پر بھی انھیں غیر معمولی قدرت تھی۔ قاسمی صاحب کا فن بھی زندگی کی طرح جامد نہیں بلکہ متحرک تھا اور اس کا ارتقاء ان کے افسانوں میں صاف نظر آتا ہے۔ ابتدائی افسانوں میں وہ زندگی کے مصور ہیں۔ پھر مفسر اور آخر آخر ایک ایسے ماقد اور داعی بن کر سامنے آئے کہ جس کے یہاں زندگی اور ادب دو الگ چیزیں نہیں رہیں گی بلکہ اکائی بن گئی ہیں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں انھوں نے خود بھی نئے نئے فنی تجربے کیے، فکرو فن کے باب میں یہ ہی وہ آزاد روی اور وسعت تھی جس نے انھیں افسانے کی جدید تکنیک کی جانب متوجہ کیا اور ان سے ”وحشی“ اور ”سلطان“ نام کے ایسے بلند پایہ افسانے لکھوا لیے جو اردو میں علامتی افسانہ نگاری کے لیے نشان راہ بن گئے۔“

”زندگی کی مثبت قدروں کے محافظ اور پاکستانی قومی شعور کے داعی کی حیثیت سے ہماری ادبیات میں ان کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ میرے زاویہ نظر سے وہ اپنے ہم عمروں میں تنہا ادیب تھے جن کے فکرو فن میں ضعف و اضمحلال کے آثار کبھی پیدا نہیں ہوئے۔“ (66)



## عہدِ قاسمی کا حب الوطنی:

احمد عہدِ قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری کے متعلق دی جانے والی چند اہم آراء پر ایک نظر ڈالی گئی۔ اب ان کی کالم نویسی کو دیکھنا ہے۔ اس سے پہلے یہ نہایت مناسب مقام ہے کہ یہاں عہدِ قاسمی صاحب کے فکر و فن کے مرکزی دائرے میں مستقل اور مستحکم انداز میں موجود، ان کی نہایت مخلصانہ حب وطن کا جائزہ لیں۔ میرے خیال میں ”احمد عہدِ قاسمی کی سبھی تحریریں اور سبھی تخلیقات، شاعری، افسانہ، مضامین اور کالم ان کی انسان دوستی کے ساتھ ساتھ ان کی انتہائی پر خلوص حب الوطنی کا بھی متاثر کن اظہار ہیں۔“

(”صبح صدر رنگِ عہدِ قاسمی“۔ مضامین)

☆ مسعود اشعر:

”اگر قاسمی صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنا ہو تو ہمیں ان کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خان کی رائے کو مد نظر رکھنا ہوگا، حمید احمد خان اشتراکی ادیبوں کے بارے میں یہ کہتے ہوئے کہ ”ان کے شعر میں ضمیر جمع متکلم قوم کے اندر نہیں، واضح طور پر قوم کے عمرانی اور جغرافیائی حدود کے باہر ہوتا ہے“ وہ لکھتے ہیں۔ ”احمد عہدِ قاسمی اس ضمیر جمع متکلم کو دوبارہ پاکستان کی قومی اور جغرافیائی حدود کے اندر لے آئے ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب ضرور ہیں لیکن ان کی ترقی پسندی پاکستانی روایت کی ہمنوا ہے“ (67)

☆ حیات نظامی:

”انھوں نے ادب میں پاکستان اور پاکستانیت کے مفہوم کو بھرپور انداز سے اجاگر کیا۔ وہ حب الوطنی کے جذبے کو ہمیشہ تازہ رکھنے کی تلقین کرتے رہے“ (68)

☆ اطہر رضوی:

”پاکستان کی دوسری سالگرہ پر انھوں نے نظم ”جشن چراغاں“ لکھی تھی اور کہا تھا:  
مجھ کو اس دیس کی ایک ایک گلی پیاری ہے  
مجھ پر اس دیس کا احسان بہت بھاری ہے  
لیکن بہت جلد وہ برسرِ اقتدار حکمرانوں کی پالیسیوں اور مسلم لیگ کے کردار سے بدظن ہو گئے اور انھوں نے کہا کہ:

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے طلوع سحر  
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں“ (69)

☆ ڈاکٹر صابر آفاقی:

”آپ نے کئی فعال تنظیموں کی رہنمائی کی اور غربت زدہ افراد کی دست گیری فرماتے رہے۔ (بقول ناہید قاسمی، لاجی کے بیگ میں سے کئی چٹیں نکلتیں جنہیں لوگ فتر میں آکر مالی امداد کے لیے چپکے سے ان کے آگے رکھ دیتے اور وہ خاموشی سے جتنا ان سے ممکن ہوتا ضروری مالی امداد کر دیتے۔ اور پھر ان چٹوں کو ضائع کر دیتے۔ جب کہ نجیب احمد گواہ ہیں کہ کتنے ہی طالب علموں کی فیسیں ہندتیم صاحب آخر تک بڑی ذمہ داری سے ادا کرتے رہے) ”قاسمی صاحب کی لکھی ہوئی کہانی دنیا کے ہر انسان کی کہانی بن گئی۔ ان کے شعر پڑھ کر ہر زبان کا آدمی محسوس کرنے لگتا ہے گویا یہی اس کے دل میں ہے۔ اپنی مٹی سے پیار قاسمی کے ضمیر میں شامل تھا۔ حب الوطنی اس کے ایمان کا حصہ تھی اور وہ زندگی بھر گیسوئے اردو سنوارتا رہا۔“ (70)

☆ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم:

”ان کے ہاں خیالات کا تنوع ہے۔ وہ عالمگیر سوچ کے حامل ہیں، ظلم و استبداد کی چکی میں پتے پتے ہوئے انسان کو وہ انقلاب کا درس دیتے ہیں، احمد ہندتیم قاسمی ایک ایسے انقلاب کے مبلغ تھے جو مستحق کو اس کا حق عطا کرے۔ کلمہ حق بلند کرنے میں ان کا اپنا ہی دم تھا وہ زمین سے تعلق پر فخر کرتے ہیں۔ مٹی سے وفا ہی درحقیقت اپنی ذات سے وفا ہے۔ ارض پاک کے حوالے سے ان کی نظم وطن کے لیے دعا (خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے۔ وہ فصل گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو) نے شہرت دوام حاصل کر لی ہے۔“ (71)

☆ پروفیسر فتح محمد ملک:

”یہ احمد ہندتیم قاسمی کے اخباری مضامین کا فیض ہے کہ آج ہمارے ادب میں پاکستانیت و عالمگیریت باہم دست و گریباں نہیں ہیں بلکہ ان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ جو ہمارے جدید ادب کی آفاقیت میں پاکستانیت ایک زیریں رو کی طرح سرگرم عمل ہے تو یہ بڑی حد تک احمد ہندتیم قاسمی کے انہی لہجائی اور صحافتی مضامین کا کرشمہ ہے۔“

”سوز وطن احمد ندیم قاسمی کی صدر رنگ شعری شخصیت کا صرف ایک رنگ ہے، گہری چچی اور رچی ہوئی پاکستانیت کا رنگ ہے، یہ رنگ 6 ستمبر 1965 سے مسلسل گہرا اثر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سقوط ڈھاکہ (1971) کی خونریز رات کو یہ رنگ خون کے رنگ میں بدل گیا تھا اور ندیم کی سی صلابت کردار کا مالک اور ندیم کی سی توانا رجائیت کا حامل شاعر بھی رو دیا ہے میں روتا ہوں، اسے ارض وطن، میں روتا ہوں۔“

”ندیم کی خالص عشقیہ شاعری میں بھی سوز وطن ایک زیریں رو کی طرح جاوی و ساری ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی بقا و خوشحالی اور آزادی و خود مختاری ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام ہی کا دوسرا نام ہو، جیسے ندیم خود پاکستان ہو۔“ (72)

”احمد ندیم قاسمی اس باب میں اپنی مثال نہیں رکھتے کہ انھوں نے تصویر پاکستان اور تحریک پاکستان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، وہ عوامی جدوجہد جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا تھا اس کی کوئی ایک جھلک بھی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی، مگر ندیم کے ہاں اپنے تمام تر جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ (یہ لکھنے کے بعد فتح محمد ملک صاحب نے ندیم کے افسانوں، ”سرخ ٹوپی“ اور ”ارتقا“ تحریک خلافت پر لکھے ان دو یادگار افسانوں اور پھر 1947 کے واقعات سے متعلق موضوع پر عہد آفریں کہانی، ”پرمیٹر سنگھ“، ”نیا فرہاد“، ”تسکین“، ”جب بادل اُڑے“، ”ووٹ“، کہانی لکھی جا رہی ہے، کا تجزیہ کیا ہے۔“ (73)

✽ ڈاکٹر محمد آصف قادری:

”کیا یہ امر حیران کن نہیں کہ (ترقی پسند) قاسمی نے اسلام اور پاکستان مخالفت میں ایک شعر یا نثر میں ایک جملہ بھی نہیں لکھا جس شخص نے ضمیر کی آواز پر ہمیشہ لبیک کہا ہو، اس کو ضمیر کا اطمینان کیوں کر حاصل نہ ہوگا۔ وہ مظلوم دوست بھی تھا اور وطن پاک کا حقیقی فرزند بھی، غیر منصف حکمرانوں کا زبردست مخالف تھا اور طبقاتی تقسیم سے سخت متنفر بھی۔ آزادی، انصاف اور مساوات انسانی کا قائل ہونے کی وجہ سے کبھی اس نے انگریزی سامراج کی مزاحمت کی اور کبھی غیر جمہوری راج کی۔ اس کی آمریت سے نبرد آزمانی اور ترقی پسند فکر اور رجائی لب و لہجہ سے کون واقف نہیں؟

فلکست سے مرا اخلاق اجلی ہے ندیم  
سحر ملے نہ ملے رات سے نہ ہاروں گا

☆

اے صبح مری گواہ رہنا  
میں رات سے عمر بھر لڑا ہوں“ (74)

☆ ڈاکٹر جمیل جالبی:

”جس جرأت، حوصلہ مندی و بے باکی سے احمد ندیم قاسمی نے 6 ستمبر 1965 کی جنگ کے بارے میں مضامین لکھے تھے کسی اور ادیب اور دانشور کے قلم سے نہیں نکلے اور یہ فی الحقیقت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس وقت اکثر ادیب و دانشور تذبذب اور عدم فیصلہ کا شکار تھے لیکن قاسمی صاحب ہی کی وہ آواز تھی جس نے سب کو تذبذب کی دلدل سے نکال کر پاکستانی ہونا سکھایا تھا۔ یہ مضامین ان کی کتاب ”تہذیب و فن“ میں آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس مسئلے پر ان کا ذہن کس قدر صاف اور شفاف ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی تھی کہ ترقی پسندی اور محبت وطن پاکستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اپنے مضمون ”روح عصر کے تقاضے“ میں قاسمی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”ایک ٹھگنے“ سے شاعر نے غوی کیا تھا کہ میں شاعر اعظم ہوں اور فراق گورکھپوری نے اسے سمجھایا تھا کہ میاں پہلے قد آدم تو ہوں تو ”جب تک ہم پاکستانی ادیب نہیں بنیں گے، عالمی نقطہ نظر کا ادیب کہلانا ہمیں کیسے بچے گا اور عصر کی روح صرف واشنگٹن اور نیویارک، پیرس اور لندن، برلن اور روم ہی میں نہیں رہتی۔ تلاش کیجیے تو پنڈی اور کراچی میں بھی مل جائے گی اور درخت کی چوٹی تک پہنچنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ تنے کی طرف سے اوپر چڑھئے، زمین پر سے چھلانگ مار کر درخت کی پھٹنگ پر جا بیٹھنا تو صرف نازنوں کا کام ہے اور ہم نازن نہیں ہیں۔ ہم تو اہل قلم ہیں، جن کا مٹی سے رشتہ بہت استوار ہوتا ہے۔“ (ص 22، تہذیب و فن)

” (ندیم صاحب کا) یہ نقطہ نظر اتنا واضح، صاف اور دھوکا ہے کہ اس پر یقیناً دورائیں نہیں ہو سکتیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل ادب ان کے سارے تخلیقی و تنقیدی کاموں کا جائزہ لے کر معروضی انداز میں تاریخ ادب اردو میں ان کا مقام متعین کریں۔“ (75)



## ندیم کالم نگاری اور صحافت:

احمد ندیم قاسمی کا ذریعہ معاش صحافت سے وابستہ رہا۔ بطور مدیر روزنامہ ”امروز“ وہ سنجیدہ ادارے بھی لکھتے رہے۔ ان کی شگفتہ نگاری کی خوبصورت مثالیں ان کے فکاہی کالم ہیں۔

☆ محمد خالد اختر:

”پھر (اس کا خاص ذریعہ معاش) یعنی روزانہ اخبار میں مزاحیہ کالم نویسی ہر روز کی پریشان مشقت اور تخلیقی فن کار کے لیے (ایک طرح سے) ایک بے عمل (HACK WORK) یہ روزانہ کالم اس کے اور اس کے کنبے کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ اس کا ذریعہ معاش ہیں کیوں کہ اردو کی ادبی کتابیں یہاں بالکل نہیں بکتیں اور کالم نگاری یقیناً ندیم کا اصل Genre نہیں ہے۔“ (76)

☆ ایوب خاور:

”ایک سچے اور کھرے صحافی کا چہرہ دیکھنا ہو تو احمد ندیم قاسمی کا چہرہ دیکھے، جو سورج کی طرح تپاں بھی ہے اور چاند کی طرح اپنی روشنی میں گداز بھی رکھتا ہے۔“ (77)

☆ مجتبیٰ حسین (دہلی):

”ندیم صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اعلیٰ پایہ کے فکاہی کالم نگار تھے۔ ان کی طنز میں جو گہرائی اور مزاح میں جو شانستگی ہوتی تھی وہ لا جواب تھی۔ ندیم نے قلم کو ذریعہ معاش بنایا اور قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت خوددار اور با عزت زندگی گزاری۔“ (78)

☆ افتخار مجاز:

”قاسمی صاحب کی بذلہ نجی، شگفتہ مزاحی، حاضر جوابی اور بالخصوص لطیفہ گوئی ان کے مزاج کا خصوصی وصف تھا۔ اس فن لطیف میں بھی ندیم قاسمی صاحب کو پید طوئی اور خصوصی دسترس حاصل تھی۔ شنگی اور شانستگی کا دامن نہ چھوڑتے، ان میں یہ خوبی تھی کہ وہ جس فقرے کی زد میں آ کر دوسروں کے لیے ہنسی کا سامان بنتے، وہ واقعہ یا فقرہ خود دوسروں کو سناتے۔ ان کا رویہ بلاشبہ ان کے بڑے پن کا اظہار تھا۔“ (79)



☆ ظفر اقبال:

”روزنامہ ”امروز“ میں ندیم صاحب کا کالم ان کے شگفتہ و شاداب اور ہنس مکھ طبیعت کی پوری پوری آئینہ داری کا حامل ہوا کرتا تھا۔“ (80)

☆ علی تنہا:

”انتقال سے چند روز قبل انھوں نے جمہور کے حق میں (اپنے کالم میں) مضمون لکھا ہے۔ یہ ہے ادب سے سچے اور کھرے رشتے کا اعتبار، سوا احمد ندیم قاسمی ہماری ادبی تاریخ کا زندہ جاوید استعارہ بن گئے ہیں۔“ (81)

احمد ندیم قاسمی نے کالموں کے آخر میں دو چار معنی خیز الفاظ یا مشہور اقوال کے ٹکڑے دینے کا رواج ڈالا جو بہت دلچسپ اور پر تاثیر ثابت ہوا۔ پھر اپنے کالموں میں اعلیٰ عہدے داروں کو صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، گورنر سمیت سیدھا بلا واسطہ مخاطب کر کے اظہار خیال کرنے کا آغاز بھی ندیم صاحب نے کیا۔

☆ ڈاکٹر عس الرحمن فاروقی:

”کالم کے نام پر جس طرح لوگوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور جس طرح کالم نگاری کو ادبی سیاست کے موثر اور مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سب اس سے واقف ہیں (جب کہ) قاسمی صاحب نے کالم نگاری کے پردے میں ذاتی حملے کرنے کا مشغلہ اختیار کرنے سے عموماً گریز کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاسمی صاحب کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی لیکن اپنے قلم یا زبان کو تکلیف دہ مذمتوں سے دور رکھا۔“ (82)

☆ انتظار حسین:

”کالم قاسمی صاحب کی صحافتی زندگی کی بیش قیمت پیداوار ہیں۔“ (83)

☆ پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار کوکب:

” (ماخوذ از ”فکار“ ندیم نمبر) مزاحیہ کالم نگاری کی مشق مولانا عبد المجید سالک کے معروف کالم ”افکار و حوادث“ سے شروع کی۔ پھر جب مولانا چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی) روزنامہ ”امروز“ سے علاحدہ ہو گئے تو آپ نے ان کا کالم

حرف و حکایت لکھنا شروع کیا۔ 1953 میں جب آپ امروز کے مدیر ہو گئے تو کالم حرف و حکایت کے لیے فرضی نام ”بیچ دریا“ منتخب کیا (1958 میں ”امروز“ پر ایوب حکومت کا عتاب مازول ہوا تو اخبار چھوڑ دیا) کچھ عرصے بعد جب روزنامہ ”امروز“ کی ملکیت سرکاری سے نیم سرکاری ہو گئی تو آپ ایک بار پھر اسی اخبار میں حرف و حکایت لکھنے لگے۔ اب نام ”عنقا“ رکھ لیا۔ اسی دوران 1968 میں آپ نے روزنامہ جنگ کراچی سے ”لاہور لاہور ہے“ کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا۔ اس کی نوعیت تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کے جائزے کی تھی۔ بوجہ آپ روزنامہ ”حریت“ کراچی سے منسلک ہو گئے اور ”موج در موج“ کے عنوان سے روزانہ فکاہی کالم اور ”لاہوریات“ کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنے لگے۔ (کچھ عرصہ بعد دوبارہ جنگ سے منسلک ہوئے)۔

”قاسمی صاحب آخر دم تک روزنامہ ”جنگ“ لاہور میں ”رواں دواں“ کے نام سے کالم لکھ رہے تھے اس میں قاسمی صاحب کی تحریر کی سادگی، وطن سے محبت، معاشرے کے انحطاط پر تبصرہ موجود ہوتا تھا۔“

✽ احمد نسیم قاسمی :

(روزنامہ جنگ کراچی میں موج در موج کے نام سے ان کا پہلا کالم 2 مارچ 1978 کو شائع ہوا، پہلے کالم ہی میں انھوں نے واضح کر دیا کہ ”یہ سراسر مزاحیہ کالم ہے نہ کہ جبرے بھینچ دینے والا شدید نوعیت کا سنجیدہ کالم ہے۔ یہ محض ہلکی پھلکی گفتگو کا کالم ہے زیادہ سے زیادہ ایک شگفتہ کالم کہہ لیجیے، مزاحیہ کالموں میں تو ذاتیات کھسی چلی آرہی ہے۔ نظریاتی چھیڑ چھاڑ تو بہر حال جائز ہے مگر کسی نظریے کے حوالے کے بغیر، اشخاص کی تضحیک میری نظر میں مزاح نہیں ہے یوں سمجھ لیجیے کہ ”موج در موج“ بخ بنگلی کے ماحول میں الفاظ کی چتماق سے چند چنگاریاں پیدا کرنے کی سعی کا نتیجہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”(حرف و حکایت روزنامہ امروز لاہور ملتان، 3 جون 1970 ص 3۔ احمد نسیم قاسمی لکھتے ہیں): میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے طنز کا رد عمل مثبت اور تعمیری ہو۔ میں نے

کسی کا مذاق نہیں اڑایا۔ البتہ دل لگی سب سے کی اور اس ضمن میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ بلاشبہ بعض صورتوں میں میری تحریر تلخی سے آلودہ ہوئی۔ مگر اس تلخی کی بنیاد بھی اصولی اور نظریاتی رہی، میں نے گالی کا جواب گالی سے کبھی نہیں دیا۔“

☆ پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار کوکب:

”مزید حوالہ دیتے ہیں کہ ”عمر کے آخری عرصے میں ندیم قاسمی صاحب ”رواں دواں“ کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں کالم لکھ رہے تھے۔ اپنے مخصوص اسلوب مزاح کے برعکس ان کا یہ کالم گہرے انداز فکر کے حامل تھے۔ ان میں ہمیں سنجیدگی اور متانت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کالموں میں ہمیں وہ شوخ و شنگ پیرزادہ احمد شاہ ندیم کی بجائے وہ حساس شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نظر آتا ہے جو اپنے وطن کے سادہ لوح عوام کے مسائل پر کڑھتا ہے۔ اظہار کرتا ہے۔“ (84)

☆ نصر اللہ خان (کالم نگار):

”قاسمی صاحب کے کالموں میں ان کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ یہ وہ قاسمی صاحب نہیں ہیں جو شاعری اور افسانوں میں ہیں کہ شاعری اور افسانوں میں تو انھیں بہت دکھا اٹھانے پڑتے ہیں (جب کہ) یہاں وہ خوب ہنستے ہنساتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کے مزاح میں کلیوں کی چٹک ہے، پھولوں کی خوشبو ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے، وہ آنسو پی کر مسکراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنز میں تلخی نہیں ہوتی۔ ان کا مزاح بھی ایک بھلے آدمی کا مزاج ہے، وہ اپنے مزاح کا خود بھی ہدف بنتے ہیں“

”قاسمی صاحب بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مزاحیہ کالم شروع سے آخر تک پڑھتے جائے۔ ہنسی کے ہلکے پھلکے فوارے پھوٹتے رہیں گے۔ وہ ہر موضوع پر لکھتے ہیں اور ہر رنگ میں لکھتے ہیں، زبان و ادب کی چاشنی سے ان کی یہ تحریریں جہاں صحافت کا حصہ ہیں، وہاں وہ ادب میں بھی شامل ہیں۔“ (85)

☆ وقار بنالوی:

”قاسمی نے جب یہ تا زیا نہ طنز و مزاح ہاتھ میں لیا ہے، زندگی پر سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے دل بھی ہلا کر رکھ دیے ہیں غم کدہ حیات میں کہ تسادات سے عبارت ہے، ہر

دل کی تیرگی میں مسرت کی ایک منہمی سی کرن رجائیت کے نور سے چمکتی رہتی ہے۔ قاسمی کی نظر بڑی حد تک اسی کرن پر مرکوز رہتی ہے اور اس کے بس کی بات ہو تو وہ ہر دل میں اس نور کی ایسی سدا بہار مشعل روشن کر دے کہ شاخ حیات ہمیشہ لگ ریوگلبہار رہے۔ اسی نے اپنے کالم میں لکھا:

”یہ کالم زندگی میں ذرا سی شگفتگی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اگر اس شگفتگی کے پردے میں معاشرے کی کسی خرابی کی اصلاح ہو جائے تو سبحان اللہ“

”ان کا طنز حقیقت میں طنز لطیف ہے جس کا لطف وہ خود بھی لیتا ہے اور جس پر طنز کرتا ہے اس کے دل کے تاروں کو بھی اس طرح چھیڑتا ہے کہ وہاں بھی مسرت کی راگنی پھوٹ نکلتی ہے، اس کا توجہ جی چاہتا ہے کہ کچھ اور بھی ہوتا۔ یہ قاسمی کے فن کا کمال ہے اور میں بلا خوف و تردید پڑھے لکھے اصحاب کے مجمع میں یہ کہتا ہوں کہ اس بارے میں جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے۔ احمد نعیم قاسمی کا کوئی شریک و سہم بھی نظر نہیں آتا، حریف تو ذرا دور کی بات ہے۔“ (86)

☆ ظفر محی الدین:

”احمد نعیم قاسمی کی کالم نگاری میں جو وسعت نظر سماجی شعور اور انسانیت کے لیے گہرا کرب ملتا ہے وہ کسی حد تک ترقی پسند تحریک کا نظریاتی اثر ہے۔ جس نے اس دور کے بیشتر قلم کاروں کو عصری آگہی اور ایک وژن عطا کیا۔ ان کی کالم نگاری میں جو ادبی رنگ اور فن جھلکتا ہے وہ ان کی تخلیقی کاوشوں کا اثر ہے۔ مگر جب عالمی، قومی اور عوامی مسائل پر ان کا قلم احتجاج کرتا ہے اور درد و الم کا اظہار کرتا ہے تو اس میں نظریاتی گہرائی اور عصری آگاہی کی جھلک سامنے آتی ہے اور ان کے کالم دوسرے بے شمار کالم نگاروں سے منفرد اور پراثر نظر آتے ہیں، ان کے کالم سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ بن گئے۔ اردو کالم نگاری کا یہ اہم اور بلند ستون نہ رہا مگر وہ اپنے پیچھے نوجوانوں کے لیے اپنی تخلیقی اور فکری کاوشوں کا ایک عظیم اثاثہ چھوڑ گیا ہے، جس سے کئی نسلیں مستفید ہو سکتی ہیں۔“ (87)

## ندیم کی حمد و نعت:

ندیم کی خوبصورت حمد یہ نظم کا ایک بند ہے۔

اے خدا!

میری دعا ہے

کہ کجروں کی پراسرار فضاؤں میں

تیرا نطق

کسی شاخ پر ہند پہ اترتی ہوئی چڑیا کی طرح

میرے دل میں کسی بے نام سے احساس مسرت سے

مسلل چمکے!

اور نعت کا ایک شعر دیکھیے:

قرآن پاک اُن پر اتارا گیا ندیم

اور میں نے اپنے دل میں اتارا ہے اُن کا نام

اور

میرا معیار غزل خوانی ہے

حرفِ سادہ میں بلاغت اُن کی

☆ خاور نقوی

”احمد ندیم قاسمی کی خوبصورت حمد (مجھے رنگ دے۔ مجھے اپنے رنگ میں رنگ

دے) گیت کے لُحْن کے ساتھ قاری کو اپنے بہاؤ میں لے کر چلتی ہے۔“ (89)

☆ حیات نظامی

”احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیں جو کچھ دیا وہ یقیناً بہت بڑا

سرمایہ ہے۔ اب اس اثاثے کو سنبھال کر رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ (اس کے

آگے چھ ندیم اثاثوں کا ذکر ہے جن میں پہلے اثاثے کے بارے میں یہ لکھا کہ) حمد اور

نعت کہنے کا ایک منفرد اور جدید لہجہ دے گئے ہیں۔ ندیم کی ایک جدید نعت کا ایک شعر

پیش خدمت ہے۔



پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم  
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا“ (90)

☆ الطاف حسن قریشی:

”ان کے ہاں اپنے دین اور اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ بہت نمایاں ہے،  
یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب کے قلم سے ایسی ایسی خوبصورت اور روح پرور نعتیں تخلیق ہوئی  
ہیں جو قلوب و اذہان کو ایک نئے انداز کی تازگی اور سرمستی عطا کرتی ہیں۔“ (91)

☆ اشفاق احمد:

”برادرِ احمد ندیم قاسمی، اس عہد کے صاحب فکر شاعر ہی نہیں، صاحب علم انسان بھی ہیں۔ یہ  
کوشش، سعی مسلسل اور جہد پیہم پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ان کو زندگی  
میں جو کچھ بھی ملا ہے انعام کے طور پر ملا ہے اور جو کچھ عطا ہو رہا ہے فضل کے سہارے عطا ہو رہا  
ہے، علم اور سخن اور دین اور سائنس کی دنیا میں تحفوں کی تقسیم ہوتی ہے اور اوپر سے ہوتی ہے اور  
جس کی آرزو بڑی اور پھیلی جھولی وسیع ہوتی ہے اس کو ویسا تحفہ مل جاتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی  
بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ نعت لکھنے یا نعت کہنے کی سعادت بھی اوپر سے ہی نصیب ہوتی ہے۔“  
”صاحبِ حال ہوئے بغیر، خواہ وقتی طور پر کیوں نہ ہو، نعت نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ایک ایسی  
رمز ہے جس کو ایک صاحبِ علم عقل کے زور پر سمجھ تو سکتا ہے لیکن اس کی تہ میں نہیں اتر  
سکتا۔ مسٹری میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقی علم (MYSTERY) میں داخل ہونے  
ہی کا نام ہے جو نہی ایک انسان خود پسندی اور خود الفتی کے عمل سے دور ہو اسر نہانی کے  
مکتب میں داخل ہوا۔ قاسمی صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جو نعت کے  
حصول کے لیے دل کا دامن پھیلا کر بار بار اس Vally Of Mystery اس وادی  
سر نہانی میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے من کی مراد پاتے ہیں“ (92)

قصر و ایواں سے گزر جاتا ہے چپ چاپ ندیم

در محمدؐ کا جب آئے تو صدا دیتا ہے“ (92)

☆ یٰسین قمر:

”قاسمی صاحب کی نعتوں میں اثر پذیری کا ایک جہاں آباد ہے۔ ان کی نعتوں کا حرف

کانوں میں رس گھولنا ہوا، فکر و نظر کو شکوہ کرتا ہوا، دیارِ قلب و جاں کو نور کرتا چلا جاتا ہے۔“ (93)  
✽ خاور نقوی:

”ندیم کی نعت میں تغزل کا جو رچاؤ اور زبان و بیان کا جو بہاؤ ملتا ہے وہ دیگر اردو نعت گوؤں کے ہاں خال خال نظر آتا ہے۔ ندیم نے سادہ اور رواں زبان و بیان میں تغزل کی رنگ آمیزی سے نعت کے لب و لہجے کو اس طرح سنوارا اور نکھارا ہے کہ قاری ایک گونہ سرمستی و سرشاری سے دوچار ہوتا ہے۔ ”رسول پاک کی زندگی بہترین نمونہ عمل ہے“ کا موضوع ندیم کے ہاں سادگی و پرکاری کے امتزاج سے پھوٹا ہے جس کی وجہ سے اس میں ایک خاص قسم کا تاثر پیدا ہو گیا ہے، اپنے مختصر نعتیہ مجموعے میں ندیم نے اس قدر متنوع مضامین جس تخلیقی گہرائی اور فنکارانہ مہارت سے پیش کیے ہیں ان کی بنا پر یہ مجموعہ بڑے بڑے ضخیم نعتیہ مجموعوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

میرا کمال فن، ترے حسن کلام کا غلام

بات تھی جاں فزا تری، لہجہ تھا دل ربا ترا

ہے میرے لفظ لفظ میں گر حسن و دلکشی

اس کا یہ راز ہے، مرا معیار آپ ہیں

اس خدا سے مجھے کیسے ہو مجال انکار

جس کے شہ پارہ تخلیق کا عنوان تو ہے

اس قدر کون محبت کا صلہ دیتا ہے

اس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے

زندگی کی قید نہ قدغن کوئی نسلوں کی

جس کے در سب پہ کھلے ہیں وہ دبستاں تو ہے

ایک بار اور بھی بٹھا سے فلسطین میں آ

راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا“ (94)

## ندیم تنقید اور خاکہ نگاری:

احمد ندیم قاسمی نے مختلف شاعروں اور ادیبوں پر قابل قدر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ اور مختلف اصناف وادوار اور ادبی فنی مسائل پر بھی اپنی خیال افروز تحریریں شائع کی ہیں۔ ان سب میں چند ان کے تنقیدی مجموعوں ”ادب اور تعلیم کے رشتے“، ”تہذیب و فن“، ”پس الفاظ“ اور ”معنی کی تلاش“ میں شامل ہیں۔ دیگر رسائل و جرائد میں محفوظ اس سلسلے کی تحریروں پر مشتمل مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ جب کہ ندیم صاحب کی قابل غور اور دلچسپ خاکہ نگاری کے منفرد، سچے، کھرے اور پرکشش رنگ بہت متاثر کن ہیں۔ ان خاکوں کے دو مجموعے ”میرے ہم سفر“ اور ”میرے ہم قدم“ شائع ہو چکے ہیں۔ مزید ایک زیر ترتیب ہے۔

ندیم کی صائب اور روشن تنقیدی آراء کی اہمیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے البتہ ابھی ان کی صلاحیت کی مکمل پہچان اور پرکھ ہونا باقی ہے۔ اس وقت یہاں چند آراء ملاحظہ کیجیے:

☆ احمد ندیم قاسمی:

”ایک تخلیق کار، ادب و فن اور زندگی کے گونا گوں مسائل کے بارے میں سوچتا ضرور ہے۔ میرے مضامین ان ہی سوچوں کا اظہار ہیں۔ جب بھی کسی مسئلے کی شدت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی سوچوں کا اظہار ضروری سمجھا۔ ان مضامین کو ایک تخلیق کار کی بالواسطہ خود تنقیدی کی داستان بھی کہا جاسکتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی مقام پر نظریاتی اختلاف کے اظہار میں اتنی شدت یا تلخی پیدا نہ ہو کہ کسی کو شکایت کا موقع ملے۔ میں ترقی پسند نظریہ ادب و فن پر یقین رکھنے والا قلم کار ہوں مگر میرے نزدیک وہ بھی اہل قلم، جنہیں اپنے عظیم منصب سے آگاہی ہے، میرے نزدیک احترام کے مستحق ہیں۔ البتہ جو اکاؤ افراد، مسلمہ تنقیدی معیاروں سے بہت نیچے اتر جاتے ہیں ان پر مجھے ترس تو آتا ہے مگر غصہ نہیں آتا۔ سو یہ مضامین کسی بھی نوعیت کے شکوہ و شکایت سے مبرا ہیں۔ میرے پیش نظر ادبی مسائل پر باہمی گفتگو یا مکالمہ ہے۔“

”میں نے یہ مضامین اس اعتماد کے ساتھ سپرد قلم کیے ہیں کہ انہیں مروجہ تنقیدی معیاروں کی روشنی میں پرکھنے کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے کہ ادبی و فنی مسائل کے

بارے میں لکھتے ہوئے، مہذب اور شائستہ لہجہ کتنا ضروری ہے کہ صرف اس طرح ادب کا عام قاری، ادب کی صحیح تفہیم کر سکتا ہے اور وہ کسی مرحلے پر گمراہ نہیں ہونے پاتا۔“ (95)

☆ محمد ارشاد:

”ندیم صاحب کے جس وصف نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی اصابت رائے کا وصف تھا۔“ (96)

☆ ڈاکٹر ثکلیل الرحمن:

”احمد ندیم قاسمی ایک غالب شناس اور غالب پسند دانشور فنکار تھے۔ وہ غالب کو اردو کی ایک تہ دار، متحرک، معنی خیز روایت تصور کرتے ہیں۔ ندیم صاحب کی نظر غالب کے موضوع اور اسلوب دونوں پر بڑی گہری ہے۔ وہ غالب کو اردو تہذیب کی سب سے بڑی میراث تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے اس سچائی پر زور دیا ہے کہ غالب عمر بھر ایک دانشورانہ کرب میں مبتلا رہے کہ جن کی دانش بیدار ہوتی ہے وہی دانشورانہ کرب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔“

”احمد ندیم قاسمی نے غالب کو ایک باشعور دیوانہ کہتے ہوئے ان کی شاعری کی عظمت کو سمجھنے کی بہت ہی عمدہ کوشش کی ہے۔ ان کا یہ خیال بھی قابل غور ہے کہ حسرت نقیر ہی ہے جس سے غالب کی شاعری پہلو دار تہ دار بنتی ہے۔ ندیم صاحب نے درست فرمایا ہے کہ غالب نے خود کو جس ”گلشنِ با آفریدہ“ جس خوبصورت مستقبل کا عندلیب قرار دیا ہے۔ وہ ان کے عصر کے آشوب کا صحیح رد عمل تھا۔“ (97)

☆ ڈاکٹر سلیم اختر:

”احمد ندیم قاسمی ”پس الفاظ“ میں ص 19 پر لکھتے ہیں ”ہم اہل قلم، حق گوئی سے کبھی باز نہیں آسکتے اور ہم اظہار پر عائد ہر پابندی کو بے خوفی سے توڑ دیں گے۔ گھروں میں گھس بیٹھنے سے حکومتوں کی دست درازیوں کے راز فاش نہیں کیے جاسکتے، میں نے گھر بیٹھے رہنے کی بجائے مارشل لاء کی سچائی ہوئی سٹیج پر جا کر مارشل لاء والوں کو کھری کھری سنائیں، حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کا اعلان کرنے

کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی مجھ میں فیا ضا نہ طور پر ودیعت کی ہے۔“ یہ اعلان احمد ندیم قاسمی ہی کر سکتا ہے کہ ندیم کا آدرش ہی ”حق گوئی و بے باکی“ رہا۔“ (98)

☆ پروفیسر فتح محمد ملک:

”خالص فن کے پرستاروں کے نزدیک ”تہذیب و فن“ کا ہفتہ وار اخباری (ادبی) کالم، ندیم کی بھرپور تخلیقی زندگی کا ایک غیر تخلیقی (?) لمحہ ہے۔ مگر جن لوگوں کو ہمارے قومی وجود کی بقا اور ہماری تہذیبی زندگی کا نکھار عزیز ہے وہ یقیناً اس بات کا اعتراف کریں گے کہ اس لمحے کی پکار پر لبیک کہہ کر ندیم نے ہمارے تہذیبی مستقبل کو سرسبز و شاداب بنانے کا سامان کیا ہے۔“ (99)

یہ کیا، کہ لمحہ موجود کا ادب نہ کریں  
اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ ذکر شب نہ کریں

☆

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم  
زخم کو زخم نہیں، پھول بتایا جائے

☆

خدا نکر وہ کسی قوم پر یہ وقت آئے  
کہ خواب دفن رہیں، شاعروں کے سینوں میں

جہاں تک خاک نگاری کی بات ہے تو ندیم پچاس پچپن برس قبل ”نقوش“ کے زمانے سے، شخصیات کے سوانحی و شخصی خاکے لکھتے آرہے تھے۔ جو بے حد پسند بھی کیے گئے۔ البتہ فیض صاحب پر لکھنے جانے والے ان کے بے حد نفیس، سچے پر خلوص اور نہایت ہی دلچسپ خاکے کو قلب و نظر کی وسعت کے ساتھ نہیں لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ سب سے پہلے یہ خاکہ جہاں شائع ہوا، اس کے سرورق پر ایک بریلنگ نیوز کے انداز میں اس کا تعارف کچھ یوں کروایا گیا جیسے کوئی نہایت ہنگامہ خیز، معرکہ آراء انکشافی تحریر ہے۔ سو قارئین نے اسی تعارف کے زیر اثر صرف



ہنگامے کی گنجائش والے جملوں ہی کو چن لیا اور باقی سب، وہ پیار، وہ سچائی، وہ دوستی وہ چھوٹے چھوٹے گلے شکوے وہ منہ منی انسانی خوبیاں خامیاں، وہ مخلصانہ خواہشیں، وہ تعلق کی معصومیت سب ہی کچھ کو پیچھے دھکیل دیا گیا اور بغیر سوچے سمجھے حد یہ کہ خود سے یہ خاکہ مکمل پڑھے بغیر ہی خوب گرد اڑائی گئی۔ اس سے میرے نزدیک یہ نقصان بھی ہوا کہ ہم نذیم کے قلم سے لکھے جاسکے والے مزید ایسے عمدہ خاکوں سے ایک طرح سے شاید محروم ہو گئے۔

(فیض کے خاکے پر نذیم صاحب کے حق میں مشقِ خوبہ کی مثبت رائے پچھلے باب میں درج ہے۔) نذیم صاحب کے تحریر کردہ شخصی و سوانحی خاکوں پر مشتمل دو مجموعے ”میرے ہم سفر“ اور ”میرے ہم قدم“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ”میرے ہم سفر“ کے سر آغاز میں احمد نذیم قاسمی لکھتے ہیں۔

☆ احمد نذیم قاسمی:

”بہت مدت تک مجھے اس محبت بھرے مطالبے کا سامنا رہا کہ میں اپنی سوانح لکھوں۔ دراصل میرے طبقے کے ہر فرد کی طرح میری زندگی بھی نشیب و فراز سے اٹی ہوئی ہے، مجھے انفرادی اور اجتماعی سطح پر بچ بولنا بھی آتا ہے۔ میں رسالہ ”نقوش“ کے ”شخصیات نمبر“ میں اپنے محسن مولانا عبد المجید سالک اور اپنی بہن ہاجرہ مسرور کے خاکے لکھ چکا تھا۔ (چنانچہ سوانح نہیں تو شخصیات سے متعلق اپنی یادیں سمیٹنے کو عملی صورت دینے کا تہیہ کر لیا۔)

”میں نے اپنے پیارے اور محترم دوست سعادت حسن منٹو کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا جو حیرت انگیز اور مسرت بخش حد تک مقبول ہوا۔ اس کے بعد میں نے ن م راشد، فیض احمد فیض، سید امتیاز علی تاج، سید ضمیر جعفری، ابنِ نشاء، خدیجہ مستور، محمد طفیل اور سجاد سرور نیازی کی شخصیتوں کو سمیٹا۔ مجھے مولانا غلام رسول مہر، مولانا چراغ حسن حسرت اور حکیم محمد سعید کا بھی کسی حد تک قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں بھی اپنے تاثرات سپرد قلم کیے اور یوں میں تیرہ اہم شخصیات کے یہ خاکے ”میرے ہم سفر“ کی صورت میں یکجا کرنے میں کامیاب ہوا۔“ (100)

عامر سہیل ”میرے ہم سفر“ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

☆ عامر سہیل (ایبٹ آباد):

”احمد ندیم قاسمی کے خاکے، فنِ خاکہ نگاری کے لیے لازمی اوصاف سے مزین ہیں یعنی لطف و بے ساختگی، اپنائیت، ذاتی نقطہ نظر، بذلہ سنجی، مشاہدہ، شخصیت کے باطن کا مطالعہ، بے تکلفی، واقعات کے انتخاب میں سنجیدگی، حسن ترتیب اور ذمہ دار خاکہ نگار کے لیے مخصوص ضروری خوبی، سچ بولنا،“

”احمد ندیم قاسمی کا خاکہ نگاری سے متعلق اپنا ایک خاص وژن ہے۔ وہ براہ راست شخصیت کے باطن میں جھانکتے ہیں اور ایسا صرف قریبی تعلق کے باعث ہی ممکن ہے، قاسمی صاحب کے ہاں کسی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جو زیر مطالعہ شخصیت کے نوع بہ نوع زاویے دکھاتا چلا جاتا ہے۔ وہ شخصیت کے نقوش ابھارنے کے لیے غیر ضروری مواد کا سہارا لینے کے قائل بالکل نہیں ہیں۔ اس کے بجائے وہ کم سے کم مواد کے سہارے شخصیت کے اعماق تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، قاسمی صاحب کا فنِ خاکہ نگاری مرکز آشنا یعنی Center Oriented بھی ہے۔ ان کا فن پر مکتبیس کی طرح ہر شخصیت کی باطنی روشنی حاصل کر کے لوگوں تک عام کر دیتا ہے۔ ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے بلکہ اس صنف میں بھی وہ اپنے پیش رو اور معاصرین خاکہ نگاروں سے بلند نظر آتے ہیں۔“

”احمد ندیم قاسمی کا اسلوب خاکہ نگاری تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے۔ فالتو الفاظ و تراکیب سے دامن بچا کر چلنا، ڈرامائی صورتحال پیدا کرنا اور ہلکا پھلکا مزاح، ان کے تقریباً ہر خاکے میں نظر آتا ہے۔ الفاظ کا استعمال ایسا چمکتا ہے کہ ہر خاکہ نگار اس پر رشک کر سکتا ہے۔ اسلوب کی یہ مطبوع اور مصنوع صفات بہت کم تخلیق کاروں کو ارزانی ہوئی ہیں۔ قصہ کوتاہ ”میرے ہم سفر“ اقلیم خاکہ نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔“ (101)

☆ منصورہ احمد:

” (ندیم صاحب کے خاکے دراصل) ایک بڑے آدمی کی رائے ہے دوسرے بڑے

آدمی کے بارے میں۔ اختلاف کا حق یقیناً ہمارے پاس ہے مگر اختلاف کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ کتاب ”میرے ہم سفر“ میں ایسے مقام بھی آئیں گے جن سے آپ کو اختلاف ہو لیکن براہ مہربانی یہ ضرور ذہن میں رکھیے گا کہ علمی متانت اور شائستگی سے کیا گیا اختلاف جذباتی ہاؤ ہو سے زیادہ خوبصورت اور پائیدار ہوتا ہے۔“ (106)

☆ ڈاکٹر ماہید قاسمی:

”میرے باجی یعنی احمد ندیم قاسمی اپنے احباب میں شامل، ہم عصراً مور شخصیات کی یادوں پر مشتمل سوانحی خاکوں کی اپنی دلچسپ، معلوماتی اور سنجیدہ کتاب ”میرے ہم سفر“ کے بعد اس کی دو اور جلدیں ترتیب دے رہے تھے۔ باجی نے ”میرے ہم سفر“ کے سر آغاز میں تحریر کیا تھا:

اس سلسلے کی دوسری جلد ایسی ہی مشہور و مقبول شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہوگی۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے اور میں نے ان میں سے بیشتر کے بارے میں اپنی یادیں تحریر بھی کر رکھی ہیں۔“

”گھر میں گفتگو کے دوران باجی اکثر اپنے دوستوں، شاعروں، ادیبوں، فنکاروں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں ہمیں بہت سی باتیں بتاتے۔ اُن کی گفتگو کا انداز اس قدر دلچسپ اور پرکشش ہوتا کہ زندگی سے بھرپور یہ شخصیات ہمیں اپنے باجی کے ہم قدم چلتی پھرتی، ہنستی بولتی محسوس ہوتیں، باجی نے ان شخصیات کی یادوں کو اپنی تحریروں میں سمیٹنا بھی شروع کر دیا تھا جب کہ کچھ کے بارے میں ابھی مزید تفصیل لکھنا تھی، انھوں نے تیرہ سوانحی خاکوں کا ایک مجموعہ ”میرے ہم سفر“ کے عنوان سے شائع کروا دیا تھا۔ اب اس کی دوسری جلد کے طور پر ان کے تحریر کردہ انیس شخصی خاکوں پر مشتمل مجموعہ ”میرے ہم قدم“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔“

”(”میرے ہم قدم“) کے مطالعے سے خود احمد ندیم قاسمی کا خوبصورت شخصی خاکہ بھی ابھر آئے گا اور ایک طرح سے ان کی خودنوشت کے کچھ نقوش بھی واضح ہو

جائیں گے۔ یوں اس مجھوے میں ایک نوے برس کی بھرپور زندگی کے شب و روز کی کچھ دلچسپ اور دعوتِ فکر دیتی جھلکیاں بھی محفوظ ہو گئی ہیں۔“ (103)

☆ ڈاکٹر انوار احمد:

”احمد ندیم قاسمی کی تخلیقی شخصیت متنوع رنگ تھی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے معیار اور مقدار کے لحاظ سے احمد ندیم قاسمی نے اپنی طویل زندگی میں جتنا تخلیق کیا۔ اس کا مقابلہ ان کا کوئی معاصر نہیں کر سکتا۔ ان کی بھرپور شخصی اور فکری زندگی میں یوں تو ہر لمحہ اپنی جگہ معنویت سے لبریز ہے۔ محرومیاں بھی ان گنت ہیں۔ مگر ان کی جاوداں حس مزاج اور تخلیقی و فورماند نہیں پڑا۔

”میرے ہم قدم“ میں میاں عبدالحمید کے بارے میں قاسمی صاحب کے پیرایہ عقیدت میں معصومیت ضرور ہے مگر اس کی مطابقت عبدالحمید سالک کے سلسلے میں دعوے (”میں ان کا عقیدت مند تھا لیکن میری عقیدت اندھی نہیں تھی، نہایت با شعور تھی۔ میں نے تو خدا کو بھی حسبِ مقدور سمجھ لینے کے بعد مانا۔“ ”میرے ہم سفر“۔ اساطیر۔ لاہور۔ 2007ء۔ ص: 30) سے نہیں ہوتی۔ اس طرح شیخ خورشید احمد خان اور میر خلیل الرحمن کا خاکہ بھی یک طرفہ ہے تاہم اختر حسین جعفری کا خاکہ انھوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے لکھا ہے اور اس میں ان کی ایک اور محبوب شخصیت علی عباس جلال پوری کی تصویر کشی بھی بڑی عمدگی سے ہوئی ہے۔ مختار صدیقی اور ریاض شاہد کے خاکوں میں ان کی ایک بے حد اہم نقاد کی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ (104)



## مدتیم ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن:

☆ احمد مدتیم قاسمی:

”1946 کے دوران سجاد سرور نیازی نے جوان دنوں پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور ان کے گھرانے سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ مجھے پشاور بلوا بھیجا۔ میں وہاں بحیثیت سکرپٹ رائٹر 1948 کے آغاز تک کام کرتا رہا۔ وہیں پشاور کے دوستوں فارغ بخاری، رضا ہدائی، خاطر غزنوی وغیرہ کے علاوہ نوجوان محسن احسان اور احمد فراز سے بھی ملاقات ہوئی اور ریڈیو سٹیشن کے ایک اہلکار اور نہایت عمدہ غزل گو حمید نسیم سے تعلق پیدا ہوا۔ پشاور میں قیام کے دوران میں چوہدری نذیر احمد کا نیا رسالہ سویرا بھی مرتب کرتا رہا۔ اس کے ابتدائی تین شمارے میرے مرتب کردہ ہیں۔“ (105)

”13 اگست 1947 کو جب رات کے بارے بجے آل انڈیا ریڈیو کو پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس میں بدلنا تھا تو پشاور ریڈیو سٹیشن کا سارا سٹاف سٹیشن کے لان میں جمع تھا۔ سٹاف کے ایک رکن (پروگرام اسٹنٹ) شوکت نے عمارت کے چھت پر کھڑے ہو کر ریوالور سے ہوائی فائر کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ سجاد سرور نیازی بھائی (جو وہاں کے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) نے سبز ہلالی پرچم لہرایا اور اس کے بعد ایک گھنٹے کا وہ ریڈیو پروگرام شروع ہوا جو میری زندگی کی چند لطیف یادوں میں سے ایک عزیز یاد ہے۔ آزادی، قیام پاکستان اور قائد اعظم کی عظیم رہنمائی کے موضوعات پر سبھی ترانے میں نے لکھے، سبھی کی دھنیں سرور بھائی نے ترتیب دیں اور ان میں سے ایک یاد دہانے خود سرور بھائی نے گائے۔ یوں مجھے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ سرور بھائی کا دھن ترتیب دینے کا انداز کیا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے جس طرح شاعر تخلیق شعر کے وقت ایک عجیب لذت آمیز کرب میں سے گزرتا ہے، یہی عالم سرور بھائی کا تھا۔ ان دنوں ٹیپ کرنے کا رواج نہ تھا اور ریکارڈ بھی ہاتھ روک کر استعمال کیا جاتا تھا مگر کاش ریڈیو سٹیشن پشاور میں اس (یادگار) دن کے ان ترانوں کے ریکارڈ محفوظ ہوں۔“ (106)

”14 اگست 1947 کو حاصل ہونے والی آزادی سے اور ریڈیو پاکستان پشاور کا آغاز اپنے لکھے ترانوں اور نغموں سے ہونے کے بعد (دنوں تک میں سرشاری کے



عالم میں رہا اور پھر ایک دن جب پشاور شہر میں ہندوؤں سکھوں کے محلے کو آگ لگا دی گئی میں صدر پشاور میں حواس باختہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا، جب ایک دوست کی منہی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی، مجھ سے چٹ گئی اور روتے ہوئے بولی، ”چچا جان وہ دیکھئے آسمان جل رہا ہے۔“ واقعی آسمان جل ہی رہا تھا، بچی نے غلط نہیں کہا تھا۔ آسمان جل گیا اور اس کی بجھی ہوئی راکھ ان ہی پر آ کر گری جنہوں نے اسے دیا سلائی دکھائی تھی۔ ملک کی سیاسی صورت حال نے مجھے قدم قدم پر چکرا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم کہاں جا کر رکھیں گے؟ اس وقت میں نے یہی استفہامیہ ایک رباعی میں منتقل کر دیا تھا:

کیا اپنا سراغ خود نہیں پاؤ گے؟  
کیا پھر کوئی اجنبی بلا لاؤ گے؟  
یہ راہ تو اس موڑ پر مڑ جائے گی  
اے اہل وطن، اب کہاں جاؤ گے؟

میں اپنے وطن کے گیتوں اور رقصوں کی کہانیاں پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے ہم وطنوں کی امنگوں اور ولولوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ روز نئے سے نئے فیچروں کے ذریعے اپنے رہنماؤں کو ان کے وعدے یاد دلانا رہوں مگر جب میں نے ان امور میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا تو میں پشاور (ریڈیو سٹیشن) سے بھاگ آیا اور لاہور میں آ کر بہت کچھ لکھا۔“ (107)

☆ اسلام شاہ:

”اس کے بعد اگرچہ باقاعدہ طور پر قاسمی صاحب ریڈیو سے منسلک نہ تھے، البتہ مختلف حیثیتوں سے مکمل تعاون فرماتے رہے، قاسمی صاحب نے ریڈیو کالم کا آغاز کیا۔ ریڈیو کے لیے عالمی وادبی پروگرام لکھے اور ان میں شرکت فرمائی۔ مشاعروں میں شرکت کی اور ان کی صدارتیں کیں۔ ریڈیو کے موسیقی کے شعبہ کے زیر اہتمام قاسمی صاحب کے لکھے ہوئے مقبول ترین نغمے جو پاکستان کے نامور گلوکاروں نے گائے ان کی کچھ تفصیل یہ ہے:

ے وہ کوئی اور نہ تھا، چند خشک پتے تھے۔ (غلام علی)  
 ے کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا۔ (انصرت فتح اور مجاہد مبارک قوال اور ہمنوا)  
 ے خدا کرے کہ مری ارض پاک پر اترے۔ (مہنا ز اور ساتھی)  
 ے شام کو صبح چمن یاد آئی۔ (غلام علی)  
 ے انداز ہو، ہو تیری آواز پا کا تھا (غلام علی)  
 ے گل تیرا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں۔ (پرویز مہدی)  
 ے زندہ ہے پاکستان تو ہم سب زندہ ہیں، پائندہ ہیں۔ (نذیر بیگم، سلیم رضا اور ساتھی)  
 ندیم صاحب کی خدمات کے اعتراف میں ریڈیو پاکستان نے سٹیشن ڈائریکٹر ستار سید کی  
 زیر نگرانی خوبصورت تعزیتی پروگرام پیش کیا۔ (108)  
 پروفیسر سلیم الرحمن:

”مجھے احمد ندیم قاسمی سے اس وقت ذہنی رقابت کا احساس شدت سے ہوتا، جب میں  
 ریڈیو پاکستان لاہور میں بحیثیت اناؤنسران کی خوبصورت اور عمدہ سلیقہ سے گائی غزلوں  
 کی اناؤنسمنٹ کرتا تھا، ندیم صاحب کی یہ غزل پرویز مہدی نے کیا خوب گائی ہے۔“

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے

اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

”شاید بہت ہی کم شائقین اور قارئین کو اس بات کا پتہ ہو گا کہ برسوں پہلے (تقریباً  
 سینتیس برس قبل) احمد ندیم قاسمی کی غزل برصغیر پاک و ہند کی مایہ ناز مغنیہ ملکہ موسیقی  
 روشن آراء بیگم نے گائی تھی۔ اس کا تذکرہ خوبصورت اور لائق مطالعہ تصنیف ”ملکہ موسیقی  
 روشن آراء بیگم“ کے صفحہ نمبر ساٹھ پر یوں مذکور ہے۔“

”ملکہ موسیقی نے ایک غزل کا انتخاب کیا ”انداز ہو، ہو تیری آواز کا تھا“ اس غزل کو روشن  
 آراء بیگم نے اپنے ترتیب دیے ہوئے راگ ”نورانی“ میں سجا کر 23 اگست 1969  
 کو راولپنڈی ٹیلی ویژن پر پیش کیا۔ ناظرین نے اس پروگرام کو بہت پسند کیا۔ خدامعلوم!  
 پاکستان ٹیلی ویژن میں یہ انمول رتن محفوظ و مکنون ہیں یا نہیں!“

”تحقیقی نقطہ نظر سے ہمیں قاسمی صاحب کی فلمی وابستگی کا اولین سراغ ایک غیر ریلیزڈ

فلم ”ادھورے خواب“ میں بحیثیت نغمہ نگار ملتا ہے۔ یہ فلم 1947 میں مکمل ہو گئی تھی، مگر ریلیز نہ ہو سکی۔ قاسمی صاحب کا لکھا ہوا یہ نغمہ اپنے عہد کے جانے پہچانے بڑے مشہور معروف گلوکار جی ایم درانی نے گایا تھا۔ موسیقار شیا م سندر تھے۔ نغمے کے بول تھے ”چاہنے والوں کو ملتے نہیں خوشی ہو یا غم۔ اسی دور میں فلم ”دھرم پتی“ میں بطور کہانی نگار و مکالمہ نگار اور فلم ”بخارہ“ میں بطور کہانی نگار اور نغمہ نگار ان کا نام ملتا ہے۔ لیکن یہ فلمیں مکمل نہ ہو سکیں۔ قیام پاکستان کے بعد 1953 میں بننے والی فلم ”آغوش“ (اداکار: صبیحہ، سنتوش، علاؤ الدین) کے مکالمے سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے مل کر لکھے۔ یہ فلم ریلیز بھی ہوئی۔ اس کے بعد فلم ”دورستے“ (اداکار: بہار، اعجاز، طاش، ایم اسماعیل) کے مکالمے لکھے یہ فلم یکم اکتوبر 1961 کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ پانچ برس بعد ہمیں مشہور و معروف خوبصورت فلم ”لوری“ (اداکار: زیبا، محمد علی، سنتوش کمار، طلعت صدیقی، سلونی) میں قاسمی صاحب کا اسم معتبر بطور مکالمہ نگار نظر آتا ہے۔ اس فلم میں انھیں بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ دیا گیا۔ چائلڈ سٹار روفی نے بھی بڑا عمدہ اور معیاری کام کیا۔ قاسمی صاحب کے عمدہ ہموثر اور دلکش مکالمات پر مبنی اس فلم کی 1966 میں نمائش ہوئی۔“

”1970 میں فلم ”درندہ“ کے لیے موسیقار گل حیدر (ایس گل) نے عمدہ طرزوں سے قاسمی صاحب کے گیتوں کو علی بخش ظہور، مہدی حسن اور نذیر بیگم کی آوازوں میں ڈھالا تھا۔ 1976 میں پنجابی فلم ”خونٹاک“ کے لیے صفدر حسین کی موسیقی میں مالا نے قاسمی صاحب کا گیت ریکارڈ کروایا۔ ایک فلم ”ہزار سال“ کے گیت بھی احمد ندیم قاسمی نے لکھے (اداکار فلم ساز دلچیت مرزا کی فلم کے گانے ندیم صاحب نے لکھے جنھیں ملکہ ترنم نور جہاں نے ریکارڈ بھی کروایا لیکن فلم ریلیز نہ ہوئی)۔“

”1975 میں بننے والی پنجابی فلم ”وحشی جٹ“ اور بعد میں ”مولا جٹ“ ندیم صاحب کے شہر آفاق افسانے ”گنڈاسا“ کی تھیم پر بنائی گئی۔ اس لیے اس فلم پر قاسمی صاحب کو بہترین کہانی نویس کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اسی طرح 1978 میں بننے والی شباب کیرانوی کی فلم ”نذرانہ“ کی کہانی کی اصل بنیاد قاسمی صاحب کے افسانے ”فیشن“ پر

رکھی گئی تھی (جب کہ سیف الدین سیف نے قاسمی صاحب کے نہایت مقبول افسانے ”پریشسترنگھ“ پر فلم ”کرنا رنگھ“ (ادا کار: علاؤ الدین) بنائی تھی۔) (109)

☆ ڈاکٹر ناہید قاسمی:

”آج سے تقریباً پینتیس چالیس برس قبل فلموں کے حوالے سے آغا گل صاحب سے ابا جی کی کچھ نشستیں (قتیل شغائی صاحب کی موجودگی میں) گھر پر بھی رہی تھیں اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ تین چار کہانیاں ڈسکس بھی ہوئی تھیں۔ آغا گل سے طے شدہ کہانی کے مطابق لکھا، قاسمی صاحب کے سکرین پلے کا ایک سکرپٹ ان کے پرانے کاغذات میں رکھا ملا جب تسلیم احمد تصور صاحب نے اپنے رسالے کے لیے ندیم صاحب کی کوئی ایسی تحریر دینے کو کہا جو ابھی کہیں شائع نہ ہوئی ہو تو میں نے اس سکرین پلے کا ذکر کیا ان کے کہنے پر ندیم صاحب کے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے گئے اس سکرین پلے کے مکمل مسودے کا فوٹو پرنٹ انھیں بھجوایا دیا۔ تصور صاحب کا کہنا تھا کہ یہ سکرین پلے احمد ندیم قاسمی کے تخلیقی کاموں کی ایک مختلف جہت کو سامنے لائے گا۔“ (یہ ان کے رسالے ”سورج“ میں شائع بھی ہوا۔)

”یہ اس زمانے کے فلمی رواج، فیشن اور پسند کے مطابق سادہ سی فلمی کہانی کا سکرین پلے ہے، لیکن ندیم صاحب نے اسے خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔“ (110)

☆ ڈاکٹر حسن وقار گل:

”قاسمی صاحب قیام پاکستان سے قبل دو فلموں 1940 میں ”دھرم تپتی“ اور 1941 میں ”بخارہ“ کے گیت اور مکالمے اور قیام پاکستان کے بعد فلم ”آغوش“، ”دوراستے“ اور ”لوری“ کے مکالمے لکھ کر فلم نگاری میں بھی اپنا نام لکھوا گئے۔“ (111)

☆ محمد خالد اختر:

”ندیم نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی اپنی لیاقتوں کا استعمال کیا۔ اس نے انگریزی کے گلابرٹ اور سیلوواں کے ڈھب پر اردو ”اوپیرا“ لکھے ہیں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم اسکرپٹ روائی سے اور قلم برداشتہ تحریر کیے ہیں۔“ (112)



☆ اولیس نصیر:

”احمد ندیم قاسمی اس لحاظ سے منفرد نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ادب کے بے شمار شعبوں میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ادب ہو یا ثقافت، اخبار ہو یا رسائل، ٹیلی ویژن ہو یا فلم وہ سب کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے، خاص طور پر ان کے مشہور افسانے ”پرمیٹر سنگھ“ پر بننے والی فلم ”کرنا سنگھ“ نے نہ صرف قبول عام سند حاصل کی بلکہ فلم بنانے والوں کے لیے نئی راہیں متعین کیں۔ اس کے تیس سال بعد ان کے افسانے کے مرکزی خیال پر بننے والی فلم ”مولا جٹ“ نے پنجابی فلموں کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا، ٹیلی ویژن پر ان کی مشہور کہانیوں پر مشتمل ڈراموں کا ایک ایسا سلسلہ چلا جسے ناظرین نے کافی عرصہ تک ”قاسمی کہانی“ کے نام سے یاد رکھا۔ ٹی وی پر ان کا مشہور ڈرامہ ”گنڈا سا“ شہرت کی تمام حدیں پار کر گیا۔ پروڈیوسر، ہدایت کار بلکہ اداکار بھی ان کی کہانی یا ڈراموں میں کام کرنے کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔“ (113)

☆ سہیل احمد (اداکار):

”احمد ندیم قاسمی کے تخلیق کردہ کرداروں کو ادا کرنے کی کوشش کرنا ایک اعزاز ہے۔ ”پرمیٹر سنگھ“ کے لیے ماسٹر رول کرنے پر احمد ندیم قاسمی صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ اس افسانے کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے والے ڈائریکٹر ایوب خاور کو بھارتی فلم انڈسٹری سے گلزار صاحب، شبانہ عظمیٰ اور جاوید اختر سمیت دوسرے فنکاروں نے بھی تعریفی ٹیلی فون کیے اداکار منور سعید نے ”گنڈا سا“ میں مولا کا کردار ادا کرنے اور ریحانہ صدیقی، خیام سرحدی اور مہر النساء نے ”ست بھرائی“ میں رول کرنے کو اپنے لیے اعزاز کہا اور قاسمی صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔“ (114)

ندیم صاحب کے خاص طور پر ٹی وی کے لیے لکھے ہوئے ڈراموں میں ”جیب کترا، سلٹی ستارے، اپنے پرانے“ وغیرہ بھی ”قاسمی کہانی“ کی طرح بہت مقبول ہوئے اور ناظرین کی فرمائش پر کئی کئی بار ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ ندیم صاحب نے مختار صدیقی کی فرمائش پر 23 مارچ یوم پاکستان کے حوالے سے لاہور ٹی وی کے لیے ایک منظوم فچر بھی لکھا تھا۔ جسے خوبصورتی اور اہتمام سے پیش کیا گیا تھا۔ ندیم صاحب نے 2005 تک ریڈیو پاکستان لاہور سے ہفتہ وار سماجی اور ثقافتی کالم پیش کیا، سامعین کو اس کا انتظار رہتا۔ یوں ندیم صاحب نے ریڈیو سے تا عمر رابطہ رکھا۔



## مندیم خطوط:

مندیم صاحب کے خطوط کی اہمیت ان کی ادبی شخصیت کے باقی پہلوؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ ان سے ان کی فنی، ادبی اور شخصی انفرادیتوں کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ یہ خط ایک شاعر، ادیب، دانشور اور ادبی تہذیبی و ثقافتی رہنمائے تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط کی قابل قدر اہمیتیں ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ خط لکھے ہیں:

- 1۔ ادبی دنیا میں داخل ہونے والے نسل نو کے نمائندوں کی حوصلہ افزائی اور تربیت کے لیے۔
- 2۔ وہ سب کچھ جس کا شعر و فسانے میں اظہار بوجہ ممکن نہیں، اس کا اظہار کے لیے۔
- 3۔ اپنے قریبی دوست احباب اور عزیزوں، رشتہ داروں سے ذاتی باتیں کہنے سننے کے لیے۔
- 4۔ خفگی اور ناگواری کے سنبھلے ہوئے جزی اظہار کے لیے۔

5۔ کچھ ضروری وضاحتوں کے لیے جو انھوں نے اپنی طرف سے بھی دیں اور دوسروں سے بھی مانگیں، مندیم کے خطوط پر مبنی کتب اور رسائل میں خاص گوشے ان کی زندگی میں شائع بھی ہوئے اور اب بھی آہستہ آہستہ کافی تعداد میں ان کے خطوط منظر عام پر آ رہے ہیں۔ مندیم کی مکتوب نویسی پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر مختلف مقالوں کے لیے ریسرچ بھی جاری ہے۔ یوں جلد ہی مندیم کی مکتوب نگاری کے اہم پہلو نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آسکیں گے۔

مندیم خطوط کے متعلق کچھ آراء ملاحظہ کیجیے:

☆ ڈاکٹر عبادت بریلوی:

”قاسمی صاحب نے قیام پاکستان سے قبل جو خطوط لکھے وہ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں ان کا بے پایاں خلوص اپنے معراج کمال پر نظر آتا ہے، اس کے باوجود کہ وہ اردو کے ایک رسالے ”نقوش“ کے ایڈیٹر تھے۔ لیکن وہ نئے لکھنے والوں کی اہمیت کو محسوس کرتے تھے۔ خاص طور پر ایسے نئے لکھنے والوں کی، جن میں انہیں زندگی و ادب کو سمجھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم نظر آتی تھی۔“

”یہ خطوط اپنے موضوعات کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں اس لیے میں نے قاسمی صاحب کے ان خطوط کو محفوظ رکھا۔“ (115)

☆ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی:

”ایڈیٹر کی حیثیت سے قاسمی صاحب کی ایک بڑی خوبی تھی جس پر میں نے ہمیشہ رشک کیا۔ قلمی معاونین کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ آخر عمر تک ان کا سوادِ خط بہت پاکیزہ

اور حروف کی نشست بہت پختہ تھی اور جو تحریر انھیں پسند آتی اس کی تعریف کرتے تھے۔  
خواہ وہ ان کے ادبی موقف کی حمایت میں ہو یا نہ ہو“ (116)

☆ خورشید ربانی:

”شعر و ادب سے تعلق قائم ہونے کے اولین دنوں میں مجھے سب سے پہلی اور بڑی خوشی حاصل ہوئی وہ جناب احمد ندیم قاسمی کا خط تھا، ندیم صاحب کی شاعری کے ساتھ ساتھ انسانی عظمت اور وسعت قلبی کے یہ وہ ابتدائی نقوش تھے جنہوں نے مجھے خرید لیا۔ محمد فاضل، ندیم صاحب کے مخلص اور دیرینہ دوست تھے۔ ان کے نام آئے ندیم صاحب کے خطوط بتوسط غالب مقصود صاحب (جو فاضل صاحب کے بھتیجے ہیں) دیکھنے کے بعد میں نے درخواست کی کہ یہ اہم تحریریں ہیں۔ انہیں شائع اور محفوظ ہونا چاہیے۔ عظیم ادیب ندیم صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہر تحریر محفوظ ہونا چاہیے۔ ان کا لکھا کوئی لفظ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ ان خطوط کا انداز بیان سادہ ہے۔ کہیں کہیں سنجیدگی کے ساتھ دوستانہ جذبات اور مزاح کے پھول بھی مہکتے نظر آتے ہیں۔ یہ خطوط ”آدھی ملاقات، ندیم کے خط فاضل کے نام“ قاسمی صاحب کی ابتدائی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔“ (117)

☆ پروفیسر فتح محمد ملک:

”ان کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر نو جوان اردو ادیبوں اور شاعروں کی ادبی اور شعری تربیت میں بڑے تخلیقی انداز سے حصہ لیتے رہے۔ اپنے اس فیضان کی بدولت ہی وہ ہمارے عہد کی بہت بڑی ادبی شخصیت بن گئے تھے۔ کم از کم چار نسلوں کی ادبی تربیت میں ان کا فیضان شامل رہا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ رخ ان کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ جاگرا ہو رہا ہے۔ جوں جوں ان کے خطوط منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ رخ نت نئی آب و تاب اختیار کرتا چلا آ رہا ہے۔“ (118)

☆ خواجہ عبدالرحمن طارق:

”احمد ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ کے درمیان مراسلت کا سلسلہ پینتالیس سالوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے یہ خط اس لحاظ سے اہم بلکہ بہت اہم ہیں کہ ان کے مطالعے سے ایک بڑے افسانہ نگار اور ایک بڑے شاعر کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں سے شناسائی کا موقع ملتا ہے جو عام طور پر ایک عام قاری کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔“ (119)

## مندیم ’فنون‘ اور مندیم ادارتیں:

احمد مندیم قاسمی نے سب سے پہلے 1931 سے 1935 کے دوران طالب علمی کے زمانے میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے میگزین ’’نخلستان‘‘ کے اردو حصے کی ادارت کی، وہ انگریزی حصے کے بھی مدیر رہے۔ پھر 1942-46 کے عرصے میں لاہور سے بچوں کا رسالہ ہفت روزہ ’’پھول‘‘، خواتین کا رسالہ ’’تہذیب نسواں‘‘ اور ادبی رسالہ ماہنامہ ’’ادب لطیف‘‘ کے مدیر رہے۔ 1947-48 میں ادبی رسالہ ’’سوریا‘‘ کے ابتدائی چار شمارے مرتب کیے۔ 1948 میں معروف ادبی رسالہ ’’نقوش‘‘ لاہور کا آغاز کیا اور 1950 تک اس کے ابتدائی دس شماروں کے مدیر رہے۔ 1958 میں ماہنامہ ’’سحر‘‘ ترتیب دیا۔ 1953-59 کے برسوں میں معتبر روزنامہ ’’امروز‘‘ کی ادارت کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔ 1963 میں اپنے انتہائی مقبول اور اعلیٰ معیاری ادبی رسالے ’’فنون‘‘ کا آغاز کیا اور انتقال تک اس کے 126 شمارے ترتیب دیے جب کہ وہ اس کا 127 واں شمارہ مرتب کر رہے تھے۔ 1977-78 میں رسالہ ’’اقبال‘‘ کے اعزازی مدیر رہے اور 1974 سے 2006 تک تحقیقی و تنقیدی ادبی رسالہ ’’صحیفہ‘‘ کے مدیر رہے۔

’’فنون‘‘ مندیم کا ذاتی رسالہ تھا لیکن اس نے اعلیٰ معیار کی وجہ سے ایسا پسندیدہ مقام و مرتبہ حاصل کر لیا کہ اس کا ہر لکھنے والا اس کو اپنا جانتا اور اسی لیے اس پر اپنا حق واجب سمجھتا تھا۔ اس طرح ’’فنون‘‘ کو اپنی تخلیقات میں سے بہترین کے ذریعے تعاون دیا جاتا البتہ ان میں سے کچھ مندیم کو اپنا ہی ذاتی رسالہ، اپنی پسند سے ترتیب دینے میں رکاوٹ بن کر خود اپنی مرضی کرنا چاہتے۔ مثلاً ان سے کہا جاتا کہ مجھے فلاں سے پہلے شائع کریں یا پھر یہ کہ فلاں میرا مخالف ہے اس کی کوئی چیز شامل ہی نہ کریں۔ بہت لحاظ کرنے والی طبیعت کے باوجود، منصف مزاج اور حوصلہ مند مندیم اپنے ہی معیار کو ترجیح دیتے جو ان کا حق تھا لیکن یہ لوگ سوچے سمجھے بغیر اور انصاف سے کام لیے بغیر خفگی کا اظہار کر دیتے۔ اس پر مندیم افسردہ ہو جاتے لیکن ہمت نہ ہارتے کیوں کہ انھیں یقین ہوتا تھا کہ یہ سب، کسی وقت ٹھنڈے دل سے بلا تعصب جب غور کریں گے تو مندیم کا موقف درست تسلیم کر لیں گے اور ایسا اکثر ہوا بھی کرتا تھا۔ میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مندیم کے بعد ان کے بارے میں ادیبوں، شاعروں اور دیگر معززین نے اپنی کچھ تحریریں کسی اور رسالے کی بجائے رسالہ ’’فنون‘‘ ہی میں شائع ہونے کے لیے بھجوائی تھیں۔ اس کا ثبوت ان مضامین میں موجود خود ایسے الفاظ ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ تحریریں واقعی ’’فنون‘‘ کے لیے ہیں۔ لیکن

اگر یہ ”فنون“ کے لیے مختص کی جانے والی تحریریں، فنون کے ندیم نمبر کی بجائے مونتاج کے تحت ”نذر ندیم“ کے عنوان سے یکجا کر کے شائع کر دی گئی ہیں تو بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا ہے کیوں کہ اس طرح سے یہ قیمتی تاریخی تحریریں محفوظ ہو گئی ہیں۔ الحمد للہ!۔ یہاں اب ندیم کی مدیرانہ صلاحیتوں اور تحریک بن جانے والے نہایت اہم ادبی رسالے ”فنون“ کی خوبیوں اور اہمیتوں کے بارے میں سنکڑوں ہزاروں میں سے چند آرا پڑھتے ہیں:

ڈاکٹر ناہید قاسمی:

”یہ انتہائی عمدہ معیاری ادبی پرچہ اپنے آغاز سے 43 برس تک اعلیٰ معیار کو برقرار رکھتے ہوئے تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا رہا..... ”فنون“ کا یہ معیار یک دم حاصل نہیں ہو گیا تھا اس کے پیچھے خدا داد صلاحیتوں کی مالک ایک نابغہ روزگار ہستی کا برسوں کا طویل تجربہ بھی شامل تھا۔“ (120)

”فنون“ ندیم صاحب کی وجہ سے ”فنون“ تھا۔ وہ بہت سے رسالوں کے کامیاب مدیر کے طور پر تجربہ کار ایڈیٹر تھے۔ بطور مدیر وہ اس رسالے کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کے لیے جانفشانی سے کام کرتے تھے۔ اہم شاعروں اور ادیبوں کی نگارشات شامل کرنے کے لیے انتظار کرتے کہ وہ اپنی تخلیقات انہیں بھیجیں۔ نہ ملتیں تو رابطہ کرتے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لیے وہ ہر اچھا لکھنے والے سے اس کی تخلیق کا مطالبہ کرتے، یوں ان کو حوصلہ اور اعتماد دیتے جس سے نئے لکھنے والوں کو مزید لکھتے رہنے کی تحریک ملتی۔ وہ دراصل نئے فنکاروں کے ذریعے ادب کا مستقبل محفوظ کر رہے تھے۔ وہ ایک جوہر شناس ادیب تھے۔ ان کا انتخاب عمدہ ہوتا تھا۔ ایک مدیر کے طور پر رسالے میں شامل مواد کی نوک پلک سنوارنا اور ترتیب میں حفظ مراتب کا خیال رکھنا یقیناً ایک محنت طلب مرحلہ ہوتا تھا مگر وہ مکمل دیانتداری اور انصاف سے کام لیتے۔“ (121)

☆ پروفیسر شمیم حنفی (نئی دہلی۔ بھارت)

”فنون“ ایک رسالہ ہی نہیں، ایک تاریخ اور آدرش ہے۔“

(فنون گولڈن جوبلی نمبر 2014-ص 418)



☆ آفتاب اقبال شمیم:

”وہ انسان پرستی یا عام انسان سے بے لوث محبت جو احمد ندیم قاسمی کی تحریروں کا بنیادی محرک تھی۔ اس کی شخصیت سے ایک فیض جاریہ کی طرح تادمِ مرگ پھوٹتی رہی۔ میں یہاں ندیم کے بحیثیت انسان ذاتی اوصاف نہیں گنواؤں گا کہ ان کی ذاتی اوصاف اور شخصی نجابت و شرافت کا ذکر ادبی محفلوں، کالموں اور مضامین میں کثرت سے ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ میں نے احمد ندیم قاسمی کو ایک لٹری فی نو مینن (Literary Phenomenon) کے طور پر دیکھا ہے۔ میں گزشتہ چالیس برس سے بڑی حد تک باقاعدہ طور پر سہ ماہی ”فنون“ کا مطالعہ کر رہا ہوں“

”وہ لوگ جو میری طرح ”فنون“ سے منسلک رہے ہیں۔ میری تائید کریں گے کہ ”فنون“ ایک ادبی پرچے کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک ایک تنظیم کا نام ہے جس نے کم از کم دو نسلوں سے بڑے شہروں اور مضافات کے ادیبوں اور شاعروں کو باہم جوڑے رکھا۔ ”فنون“ چالیس برسوں کے زمانی احاطے میں قائم اس اکادمی کا نام ہے جس نے ادب کے تخلیقی کرشمے کو ماند نہیں پڑنے دیا۔ ادب کا معیار، معنویت، سنجیدگی، سچ بولنے کی جرأت اور راست سمت کی جستجو آج بھی وہی ہے جیسی پہلے ادوار میں تھی۔ اب ماننے تو کبھی کبھار نمودار میں آتے ہیں ہمارے ادب کی مجموعی صورت حال امید افزا ہے۔ اس معیشت زدگی اور کمرشیلائزیشن کے دور میں بھی ہمارے ادب نے غرورِ عشق کا بانگ پکپک گنوا یا نہیں وہ درویشی جس کی نیبہ، فیض، حبیب جالب، راشد، مجید امجد اور احمد ندیم قاسمی نے رکھی۔ اسی پر ادب کی عمارت بلند ہو رہی ہے، آپ یہ دیکھیں کہ سچا شاعر اور ادیب خواہ وہ مضافات کا ہو یا بڑے شہر کا، وہ طبعاً استغنا اور درویشی کی طرف مائل نظر آئے گا۔ اس کی ایک وجہ جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک جینون لیڈر ایک ملک کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے کسی شعبے میں ایک بڑے آدمی کی نمود ایک مثالیہ بن کر اس شعبے کو اپنے طلسم میں گرفتار کر لیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری تو اپنی جگہ لیکن اس کے چالیس سال کے مجاہدے اور دریافت نے ہمارے ادب کو مسلسل تخلیقی و فوری میں رکھا، اسے کسی انتہا پسندی یا بنیاد پرستی سے بچ کر



جمہور پسندی کے راستے پر چلنے کی سمت دکھائی اور میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب میں احمد ندیم قاسمی کی یہ چالیس سالہ شخصی واردات مستقبل میں کئی تحقیقی مقالوں کا موضوع بنے گی۔“ (122)

آفتاب اقبال شمیم کی نظم ”نیا“ ”فنون“ دیکھ کر“ کے کچھ مصرعے دیکھیے:

”فنون“ آیا ہے

اور لگتا ہے ایک میلہ سا لگ گیا ہے.....

.....ہنر دریچوں کے درمیاں سیر کرتی حیرت

دھنک کے رنگوں میں آٹھواں رنگ ڈھونڈتی ہے

.....

یہ کون برگد سا آدمی\* ہے (\* احمد ندیم قاسمی)

کہ جس کے زوان اور برکت سے

آج کے دورِ ناموافق میں

فصلِ حرف و ہنر مسلسل وجود پائے!

دورانِ باطن جو روشنی ہے، نمود پائے!!

☆ محمد کاظم:

”اپریل 1963 میں ”فنون“ کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا اس پہلے شمارے کی بسم اللہ ایک ایسے مضمون سے ہوئی جس کا عنوان تھا ”خدا“ جسے ترجمہ کیا تھا برصغیر کے مشہور عالم اور نقاد ابوالخیر مودودی نے۔ رسالے کے اس پہلے ہی مضمون سے مدیر ”فنون“ (احمد ندیم قاسمی) اپنے قارئین کو کوئی پیغام دینا چاہتے تھے، یہ سوال ہم سب کے سوچنے کا تھا۔“ ”ندیم صاحب نے محمد خالد اختر کی ”کاغذی مہم“ کے ابواب ”فنون“ میں شائع کر کے نیا انداز سفر نامہ متعارف و مقبول کروایا۔“ (123)

☆ ڈاکٹر خولہ محمد زکریا:

”امروز“ (روزنامہ) جیسے منفرد اخبار کو بطور مدیر سنوارنا نکھارنا اور مقبول بنانا ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا جب کہ ”فنون“ ادبی رسائل و جرائد میں ایک ممتاز

دہستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ (124)

☆ افضل تو صیف:

”فنون“ اور احمد تیم قاسمی ساری زندگی کی کمائی، شہرت کی دولت، علم و ادب اور شاعری احمد تیم قاسمی گھنے درخت کی طرح بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو سایہ دیتے تھے۔ ان کا پرچہ ایک معیار تھا۔ اس میں چھپ جانے کے بعد لکھنے والے کو ایک خود اعتمادی اور اپنے قلم پر اعتبار آ جاتا تھا“ (125)

☆ شبنم کلیل:

”میں سوچتی تھی کہ سب سے پہلے ان کی شخصیت کے جس پہلو کا ذکر ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ ان کے علم و فن سے تین نسلوں کو فیض پہنچا ہے۔ ادب کے حوالے سے انھوں نے لا تعداد لوگوں کی رہنمائی کی تھی۔ کتنے لوگ تھے کہ جن کو قلم پکڑنا انھوں نے سکھایا تھا اور کیسے کیسے نام ہیں کہ تحریر کے اعتبار سے معتبر شمار کیے جاتے ہیں۔ انہیں اعتبار بخشے میں قاسمی صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی نے کتنا بڑا کردار ادا کیا ہے۔“

”یہ سب کام وہ اپنی دوسری ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ کر رہے تھے وہ اپنے کام کو ایک مشن سمجھ کر کرتے تھے اور اسے صدقہ جاریہ گردانتے تھے۔ میں تمام صاحبان دل سے ایک سوال کرتی ہوں کہ وہ ایمانداری سے بتائیں کہ ملک بھر میں کسی اور نے ایسی سرپرستی کی؟ نہیں اپنے وقت اور انرجی کو دوسروں پر کون قربان کرے۔ یہ مشکل ترین کام ہے اور سب کے بس کا نہیں اور اہم بات یہ کہ کبھی بھول کر بھی کسی پر احسان نہیں جتلاتے تھے۔ اس کے لیے بہت حوصلہ، بہت بڑا دل چاہیے۔“ (126)

☆ حیات نظامی:

”نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی فرماتے رہے، کتنے نمایاں نام اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ پاکستانی ادیبوں، شاعروں کو ”فنون“ کے ذریعے دنیا کے ادب میں اہم مقام دلویا۔“

حیات نظامی صاحب نے 1976 میں رسالہ ”فنون“ پر نظم کہی اور پشاور میں ایک تقریب میں سنائی بھی۔ غالباً یہ پہلی نظم تھی جو کسی رسالے پر کہی گئی۔ ”فنون“ پر بعد میں بھی کئی نظمیں کہی گئیں۔ حیات نظامی صاحب کی نظم کے چند مصرعے درج ذیل ہیں:

وہ اک کتاب محبت ”فنون“ کا گلدان  
 جسے کہ بارہا پڑھا میں نے  
 وہ اک کتاب کہ ہر لفظ جس کا موتی ہے  
 وہ اک کتاب! جو چاہیں تو ہم سفر بھی بنے۔  
 وہ اک کتاب! جو سمجھیں تو راہبر بھی بنے..... (محبت کا گلدان)“ (127)

☆ عبداللہ جاوید:

”میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ادبی رسالے کے مدیر کے طور پر اپنے لکھنے والوں کے لیے  
 کیا تھا۔ کس حد تک Protective تھے۔ وہ ایک جانب اختلاف رائے کے اظہار کی  
 ہمت افزائی کرتے تو دوسری جانب اختلاف رائے کے اظہار میں نرمی کی تلقین کرتے  
 ادب اور تخلیق و تنقید و تحقیق ادب کے ضمن میں ادبی جرائد و رسائل اور ان کے مدیران کا  
 جو عمل دخل ہے، اس کا صحیح اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مرتبہ کسی  
 عمارت کی بنیاد و ماسٹل ہے۔ احمد نجیم قاسمی صاحب کی شخصیت کی اس جہت کو کسی طور نظر  
 انداز نہیں کیا جاسکتا۔“ (128)

☆ ڈاکٹر صابر آفاقی:

”وہ ہر نئے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے اور ایسی رہنمائی کہ آپ نے  
 پاکستان میں لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کر ڈالی، قاسمی صاحب نے ماہنامہ ”فنون“  
 نکالا تو بد سے بدتر حالات میں بھی نکالتے ہی چلے گئے۔ ”فنون“ نہ صرف برصغیر میں  
 بلکہ پوری اردو دنیا کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ ”فنون“ نے ایک منظم، فعال اور موثر ادبی  
 تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ”فنون“ کے قاری اسے وصول کرنے کے لیے دن رات  
 کرتے تھے اور ایک معشوق کی طرح اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ”فنون“ نے آزاد  
 کشمیر کے بے شمار اہل قلم کو عالمی سطح پر روشناس کرایا۔“ (129)

☆ پروفیسر حسن عسکری:

”قاسمی صاحب نے ”فنون“ جیسا معیاری جریدہ جاری کیا جو پاکستان میں ادب کی  
 رفتار ترقی کا آئینہ دار اور زندہ ادیبوں کی تخلیقات، ادب کے قاری تک پہنچانے کا

وسیلہ قرار پایا۔“ (130)

☆ اصغر ندیم سید:

”آپ کا ادبی سفر کئی جہتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ”فنون“ نے کئی دہائیوں تک نئی نسلوں کی تربیت کی جس کا اثر غزل اور شاعری پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔“ (131)

☆ صلاح الدین حیدر:

”فنون“ کے ایک محب نے جو اہم سرکاری منصب پر فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ انھیں پیغام بھیجا کہ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ سو آپ بھی بدلتے حالات میں مصلحت کو پیش نظر رکھ کر کچھ تحریر فرمائیں۔ ندیم نے مضطرب لیکن پر عزم انداز سے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنے عمر بھر کے قرینے کو بدلنے پر تیار نہ ہوں گے۔“ (132)

☆ اکبر حمیدی:

”1969 میں پہلی مرتبہ اپنی نظم ”فنون“ کے لیے ارسال کی چند ہی دنوں میں ندیم صاحب کی طرف سے مجھے جیسے نوآموز (دیہاتی اور غیر مفید لکھاری) کے نام ایک نہایت محبت بھرا ورنزم لہجے کا خط موصول ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ: نظم ”فنون“ کے لیے رکھ لی گئی ہے لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اس نظم کے مصرعوں کو ملا کر اسے تین بند کی نظم میں تبدیل کر لوں۔ اس طرح یہ زیادہ موثر ہو جائے گی اور اس کا Impact اچھا ہو جائے گا“ ندیم صاحب کا یہ محبت بھرا خط میرے لیے چونکا دینے والا تھا کہ اتنے بڑے منصب کا شاعر اور مدیر اس قدر بھی مہربان ہو سکتا ہے۔“ (133)

☆ محمد سعید شیخ:

”فنون“ ان کا عشق تھا جس میں وقت کے ساتھ ساتھ ان کی وارفتگی بڑھتی گئی۔ ایک ایک تحریر وہ خود پڑھتے تھے۔ اس کی تصحیح کرتے تھے، پھر اسے چھپنے کے لیے کلیرنس دیتے تھے ایک مرتبہ میرے ایک افسانے کی آخری دو لائنوں کے بارے میں انھوں نے مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی اور اس بات پر قائل کیا کہ یہ دو لائنیں اگر منہا کر دی جائیں تو افسانے کا تاثر زیادہ مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح وہ لکھنے والوں کی تربیت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اچھی تحریروں کی وہ تحسین بھی کرتے تھے۔“ (134)

☆ رفعت مرتضیٰ:

”اس عمر میں..... یہ کہانیاں لکھ رہے ہیں، غزلیں کہہ کر رہے ہیں، نظمیں لکھ رہے ہیں۔ ادارے، کالم اور سب سے بڑھ کر ”فنون“ کی ادارت، جس کی ذیل میں انھوں نے کہا تھا کہ ہر پرچہ پرچہ میں بھیجنے سے پہلے وہ اس کے لیے چنی گئی ہر تحریر لفظ بہ لفظ خود پڑھتے ہیں..... مدیر ہونے کے حوالے سے یہ ان کی ذمہ داری تو سمجھی جائے گی مگر میں اس کو لفظ سے انکی کو ٹمٹم کہوں گی، جو انھوں نے آخری سانس تک نبھائی۔“ (135)

☆ امجد اسلام امجد:

”1965 کی جنگ کے حوالے سے ہمارے کالج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ وہاں میں نے بھی ایک نظم پڑھی، مشاعرے کے اختتام پر جب احمد ندیم قاسمی صاحب واپس جانے لگے تو میں احتراماً ایک طرف ہو گیا تاکہ وہ گزر جائیں۔ قاسمی صاحب مجھے دیکھ کر میرے قریب آئے۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔ ”میرا نام احمد ندیم قاسمی ہے۔ میں ایک رسالہ نکالتا ہوں، ”فنون“۔ کیا آپ اپنی نظم مجھے اس کے لیے عنایت کر سکتے ہیں؟“ میں قاسمی صاحب کا جملہ آج تک بھول نہیں سکا۔ قاسمی صاحب بڑے آدمی تھے اور میں کالج کا ایک نوجوان، ممکن ہے اس نظم میں انہیں کوئی ایسی چیز نظر آئی ہو مگر انھوں نے مجھ سے جس محبت اور شفقت کا اظہار کیا، اس نے میرا رویہ تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اتنے بڑے آدمی نے مجھے احساس دلایا کہ ادب والا کام میں کر سکتا ہوں۔ پھر ساری عمر ان کی شفقت میرے ساتھ رہی۔“ (انٹرویو، روزنامہ جنگ کراچی، 28 اپریل 2006)“ (136)

☆ عطا الحق قاسمی:

”شعر و ادب میں کنٹری بیوشن کے علاوہ ندیم صاحب کی ایک بہت بڑی کنٹری بیوشن نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی پروجیکشن کے حوالے سے بھی ہے۔ جو انھوں نے اپنے جریدے ”فنون“ کے ذریعے کی۔ یہ فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ بس آپ سمجھ لیں کہ اس وقت شاعری اور افسانے میں جتنے بڑے یا کم بڑے نام نظر آتے ہیں، ان کی بہت بڑی اکثریت ”فنون“ کے ذریعے سامنے آئی یا



فتون سے وابستہ رہی۔ ان میں احمد فراز، منیر نیازی، ظفر اقبال، پروین شاکر، احمد مشتاق، شہزاد احمد، فہیدہ ریاض، کشور ناہید، محمود شام، امجد اسلام امجد، عدیم ہاشمی، محمد خالد اختر، محسن احسان، خالد احمد، نجیب احمد، قتیل شفائی، ریاض مجید، خاطر غزنوی، فضل احسن رندھاوا، جمیل الدین عالی، افتخار نسیم، عشرت آفرین، اطہر نفیس، احمد راہی، عبید اللہ علیم، نکلیب جلالی، شاہد حسن، جمال رحمانی، ثروت حسین، غلام محمد قاصر، منصورہ احمد، فاطمہ حسن، محبوب خزاں، ہاجرہ مسرور، شریف کنجاہی، خدیجہ مستور، عطیہ سید، شفیق سلمی، رشید ملک، جلیل عالی، یوسف ظفر، نیلو فراقبال، جاوید شاہین، افضل تو صیف، ساقی فاروقی، محمد منشاوی، انعام الحق جاوید، پروفیسر فتح محمد ملک، آفتاب اقبال شمیم، احمد شمیم، سرمد چغتائی، ڈاکٹر اجمل نیازی، شمس الرحمن فاروقی، محمد کاظم، انور محمود خالد، مستنصر حسین تارڑ، اختر حسین جعفری، محشر بدایونی، جاوید اشرف، اسلم کولسروی، اسلم انصاری، انوار احمد، سہیل احمد خان اور ان 63 ناموں کے ساتھ ساتھ دوسرے بیسیوں بڑے نام شامل ہیں، تاہم ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن پر یہ قول صادق آتا ہے کہ ”حضرت عیسیٰ جن مردوں کو زندہ کرتے تھے وہ بعد میں ان کے پیری ہو جاتے تھے“ سو ہمارے درمیان سے وہ شخص اٹھ گیا ہے جو ادب سے وابستہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تھا۔“ (137)

☆ عارف شفیق:

”نئی نسل کو معلوم ہو کہ احمد ندیم قاسمی جینوئن لکھنے والوں کی کس قدر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پروین شاکر، افتخار عارف، سلیم کوثر، صابر ظفر، جمال احسانی، عدیم ہاشمی، جون ایلینا، انور شعور، شعیب بن عزیز، نجیب احمد، خالد احمد اور مجھ سمیت کئی نوجوان شعرا کو قاسمی صاحب نے ”فتون“ میں نمائندگی دی۔ یہ ان کی ادبی دیانت داری تھی جو انھوں نے مجھے جیسے شاعر کو اپنے ادبی پرچے میں نمائندگی دی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ میرا کلام ”اوراق“ میں بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا۔ ہم سے ایک دیانت دار مدیر رخصت ہو گیا۔“ (138)

☆ سعید پرویز:

”قاسمی صاحب نے اردو ادب میں بھرپور زندگی بسر کی۔ خود کو بھی منوایا اور سینکڑوں ادیبوں، شاعروں کو بھی معتبر مقام حاصل کرنے کے لیے صحیح راستے دکھائے۔ ان کی

سرپرستی کی، حوصلہ افزائی کی۔ وہ حقیقتاً اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ”فنون“ اسی انجمن کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ قاسمی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ ادبی رسالہ پوری دنیا کے اردو ادب میں اعلیٰ ترین مقام کا حامل ہے۔ ”فنون“ میں چھپنا سند سمجھا جاتا ہے سینکڑوں نامور شاعر، ادیب اسی رسالے کی پیداوار کہے جاسکتے ہیں۔“ (139)

☆ جمیل الدین عالی:

”کئی مشاہیر لکھنے والے کسی باقاعدہ شاگردی کے بغیر ارتقا اور شہرت کے لیے خاصی حد تک قاسمی صاحب کی بے غرضانہ سرپرستی کے ممنون ہیں۔ خصوصاً جب سے انھوں نے ”فنون“ شروع کیا۔ نئے بے نام لکھنے والوں کی کھلی ہمت افزائی کی۔ ان میں سے بیشتر ہمارے قابل ذکر ادبی اثاثے ثابت ہو چکے ہیں۔ اس طرح کی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت آج ہماری ادبی دنیا میں کمیاب ہی نہیں بالکل نایاب ہے۔“ (140)

☆ طاہرہ اقبال:

”22 جون یعنی وفات سے محض اٹھارہ دن پہلے، اس بیماری اور کمزوری کے عالم میں، ان نامہوار سانسوں کے ساتھ بذات خود وہ پروف (فنون نمبر 127 کے لیے) پڑھنے کا کام کر رہے تھے، فرض کی لگن، فن سے محبت اور وابستگی اسی ریاضت، اسی استقامت کو کہتے ہیں، جس کا نام احمد ندیم قاسمی ہے۔“ (141)

☆ محمد ایوب صابر (ممبئی):

”یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ”نفوش“ کے سے موقر اور مقبول رسالے کے پہلے مدیر احمد ندیم قاسمی ہی تھے۔ ”تہذیب نسواں“، ”پھول“، ”ادب لطیف“ اور ”امروز“ جیسے جرائد کو بھی ان کی معاونت حاصل تھی۔ لیکن فن جریدہ نگاری کے انفرادی رنگ و آہنگ کی تجدید کاری کے نت نئے تجربات انھوں نے اس وقت کرنے شروع کیے جب اپنا ذاتی رسالہ ”فنون“ جاری کیا۔“ (142)

☆ علی اصغر عباس:

”جناب احمد ندیم قاسمی جدید اردو ادب کی تاریخ میں واحد شخصیت ہیں جنہوں نے تخلیق ادب کے لیے نہ صرف ان تھک کام کیا بلکہ گلشن ادب کی رونقیں دوچند کرنے کے لیے

لکھنے والوں کی تربیت بھی از خود اپنے کندھوں پر لی اور تادم زیست یہ کام ایک عبادت کے طور پر کیا، ہماری پوری تاریخ ادب میں ایسا ایک بھی استاد موجود نہیں جس نے پوری چارلسوں کی تربیت ایسے انداز میں کی ہو کہ اس کا ہر تربیت یافتہ اپنی جگہ ایک انجمن اور ایک ادارہ بن جائے، کوئی چاند کوئی ستارہ ہے۔“ (143)

☆ مسعود اشعر:

”ندیم صاحب نے اچھے ادبی رسالے نکالنے کی طرح ڈالی اور جو رسالہ بھی نکالا اسے تحریک بنا ڈالا۔ ”ادب لطیف“، ”سور“، ”نقوش“، اور اب ”فنون“ ادب“ میں تحریک کا کام کر رہے ہیں۔ رسالہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے ایک اور بڑی خدمت کی ہے اور وہ ہے نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی وہ جس شخص میں بھی ذرا سی صلاحیت دیکھتے ہیں اس کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔“ (144)

☆ ڈاکٹر امجد احمد:

”احمد ندیم قاسمی ایک پورے اور شاندار عہد کا نام ہے وہ شاعر تھے، بے مثال افسانہ نگار تھے، صحافی تھے اور ان حیثیتوں کے علاوہ ایک بڑے اور عہد ساز مدیر تھے، ادب کی رفتار اور معیار کا اصل تعین ادبی جرائد ہی کیا کرتے ہیں، مدیر طاقت ور انسان ہوتا ہے۔ مثبت اور منفی ہر دو طرح سے۔ اسی لیے اس پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ادبی پرچہ نکالنا اور اسے تواتر اور تسلسل سے، معیاری انداز سے شائع کرتے چلے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے، ندیم ملنسار اور کشادہ دل انسان تھے۔ اس لیے روابط قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں ان کی یہ خوبیاں بہت کام آئیں، نئے رجحانات بھی سراٹھاتے رہے لیکن ندیم نے اس معاملے میں کسی قسم کی رعایت کو روا نہیں رکھا۔ ان کے اپنے ٹھوس معیارات تھے جس پر وہ کسی بھی تخلیق کو پرکھتے اور پھر ”فنون“ میں جگہ دیتے تھے، اور ظاہر ہے یہ ان کا استحقاق تھا۔“ (145)

☆ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی:

”1969 میں ”فنون“ کا ”جدید غزل نمبر“ نکلا، اس میں کئی خواص ایسے تھے جو اسے ضخیم نمبروں کی عام ڈگر سے الگ راہ پر قائم کرتے تھے۔ لیکن اس میں ایک خوبی ایسی تھی

جو اس طرح کے کسی نمبر کو نصیب نہ ہوئی، نہ پہلے نہ بعد میں اور وہ خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر مکتب و منہاج کے اچھے شاعر شامل کیے گئے تھے اور ان شعرا کو بطور خاص جگہ دی گئی تھی۔ جنہیں اس وقت کے ”فیشن“ کے مطابق ”جدید غزل“ کے کسی انتخاب میں شامل ہونے کا استحقاق نہ تھا، شعرا کی فہرست میں بہت سے شعرا ایسے ہیں آج جن کے بارے میں تو صیفاً کہا جاتا ہے کہ وہ ”فنون“ کے جدید غزل نمبر میں شامل تھے۔ بے خوف و تردید کہا جاسکتا ہے کہ کم ہی پرچے ایسے ہوں گے جن کا کوئی خاص نمبر تقریباً چالیس سال گزرنے کے باوجود تازہ اور قابل مطالعہ معلوم ہو۔ وجہ ظاہر ہے قاسمی صاحب کا معیار و انتخاب ذاتی یا نظریاتی تعصبات سے بالاتر تھا۔ ”فنون“ کے علاوہ اور بھی پرچے تھے جو نئے ادب کی نمائندگی کرتے تھے لیکن ”فنون“ جیسی وسعت نظر کسی میں نہ تھی۔“ (146)

☆ انتظار حسین:

”بعض تک چڑھے مدیروں کے برخلاف وہ گنجائش رکھنے والے مدیر تھے، جو ہمیشہ نئے اور باصلاحیت لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ اوسط درجے کے ادیبوں کی اس طرح مدد کرتے کہ ان کی غلطیاں درست کر دیتے۔ اس طرح ”فنون“ ایک ایسا جریدہ بن گیا جس کی قدر و قیمت ادبی تعلیم کے حوالے سے بھی تھی اور پھر ”فنون“ کو ان کی شخصیت کی ایک طرح کی توسیع سمجھا جاسکتا ہے ان کا رسالہ ایک طرح سے ایک ادارہ بن گیا تھا طویل عمر کے ساتھ ادب سے مکمل وابستگی نے اس ادارے کو وقار عطا کیا تھا۔“ (147)

☆ پروفیسر قیصر مجنی:

”ہمارا دعویٰ ہے کہ جتنے ادیبوں اور شاعروں کو قاسمی صاحب نے اپنے ادبی مجلہ ”فنون“ کے ذریعے متعارف کرایا ہے، اتنے اردو کے کسی اور ادبی جریدے نے نہیں کرائے ہیں۔ نیز جتنی کثیر تعداد میں تخلیق کاروں کی انھوں نے ادبی تربیت کی ہے، کسی اور نے نہیں کی ہے ”فنون“ کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ اس جریدے نے غزل گوئی، نظم نگاری، کہانی کاری، نقد و نظر اور علمی، ادبی اور تاریخی مضمون نویسی کے جو معیارات متعین کیے ہیں، اعلیٰ علمی و ادبی سطح پر وہ حتمی تسلیم ہوتے ہیں۔ یہ جریدہ اس علمی و ادبی



ترفع پر پہنچ چکا ہے کہ ”فنون“ میں کسی تخلیق کا شائع ہو جانا ہی اس کے معیاری ہونے کی سند ہے۔ اس نوع کا اعزاز خال خال ادبی مجلوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ”فنون“ کے اوراق میں طغرائے امتیاز قاسمی صاحب کی بدولت تھا اور قاسمی صاحب ان معدودے چند قلم کاروں میں سے ایک تھے، جو شعر و ادب پر صدیوں قائم رہنے والے اثرات چھوڑ کر جاتے ہیں اور اپنے دور کی پہچان متصور ہوتے ہیں۔“ (148)

یہ تھیں پاکستانی ادب کے ایک معمار، ہمارے ایک بڑے شاعر، افسانہ نگار، دانشور اور ادیب احمد ندیم قاسمی کے بارے میں کچھ تحریریں..... اور ایک بیٹی کی طرف سے پیش کی گئی اپنی کچھ باتوں اور پُر شوق و با ذوق اہل قلم کی کچھ آراء کے ذریعے ندیم کے تعارف کی چند جھلکیاں۔ میں نے 1966 میں اپنے ابا جی (ندیم) پر پہلا مضمون لکھا تھا۔ اسی کے آخر میں کہی بات آج بھی نہایت مسرت کے ساتھ دہرا رہی ہوں کہ ”میرے لیے یہی بات عمر بھر فخر کرنے کے لیے بہت ہے کہ میں ندیم کی بیٹی ہوں۔“

ندیم کے لیے ان ہی کا شعر پیش ہے:

جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم

اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

اور اب کتاب کی گنجائش کے مطابق احمد ندیم قاسمی کی پچاس سے زائد تخلیقی ادب کی بیش قیمت اور قابل قدر کتابوں میں سے چند ایک چیزوں کا بہت ہی مختصر سا انتخاب شامل کیا گیا ہے (ندیم کی کتابوں کی فہرست اس کتاب میں بھی درج ہے اور الحمد للہ ملک بھر میں یہ کتابیں آسانی سے دستیاب بھی ہیں۔ آپ کے لیے باب چہارم میں گلشن ندیم کی کیاریوں سے چنیدہ چند پھول پیش ہیں۔

☆☆☆



## ندیم انتخاب

حمید

مجھے رنگ دے، مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے  
تو جو مہر و ماہ کی کائنات کا حسن کا عظیم ہے  
تو جدید سے بھی جدید ہے، تو قدیم سے بھی قدیم ہے  
مجھے رنگ دے، مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو حبیب بھی، تو حفیظ بھی، تو رحیم بھی، تو کریم بھی  
تو بصیر بھی، تو نصیر بھی، تو کبیر ہے، تو حلیم ہے  
مجھے رنگ دے، مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو میرے خیال کے گلشنوں میں بسا مثال شمیم ہے  
تو مرے یقین کی وسعتوں میں خرام موج نسیم ہے  
مجھے رنگ دے، مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

تو جمال بھی، تو جمیل بھی، تو خبیر ہے، تو علیم ہے  
یہ حروف تیری امانتیں، یہ ندیم تیرا ندیم ہے  
مجھے رنگ دے، مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے

(1995)

## نعت

اس قدر کون محبت کا صلہ دیتا ہے    اُس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے  
 جب اترتی ہے مری روح میں عظمت اُس کی    مجھے کو مہبود ملائک کا بنا دیتا ہے  
 رہنمائی کے یہ تیور ہیں کہ مجھے میں اُس کر    وہ مجھے میرے ہی جوہر کا پتا دیتا ہے  
 اس کے ارشاد سے مجھ پر مرے اسرار کھلے    کہ وہ ہر لفظ میں آئینہ دکھا دیتا ہے  
 ظلمت دہر میں جب بھی میں پکاروں اُس کو    وہ مرے قلب کی قندیل جلا دیتا ہے  
 اس کی رحمت کی بھلا آخری حد کیا ہوگی    دوست کی طرح جو دشمن کو دُعا دیتا ہے  
 وہی نمٹے گا مری فکر کے سناٹوں سے    بُت کدوں کو جو اذانوں سے بسا دیتا ہے  
 وہی سر سبز کرے گا مرے ویرانوں کو    آندھیوں کو بھی جو کردارِ صبا دیتا ہے  
 قدم اٹھتے ہیں مرے، جاں پہ یثرب جب بھی    اک فرشتہ مجھے شہپر کی ہوا دیتا ہے  
 فن کی تخلیق کے لحوں میں، تصور اُس کا    روشنی میرے خیالوں میں ملا دیتا ہے  
 قصر و ایوان سے گزر جاتا ہے چپ چاپ ندیم    در محمدؐ کا جب آئے تو صدا دیتا ہے

☆☆☆

## نعت

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے، یہ شیدا تیرا اس کی دولت ہے فقط نقشِ کف پا تیرا  
 تہ بہ تہ تیرگیاں، ذہن پہ جب ٹوٹتی ہیں نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا  
 کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے چھلک اٹھتا ہے مری روح میں، مینا تیرا  
 پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا  
 دنگیری میری تنہائی کی، تُو نے ہی تو کی میں تو مر جاتا، اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا  
 لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ترے پیکر کا نہ تھا میں تو کہتا ہوں، جہاں بھر پہ ہے سایا تیرا  
 تُو بشر بھی ہے مگر فخرِ بشر بھی تُو ہے مجھ کو تو یاد ہے بس اتنا سراپا تیرا  
 میں تجھے عالمِ اشیا میں بھی پا لیتا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالمِ بالا تیرا  
 میری آنکھوں سے جو ڈھونڈیں، تجھے ہر سو دیکھیں صرف خلوت میں جو کرتے ہیں نظارہ تیرا  
 وہ اندھیروں سے بھی دُڑا نہ گزر جاتے ہیں جن کے ماتھے میں چمکتا ہے ستارا تیرا  
 ندیاں بن کے پہاڑوں میں تو سب گھومتے ہیں ریگزاروں میں بھی بہتا رہا دریا تیرا  
 شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو نگہیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا  
 اب بھی ظلماتِ فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا  
 تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا، ہزاروں کا سہی اب جو نا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا  
 ایک بار اور بھی بٹھا سے فلسطین میں آ راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا

☆☆☆

## وطن کے لیے دُعا

خدا کرے۔۔ کہ مری ارض پاک پر اترے  
وہ فصلِ گل، جسے اندیشہ زوال نہ ہو  
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں  
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو  
یاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے  
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو  
گھنی گھنائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں  
کہ پتھروں سے بھی، روئیدگی محال نہ ہو  
خدا کرے۔۔ کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن  
اور اس کے حُسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو  
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوج کمال  
کوئی مَلُول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو  
خدا کرے۔۔ کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے  
حیاتِ جرم نہ ہو، زندگی و بال نہ ہو  
خدا کرے۔۔ کہ مری ارض پاک پر اترے  
وہ فصلِ گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

○

جیسے ہی تُو جدا ہوا، وقت کا وار چل گیا  
تارے کہیں بھٹک گئے، چاند کہیں نکل گیا

تیرا ذرا سا التفات، مرکز و محورِ حیات  
سنگِ گرانِ دردِ دل، موم ہوا، پگھل گیا

تیری نگاہ جب اٹھی، روح میں نور بھر گئی  
ایک ہی لمبے میں دُور تک، منظرِ جاں بدل گیا

عشق کا راز کیا کھلا، جیسے شرر بکھر گئے  
ایک ذرا سی بات سے، شہر کا شہر جل گیا

راہ میں آفتاب کی، پھول بچھا گئی شفق  
صبح کے رخ پہ دستِ شب جیسے گُلال مل گیا

درد شدید تھا مگر اس میں چمک سی تھی ندیم  
ایک چراغ اگر بجھا، ایک چراغ جل گیا



تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے      کبھی جھانکا تری آنکھوں میں تو ہم ہی ہم تھے  
 لمس کے دم سے بصارت بھی، بصیرت بھی ملی      چُھو کے دیکھا تو جو پتھر تھے، زرے ریشم تھے  
 تیری یادیں، کبھی ہنستی تھیں، کبھی روتی تھیں      میرے گھر کے یہی ہیرے تھے، یہی نیلم تھے  
 برف گرماتی رہی، دھوپ اماں دیتی رہی      دل کی نگری میں جو موسم تھے، ترے موسم تھے  
 میری پونجی مرے اپنے ہی لبو کی تھی کشید      زندگی بھر کی کمائی مرے اپنے غم تھے  
 آنسوؤں نے عجب انداز میں سیراب کیا      کہیں بھیگے ہوئے دامن، کہیں باطنِ نم تھے  
 جن کے دامن کی ہوا میرے چراغوں پہ چلی      وہ کوئی اور کہاں تھے، وہ مرے ہمد تھے  
 میں نے پایا تھا بس اتنا ہی حقیقت کا سراغ      دور تک پھلتے خا کے تھے، مگر مُہم تھے  
 میں نے گرنے نہ دیا، مر کے بھی، معیارِ وفا      دُوبتے وقت مرے ہاتھ، مرے پرچم تھے  
 میں سرِ عرش بھی پہنچا تو سرِ فرش رہا      کائناتوں کے سب اماں مرے اندر ضم تھے  
 عمر بھر خاک میں جوا شک ہوئے جذبِ ندیم      برگِ گل پر کبھی ٹپکے تو وہی شبنم تھے



روشنی کا ، انق شب پہ اشارہ کیوں ہے؟  
رات اُندی ہے مگر ساتھ ستارا کیوں ہے؟  
وہ جو گرداب سے لرزاں ہیں، ذرا غور کریں  
ہر پھرتے ہوئے دریا کا کنارہ کیوں ہے؟  
برف پگھلی ہے تو کیوں اس میں ہے تلوار کی کاٹ  
راکھ ٹھنڈی ہے تو پھر اس میں شرارہ کیوں ہے؟  
زیر محنت جو ہمارا ہے، وہ سب کا ہے اگر  
قصرِ مرمر جو تمھارا ہے، تمھارا کیوں ہے؟  
راہ گر کوئی نہ سوجھی تھی تو ہم سے کہتا  
رہنما نے ہمیں دورا ہے پہ مارا کیوں ہے؟  
یہ تصرف ہے ترا، یا مرا معیار وفا  
حرکِ الفت پہ بھی تو اتنا ہی پیارا کیوں ہے؟  
عشق اگر کچھ بھی نہیں جُودِ ہوسِ جسمِ ندیم  
اس نے الہام مرے دل میں اتارا کیوں ہے؟

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا      ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا  
 اس قدر پیار ہے انسان کی خطاؤں سے مجھے      کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا  
 اے خدا! پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے؟      تیرا شہکار تو فی النار نہیں ہو سکتا  
 اے حقیقت کو فقط خواب سمجھنے والے!      تو کبھی صاحب اسرار نہیں ہو سکتا  
 تو جواک موجہ نگہت سے بھی چومک اٹھتا ہے      حشر آتا ہے تو بیدار نہیں ہو سکتا  
 سر دیوار یہ کیوں زرخ کی تکرار ہوئی      گھر کا آنگن کبھی بازار نہیں ہو سکتا  
 راکھ سی، مجلس اقوام کی چنگی میں ہے کیا؟      کچھ بھی ہو، یہ مرا پندار نہیں ہو سکتا  
 اس حقیقت کو سمجھنے میں لٹایا کیا کچھ      میرا دشمن میرا منخوار نہیں ہو سکتا  
 میں نے بھیجا تجھے ایوان حکومت میں مگر      اب تو بدسوں ترا دیدار نہیں ہو سکتا  
 تیرگی، چاہے ستاروں سے سفارش لائے      رات سے مجھ کو سروکار نہیں ہو سکتا

وہ جو شعروں میں ہے اک شے پاس الفاظ ندیم

اس کا الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

مداوا بھس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ چلی آتی ہے وہ موج صبا آہستہ آہستہ  
 ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر کہ سورج بھی تو مغرب میں چھپا آہستہ آہستہ  
 کوئی سنتا تو اک گہرام بربا تھا ہواؤں میں شجر سے ایک پٹا جب گرا آہستہ آہستہ  
 تعجب میرے جل بھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو میں اپنی آنچ میں چتا رہا آہستہ آہستہ  
 ابھی سے حرف رخصت کیوں جب آدھی رات باقی ہے گل و شبنم تو ہوتے ہیں جدا آہستہ آہستہ  
 مجھے منظور، گر ترک تعلق ہے رضا تیری مگر ٹوٹے گا رشتہ درد کا آہستہ آہستہ  
 غرورِ مدعا، شرمندہ اظہار کیوں ہوتا میں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ  
 پھر اس کے بعد شب ہے، جس کی حد صبحِ بدستک ہے مغلّی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ  
 شبِ فرقت میں جب کج سحر بھی ڈوب جاتا ہے اترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ  
 میں شہرِ دل سے اکلا ہوں سب آوازوں کو دفنا کر ندیم اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ



نکھنے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں  
حُسنِ یزداں سے نکھنے حُسنِ بُناں تک دیکھوں

تُو نے یوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا  
میں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں  
میں ترا حُسن، ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانہ جاں میں، ترے غم کے دم سے  
پھول کھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دُھندلا دیے تیرے خدوخال  
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا  
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود  
حُسنِ انساں سے نمت لوں تو وہاں تک دیکھوں



○

جب ترا حکم ملا، ترک محبت کر دی  
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا، کہ قیامت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا  
لفظ سوجھا تو معافی نے بغاوت کر دی

میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے  
تو نے جا کر تو جدائی میری قسمت کر دی

تجھ کو پوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے  
میں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کر دی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیارا آتا ہے  
تیری اُلفت نے محبت مری عادت کر دی

پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے گوجے کا پتہ  
تیرے حالات نے کیسی تری صورت کر دی

کیا ترا جسم، ترے حسن کی حدت میں جلا  
راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کر دی

## نیا سال

(عالمی حالات کے تناظر میں)

رات کی اُڑتی ہوئی راکھ سے بوجھل ہے نسیم  
یوں عصا ٹیک کے چلتی ہے کہ رحم آتا ہے  
سانس لیتی ہے درختوں کا سہارا لے کر  
اور جب اس کے لہا دے سے لپٹ کر۔ کوئی  
پتہ گرتا ہے تو پتھر سا لڑھک جاتا ہے

شانیں۔ ہاتھوں میں لیے کتنی ادھوری کلیاں  
مانگتی ہیں فقط اک نرم سی جنبش کی دُعا  
ایسا چپ چاپ ہے سنولائی ہوئی صبح میں شہر  
جیسے معبد کسی مَر جھائے ہوئے مذہب کا  
سر پہ اپنی ہی شکستوں کو اٹھائے ہوئے لوگ  
اک دورا ہے پہ۔ گروہوں میں کھڑے ہیں تنہا  
یک بیک فاصلے تاننے کی طرح بچنے لگے  
قدم اٹھتے ہیں تو ذرے بھی صدا دینے لگے  
درد کے پیرہن چاک سے جھاگو تو ذرا  
مردہ سورج پہ لٹکتے ہوئے میلے بادل  
کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتے ہیں!

## چوگا

باجرے کا اک دانہ اپنی چونچ میں رکھے  
چڑیا آقاں چوگا دینے آئی ہے  
بچے اتنے ننھے منے سے ہیں  
جب وہ چیتے ہیں

سر سے بچوں تک چونچیں بن جاتے ہیں  
دانہ ایک اور بچے دس ہیں  
کس کس کی چونچ سے چونچ ملا کر ڈھارس دے

ڈڑھتوڑ کے حشر پیا کرنا تو تم نے سیکھ لیا ہے  
دانہ توڑ کے زندگی برباد کرنا اس سے اونچا فن ہے  
کیا تم دانہ توڑ سکو گے؟  
! دانہ ایک اور بچے دس ہیں

## ایک درخواست

زندگی کے جتنے دروازے ہیں، مجھ پر بند ہیں  
دیکھنا۔۔۔ حد نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے  
سوچنا۔۔۔ اپنے یقیوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے  
آسمان در آسمان اسرار کی پر تیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے  
”کیوں“ بھی کہنا جرم ہے، ”کیسے“ بھی کہنا جرم ہے  
سانس لینے کی تو آزادی میسر ہے، مگر  
زندہ رہنے کے لیے انسان کو کچھ اور بھی درکار ہے  
اور اس ”کچھ اور بھی“ کا تذکرہ بھی جرم ہے

اے ہنرمندانِ آئین و سیاست!  
اے خداوندانِ ایوانِ عقاید!  
زندگی کے نام پر بس اک عنایت چاہیے  
مجھ کو ان سارے جرائم کی اجازت چاہیے

## یہ کیا گونج ہے؟

میں اس رات کی بے ازل، بے ابد خامشی میں  
جواک گونج سی سُن رہا ہوں  
یہ کیا گونج ہے؟  
کائناتوں کے کس گوشے بے نہایت سے آئی ہے؟  
اس کے تسلسل میں صرف ایک ہی لفظ کیوں گونجتا ہے؟  
یہ اک لفظ کیا ہے جسے ”کن“ کے بعد اتنی عظمت ملی ہے؟  
یہ لفظ اپنی تکمیل کی جستجو میں  
کئی سو رجون کے مقد رہ پہ منڈلا رہا ہے

یہ کیا اسم ہے جو بھری کائناتوں کو بے اسم کرنے چلا ہے؟  
یہ کیا گونج ہے جو قیامت کے آٹا رسی ہے؟  
یہ چکی کے پاؤں کے چلنے کی۔۔۔ سات آسمانوں کے اک دوسرے کو کچلنے کی آواز کیا ہے؟

خلاؤں کی بے انتہائی میں کچھ پُرس رہا ہے کہ کچھ بن رہا ہے؟  
یہ سب کچھ نہیں ہے تو کیا اُن گنت کائناتوں کا خالق خدا  
اک نیا تجربہ کر رہا ہے؟



## دائرے

زخم بھر جاتے ہیں  
ذہنوں سے اتر جاتے ہیں  
دن گزرتا ہے تو پھر شب بھی گزر جاتی ہے  
پھول جس شاخ سے جھڑ جاتے ہیں  
مر جاتے ہیں

چند ہی روز میں  
اس شاخ پہ آئندہ کے پھولوں کے گلنے سے ابھر آتے ہیں  
تیرے جانے سے مری ذات کے اندر جو خلا گونجتا ہے  
اک نہ اک دن اسے بھر جانا ہے  
اک نہ اک روز تجھے  
میری پھیلی ہوئی، ہنسی ہوئی باہوں میں پلٹ آنا ہے!

## بولنے دو

بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو؟  
بولنے دو کہ مرا بولنا دراصل گواہی ہے مرے ہونے کی  
تم نہیں بولنے دو گے تو میں سناٹے کی بولی میں ہی بول اٹھوں گا  
میں تو بولوں گا  
نہ بولوں گا تو مرجاؤں گا  
بولنا ہی تو شرف ہے میرا  
کبھی اس نکتے پہ بھی غور کیا ہے تم نے  
کہ فرشتے بھی نہیں بولتے۔۔ میں بولتا ہوں  
حق سے گفتار کی نعمت فقط انسان کو ملی  
صرف وہ بولتا ہے  
صرف میں بولتا ہوں  
بولنے مجھ کو نہ دو گے تو مرے جسم کا ایک ایک مسام  
بول اٹھے گا  
کہ جب بولنا منصب ہی فقط میرا ہے  
میں نہ بولوں گا تو کوئی بھی نہیں بولے گا!

## وہ جواک چیز ہے

وہ جواک چیز پس پردہ ظاہر ہے  
وہ کیا ہے؟

کون باطن کے نشیبوں کو کھنگالے  
کہ جواک باطن میں اترتے ہیں  
وہ واپس نہیں آنے پاتے

اور یہ چیز بلاتی ہے مجھے  
دن کا ہنگامہ ہو یا رات کا سنا ہو  
ایک آواز  
مسلل

مرے کانوں سے گزر کر  
مرے وجدان میں گھل جاتی ہے  
اور پھر گونجتا ہے میرا وجود

کون ہے تو؟

کہ ترے مس میں جو حدت ہے  
مری روح کو کھولاتی ہے  
کون ہے تو؟

کہ مرے غرقہ باطن پہ  
تری حلقہ زنی نے

مجھے اک عمر سے سونے نہ دیا

کوئی احساس ہے تو

یا کوئی جذبہ ہے

کوئی وہم ہے

آسیب ہے

آخر کیا ہے؟

تو کہیں میرا یہ بے چین تجسس تو نہیں

کہ مجھے کس نے سزا دی ہے جہنم جانے کی

اور مرنا بھی ضروری ہے تو کیوں

جب کہ خدا باقی ہے

اور باقی سے فنا کی مجھے امید نہیں ہو سکتی

پھر پس پردہ ظاہر

یہ کچھ کوں کا تسلسل کیا ہے؟

میرے اللہ!

وہ کیا چیز ہے جس نے مجھ کو

روزِ اول سے بس اک دانہ اسپند بنا رکھا ہے

یہ کہیں تو تو نہیں؟

## مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا

مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا  
نہ جانے کیسی جیتی جاگتی مٹی  
مری تعمیر میں شامل ہے  
جس نے، ہر حالت میں  
مجھ کو زندگی کرنے پہ اکسایا

ادھر جب دکھ چٹانوں کی طرح مجھ پر برستے ہیں  
تو مجھ کو  
ایک پتھر کے تلے  
جب پھوٹی منھی سی اک کوئل دکھائی دے رہی ہو  
تو یہ سب کی سب چٹانیں  
ریزہ ریزہ ہوتی جاتی ہیں  
ادھر بدخواہ مل کر مجھ پہ جب یلغار کرتے ہیں  
تو اک چھوٹی سی بچی کی شگفتہ مسکراہٹ  
اک صلابت بن کے  
میرے باطن میں اتر جاتی ہے  
اور مجھ پر جو حملہ کرنے آتے ہیں  
کچھ اس انداز سے تحلیل ہو جاتے ہیں  
جیسے اُن کا ہونا بھی، نہ ہونے کے برابر ہے

ادھر جب آسماں سے بجلیاں برسائی جاتی ہیں  
تو میں اپنے گھلے کھلیاں کو  
اپنے بدن سے ڈھانپ لیتا ہوں  
کڑکتی بجلیاں جب ہانپ جاتی ہیں  
تو مجھ جاتی ہیں  
تب میرا گھلا کھلیاں  
اپنے تخلیقی نوادر  
عالم انسانیت میں بانٹ دیتا ہے

مجھے مایوس ہونا ہی نہیں آتا  
مجھے محسوس ہوتا ہے  
عناصر کی لگا میں میری مٹھی میں ہیں  
میری ڈھال میرے پھول ہیں  
میرے پرندے میرے پہریدار ہیں  
اور میری جھسیں میرا آنگن ہیں  
وہاں سے نیلی نیلی روشنی کے پار  
خلاق دو عالم کے نقوشِ حسن  
میرے جسم میں وہ نور بھر دیتے ہیں  
جو مجھ کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا

## پر میشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈ یا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کی جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ ”کہیں آ ہی رہا ہوگا۔“ کسی نے کہہ دیا۔ ”ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔“ اور اختر کی ماں اس تسلی کی لائھی تھا مے پاکستان کی طرف ریگتی چلی آئی تھی۔ ”آ ہی رہا ہوگا۔“ وہ سوچتی۔ ”کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر۔۔۔ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے، آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔۔۔“

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال جب وہ رونا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا۔ ”میں نعرہ بکیر مار دوں گا۔“۔۔۔ اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پر میشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی گپڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور بھڑا تو بالکل ننگا تھا، وہ بولا۔ ”ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واگوروجی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔“ ایک نوجوان سکھ نے جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔ ”ذرا ٹھہر پر میشرے، کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔“

”مارو نہیں یارو، پر میشر سنگھ کی آواز میں پکا تھی۔“ اسے مارو نہیں۔ اتنا سا تو ہے، اور اسے بھی تو اسی واگوروجی نے پیدا کیا ہے۔ جس نے۔۔۔“



”پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔“ ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔  
 ”بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگوروجی نے؟“

اختر نے اس ساری خنکی کو لگنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پونوں میں کھنک رہے تھے۔ اس نے پر میشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے، منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ ”پتہ نہیں۔“

”لو اور سنو“ کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ ”اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔“

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پر میشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلایا کر یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے، اور پر میشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ ”سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یا رو۔ میرا کرتا را بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔“

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پر میشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسری۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ ہلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پر میشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔ ”لے پر میشرے، سنبھال اسے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتا را بنا لے، لے پکڑ۔“

پر میشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے، دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی، اور وہ ہر طرف ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر گھنٹوں کے مل بیٹھ گیا اور بولا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“  
 ”اختر“ اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

”اختر بیٹے۔“ پر میشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ ”ذرا میری انگلیوں میں سے جھانک دو۔“  
 اختر ذرا سا جھک گیا۔ پر میشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ ”آہا! اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پر میشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ ”تتلی!“

”لو گے؟“ پر میشر سنگھ نے پوچھا

”ہاں!“ اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

”لو“ پر میشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی۔ اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اس ہو گیا اور پر میشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یا رو! کرتا رے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا۔“  
 ”پر میشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔“ نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پر میشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھالیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ ”ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس جائیں گے۔“ پر میشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پر میشر سنگھ نے یہ کہا کہ۔ ”ہاں ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لیے چلتا ہوں“ تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سک لیتا تھا اور پر میشر سنگھ کی تھکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پر میشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پر میشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اسی گئی تھیں اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ ”یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!“

گرختی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پر میشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے

بتا دیا تھا کہ کرنا رنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ ”جانے کیا ہو گیا ہے اسے!“ اس نے کہا تھا۔ ”واہو روجی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرنا رنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرنا رنگھ بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھولی، پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، پھر جاتا تھا۔ کہتا تھا۔ ”بیٹی کو برا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری۔ ہمارے گھروندے میں سستانے بیٹھ گئی، وقت آئے گا تو چلی جائے گی۔۔۔ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغواء ہوتی سنی تھیں یا رو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔“

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ ”سنی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!“۔۔۔ بیوی اسے محض ”اونہہ“ سے نال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھوٹی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح کی اذان ہوتی تھی تو کیسا مزہ آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوس پر یتیم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پر یتیم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پر میشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا ”ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے، نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھو کریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یا رو۔“

پر میشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھنک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے

وہیں رک گئے اور وہ مکر مکر پر میشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھانچ پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ ”یہ کون ہے؟“

پر میشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ڈرو نہیں بے وقوف، اس کی عادتیں بالکل کرتا رہے کی سی ہیں، یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا ہے۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے، اس کا نام اختر ہے۔“

”اختر؟“ بیوی کے تیور بدل گئے

”تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔“ پر میشر سنگھ نے وضاحت کی۔ ”اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔“

”پر یہ ہے کس کا!“ بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

”کس کا ہے!“ پر میشر سنگھ نے اختر کو کندھے سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”واگورو جی کا ہے۔ ہمارا اپنا ہے، اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا فل ہے، یہ کرتا رہے ہی کا فل ہے۔ کرتا رہے کے بھی تو ایک فل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں فل پر ہی تو چومتے تھے۔ اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتا رہے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں، اور۔۔۔۔۔“

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ بلبلاتا تھا۔ ”ہم یہاں نہیں رہیں گے، ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔“

پر میشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ ”اری لو۔ یہ اماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔“

”تو جائے۔“ بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آگیا تھا جسے پر میشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر ہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ ”ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لانا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو ہک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر۔۔۔۔۔ پگلے۔۔۔۔۔ تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟۔۔۔۔۔ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چو کے میں پاؤں رکھا۔“



پر میشر سنگھ نے التجا کی۔ ”کرتا رہے اور اختر کو ایک ہی واگوروجی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟“  
 ”نہیں“ اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ ”میں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات ہی رات  
 جھنکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔۔۔ لے جا اسے،  
 پھینک دے باہر۔“

”تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟“ اب کے پر میشر سنگھ بگڑ گیا۔ ”تمہارا نہ کر ڈالوں جھنکا؟“ وہ  
 بیوی کی طرف بڑھا۔ اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتھروں سے پٹی پٹی، چپٹی چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امرکور  
 دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پر میشر سنگھ کی بیوی  
 بچے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو  
 نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پر میشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امرکور  
 ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ اچانک پر میشر سنگھ کی گرج نے سارے جوم کو دہلا  
 دیا۔ ”اختر کدھر گیا؟“ وہ چنگھاڑا۔ ”ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے  
 ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یا رو۔ اختر۔ اختر!“ وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر  
 بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پر میشر  
 سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ ”ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یا رو۔ ارے وہ  
 گیا کہاں۔ اختر۔ ارے اختر۔“

”میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔“ پلڈنڈی کے ایک موڑ پر، گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی  
 آڑ سے، روتے ہوئے اختر نے پر میشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ ”تم تو سکھ ہو۔“  
 ”ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔“ پر میشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔  
 ”تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔“ اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لیے راستہ  
 صاف کیا۔

”نہیں آؤ گے؟“ پر میشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

”نہیں۔“

”نہیں آؤ گے؟“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“



”کیسے نہیں آؤ گے؟“ پر میشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے تھپڑ مار دیا۔ ”چلو۔“ وہ کڑکا۔

اختریوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہو، پھر ایک ایک کی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹختے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ ”نہیں چلتا، بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں ماروں گا۔“ اور جیسا ب پر میشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پر لی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور اُن کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹھک گئے۔ پر میشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سک سک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا۔ ”مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمہارے خدا کی قسم۔ میں تمہارا دوست ہو۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں۔۔۔ اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتا رانا م کا۔ تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟“

”اچھا!“ اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پر میشر سنگھ سے سودا کر لیا۔ پر میشر سنگھ نے اختر کو کندھوں پر بٹھالیا اور چلانگرا ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے، ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ ”روتے کیوں ہو پر میشر؟ کُل ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتا رانگے گا۔“

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم کتنے ظالم لوگ ہو یا رو۔ اختر کو کرتا رانا بتاتے ہو اور اگر ادھر کوئی کرتا رے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا۔“ پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ ”یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں میں کل ہی امر تر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصا ہوں۔ سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔“

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنختی سردار سنتو کھ سنگھ اندر آیا۔ اور بولا۔ ”پرمیشر سنگھ!“

”جی۔“ پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنختی جی کے پیچھے اس کے سب پرہوسی بھی تھے۔ ”دیکھو۔“ گرنختی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ ”کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا، اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی، چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو، سمجھے؟“

”جی!“ پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں!“ گرنختی جی نے آخری ضرب لگائی۔

”ایسا ہی ہوگا گرنختی جی۔“ پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ ”پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے، لگتا ہے پہلے جنم میں مسلا رہ چکا ہے۔ امرکورو بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھو کر آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امرکورو بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چائے، موائنکا۔ واہگورو جی کا بھی لیا ظن نہیں کرتا۔“

”واہگورو جی کا کون لیا ظن نہیں کرتا گدھی۔“ پرمیشر سنگھ نے گرنختی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنختی جی کے سامنے آگیا۔ ”اچھا جی۔ اچھا“ اس نے کہا۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنختی جی پر دسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے الگ پہچانا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی۔ وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا۔ تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑا بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ ”ذرا دھڑا تو امرکورو! یہ دیکھ۔ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتا سنگھ۔“

”نہیں اماں! امرکورو ہیں سے جواب دیتی۔“ جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنختی صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ ”میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مسلا ہے، اور جو

کرتا رہتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتا رہے۔ میرا چاند سالہ لا بچہ!“ پر میشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتا رے کے لیے روتیں۔ اختر چند روز اپنی اماں کے لیے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پر میشر سنگھ شرمنا تھیوں کی امدادی پنچائیت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اس کی ناگوں سے لپٹ جاتا اور رو کر کہتا۔ ”میرے سر پر پگڑی باندھ دو پر موم۔ میرے کیس بڑھادو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔“

پر میشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ ”یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی وہ نہیں ہوگا مجھ سے سبھے! یہ کیس ویس سب بڑھائیں گے۔“

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پر میشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کو رکی طرف دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پر میشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کو رنے اختر کی طرف جب بھی دیکھنا ک اچھا ل دیا۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پر میشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پر میشر سنگھ پھر گیا اور امر کو ر کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا۔ ”الو کی پٹھی۔“ اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ ”سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یا رو۔“ اس واقعے کے بعد امر کو رنے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پر میشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسے ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی ”پانی۔“ اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سو جی سو جی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور ”پانی“ کا لفظ ایک کراہ

بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امر کو سامنے دلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ ”پانی دے!“ اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کو نے بھوئیں سیکڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ ”پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ میں ماروں گا۔“۔۔۔ امر کو نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں، بولی۔ ”مار تو سہی۔ تو کرتا را تو نہیں کہ میں تیری مار سہ لوں گی، میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔“ اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پر میشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسپی ہوئی سو نف لے کر آگئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ ”ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کو سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔“ پر میشر سنگھ نے امر کو کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں پانی پلاؤں۔ کرتا را بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر۔ ہاں!“

پر میشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ بھی تو تمھاری اماں ہے بیٹے۔“

”نہیں۔“ اختر بڑے غصے سے بولا۔ ”یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور

بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔“

پر میشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔ ”تمھارے ہاتھ سے نہیں پیئیں گے، تم تو امر کو سور کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پر مموں کے ہاتھ سے پیئیں گے۔“

”یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے!“ امر کو نے جل کر کہا۔

”تو ہوا کرے!“ اختر بولا۔ ”تمھیں اس سے کیا۔“

پر میشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیغیبتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخارا تر چکا تھا۔ اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔



آج بہت عرصے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔  
 ”اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“  
 بیوی نے پہلے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر نالنا چاہا مگر پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امرکوری  
 کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی۔ ”بیٹی۔“  
 ”کیا ہے ماں۔“ امرکوری چونک اٹھی۔  
 اور اس نے سرگوشی کی۔ ”سنو تو۔“ سچ میں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“  
 یہ ایک ٹائیپے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امرکوری چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ اور پھر اختر کی  
 چیخ خوفناک تر تھی۔  
 ”کیا ہوا بیٹا؟“ پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ  
 لیا۔ ”ڈر گئے بیٹا؟“  
 ”ہاں“ اختر لحاف سے سر نکال کر بولا۔ ”کوئی چیز چینی تھی۔“  
 ”امرکوری چینی تھی۔“ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ”ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ  
 رہی ہے۔“  
 ”میں پڑھ رہا تھا!“ اختر بولا۔ اب کے بھی امرکوری کے منہ سے ہلکی سی چیز نکل گئی۔  
 بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امرکوری کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں  
 جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے  
 گی۔ ”میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔“  
 ”کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟“ پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔  
 ”پڑھوں؟“ اختر نے پوچھا۔  
 ”ہاں ہاں۔“ پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔  
 اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفو احد پڑھنے پر پوچھ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پرمیشر  
 سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔“  
 ”ہاں ہاں۔“ پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔ اب کے امرکوری نے  
 بڑی مشکل سے چیز پر قابو پایا۔



پرمیشر سنگھ بولا۔ ”کیا نیند نہیں آتی تھی؟“

”ہاں!“ اختر بولا۔ ”اماں یا دادا گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قل ہوا اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی، اب آرہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔“

”پھر سے پڑھ کر سو جاؤ۔“ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ”روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔“ اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اور ڈھادیا پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھاتو امر پکاری

”نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے؟“

”ڈر لگتا ہے؟“ پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کس سے ڈر لگتا ہے؟“

”جتنا رہے۔ کیا ہے؟“ بیوی بولی

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ ”پگلیاں۔“ وہ بولا۔ ”گدھیاں۔“

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہوا اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خرائے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں ”پڑوس“ کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خا سے کیس بڑھ آئے تھے، ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتا را کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہرو پیا ہے۔ اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا۔ اور قل ہوا اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

”وہ کہاں ہے؟“

”کون؟ امر کور؟“

”نہیں“

”کرتا را؟“

”نہیں۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہاں ہاں وہی، کرتا را۔“

”باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔“

پر میشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو کھٹنوں تلے دے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے، مگر کبڈی کی رٹ جاری ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا۔

”کیوں بے کرتا رو تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟“

”اچھا کیا جو مارا۔“ اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

”تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟“ لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟“

”مسلا۔“ لڑکے نے اسے گالی دی۔

”سکھڑا!“ اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پر میشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ”سنو بیٹے میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟“

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پر میشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا۔ ”اماں کے پاس جاؤں گا۔“

”اور میرے پاس نہیں رہو گے؟“ پر میشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

”تمہارے پاس بھی رہوں گا۔“ اختر نے معے کا حل پیش کر دیا۔ پر میشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا۔ ”دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آرہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آرہے ہیں۔ سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ، پھر جب وہ چلے جائیں گے تو میں تمہیں لے آؤں گا۔“

پر میشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا گولا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے

ہو۔ تے ہوئے گولے کو فور سے دیکھا اور اچانک تڑک کر بولا۔

”فوجیوں کی لاری آگئی۔“۔۔۔ وہ مینڈھ پر سے کود پڑا۔ اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ ”گیا نے۔ اوگیان سنگھ!“ وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پر میشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اختر کے حوالے کر کے بولا۔ ”آؤ بھی کرتا رہے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالہ ہتھیا نے آئے ہیں۔ ہونہہ!“۔۔۔ پر میشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی۔

”جاؤں؟“

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پر میشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ گولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا، پھر بھاگم بھاگم گرنختی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنختی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبر دار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنختی جی نے گرنختہ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ ”لڑکے کی بات دوسری ہے۔“ کسی نے پر میشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور اس پاس کے سکھ پر میشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے، پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس مامتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی درد ناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیلیاں گئی تھیں ”اور مذہب کا کیا ہے دوستو۔“ اس نے کہا تھا ”دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو۔ ان کی آمد پر پناہ پتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں۔۔۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگوروجی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔“

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنختی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور

لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرختی جی نے پر میشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پر میشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک بادیں دینے لگے۔ لیکن پر میشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پر میشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ چانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ ”ہائے اتنا بڑا کائنات تر گیا پورے کا پورا۔“ وہ چلایا۔ اور پھر اس کی ماں نگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کائنات نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری ”ارے میرا دو پٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔“

پر میشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا ”سنو۔ کیا تمہیں کرنا را اب بھی یاد آتا ہے۔“

”لو اور سنو۔“ بیوی بولی۔ اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔ ”کرنا راتو میرے کلیجے کا سور بن گیا ہے پر میشر۔“

کرنا رے کا نام سن کر ادھر سے امر کو راٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پر میشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑ کر باہر والاں میں آیا اور بولا۔ ”آج دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔“

اختر فوراً مان گیا۔ پر میشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھالیا۔

کھیتوں میں آ کر بولا۔ ”یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے مٹیے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔“

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمہاری اماں کے دلیس میں۔“

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

”یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔“

اب کے اختر بولا۔ ”ہم چاند کو دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟“

”ہاں“ پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ ”چلو گے اماں کے پاس؟“

”ہاں“ اختر بولا۔ ”پر تم لے تو جا تے نہیں، تم بہت بڑے ہو۔ تم سکھ ہو۔“

پرمیشر سنگھ بولا۔ ”نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی

ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔“

”میں بھی تو اداس ہو۔“ اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

”میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لے جا رہا ہوں۔“

”سچ؟“ اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ ”ہم اماں پاس جا

رہے ہیں۔ پر مومن ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پر مومن کو چٹھی لکھیں گے۔“

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے

پوچھا۔ ”گانا سنو گے؟“

”ہاں“

”پہلے تم قرآن سناؤ۔“

”اچھا۔“ اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفو احد پڑہتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر جھوکی اور

بولا۔ ”لاؤ تمہارے سینے پر بھی جھو کر دوں۔“

رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر

چھو کر دی اور بولا۔ ”اب تم سناؤ۔“

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا، اس لیے

اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنو دا سر بن ورگا جے



بنو دا منہ چن ورگا جے

بنو دا لک چتر جے

لوکو

بنو دا لک چتر

”بنو کون ہے؟“ اختر نے پر میشر سنگھ کوٹو کا۔

پر میشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا۔ ”میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں اس کا نام بنو

ہے، امر کور کا نام بھی بنو ہے، تمھاری اماں کا نام بھی بنو ہی ہوگا۔“

”کیوں؟“ اختر خفا ہو گیا۔ ”وہ کوئی سکھ ہے!“

پر میشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیڈر روتے

اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیڈروں کی آواز سے ڈرا مگر پر میشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور

ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پر میشر سنگھ سے پوچھا۔ ”اب کیوں نہیں روتے

گیڈر؟“ پر میشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گو بند کی کہانی تھی لیکن اس نے بڑے

سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر ”پھر؟ پھر؟ کی رٹ لگاتا رہا

اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا۔ ”ارے چاند تو سر پر آ گیا!“

پر میشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا۔

”تمھاری اماں کا دلیس جانے کدھر چلا گیا۔“

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے

خوشی کے یوں کودا کہ پر میشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین

پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”جاؤ بیٹے۔ تمھیں تمھاری اماں نے پکارا

ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں۔۔۔“

”شش!“ اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔ ”اذان کے وقت نہیں

بولتے۔“

”پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!“ پر میشر سنگھ بولا۔

”شش!“ اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پریش سنگھ نے اسے گود میں بٹھالیا۔ اس کے ماتھے پر ایک طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد استیئوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم۔۔۔“

”کیوں؟ کیوں نہیں آؤ گے؟“ اختر نے پوچھا۔

”تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔“ پریش سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ ”بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتارا نہیں۔ اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو۔ مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔“

”لکھوں گا۔“ اختر نے وعدہ کیا۔

”اور ہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے تو اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا؟“

”اچھا۔“

پریش سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا ”جاؤ“ اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔ ”تم بھی آ جاؤ نا۔“

”نہیں بھئی“ پریش سنگھ نے اسے سمجھایا۔ ”تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اختر بولا۔

”قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟“ پریش سنگھ نے مشورہ دیا۔

”اچھا“ بات اختر کی سمجھ میں آ گئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

زمزم پوائنٹ کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے بڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پریش سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے ”کون ہو تم؟“

”اختر!“ وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

”اختر!“ دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی آنکھوں کی سی پگڑی کو، پھر

ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی سر سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا ”میرا کنگھالاؤ تم نے میرا کنگھالے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں ماروں گا۔“

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھپ سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ ”ہالٹ!“ ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اچالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی رونا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پریشانگہ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کا ثنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یا رو۔“

دُور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

☆☆☆

## فکاہی کالم

(چند اقتباسات)

احمد نسیم قاسمی کے فکاہی کالموں سے چند دلچسپ اقتباسات پیش ہیں:

☆ (1)۔ ”قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں مقیم کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے فلم کے لیے ایک کہانی ”بخارا“ لکھی اور منورنجن پکچرز کے ایک سینٹھ کے ہاتھ بیچ دی۔ دونوں دوستوں نے ہمیں ملتان سے دہلی بلایا کہ اس کہانی کے گانے لکھ دیں۔ وہ ہم نے لکھ دیے۔ معاوضے میں ملنے والی رقم ہم تینوں نے برآمد بانٹ لی۔ ہماری بلا جانے کہ وہ فلم بنی یا نہیں بنی۔۔۔ اس واقعے کا ایک نکتہ بے حد فریب ہے۔ جب ہم نے ”بخارا“ کے گانے لکھ لیے اور میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی نے انھیں پاس کر دیا تو ہم سب سینٹھ کو گانے سنانے اور معاوضہ وصول کرنے چلے۔ راستے میں منٹو نے ہمیں سمجھایا ”دیکھیے! یہ فلمی دنیا ہے۔ یہاں انا ونا کا قصہ نہیں چلتا۔ جو کچھ سینٹھ کہتا ہے، وہی سچ ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے۔ آپ شاعر لوگوں کی انا کی دھار، بالکل سترے کی دھار ہوتی ہے مگر یہاں یہ ستر انہیں چلے گا۔ سینٹھ اگر کہے کہ یہ ٹھیک ہے تو آپ کہنے گا کہ یہی ٹھیک ہے۔ اگر سینٹھ کہے گا کہ وہ ٹھیک ہے تو آپ کہیے گا وہی ٹھیک ہے۔ سمجھے آپ؟ بس آنا و صدقہ کہتے چلے جائے گا تا کہ چیک وصول ہو اور اسے آج ہی کیش کرا لیا جائے کہ سینٹھوں کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔“

پھر ہم چاروں سینٹھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گیت سنانے کا حکم ہوا تو ہم نے سناے اور ساتھی ہمیں داد دیتے رہے۔ بے تحاشا مونے سینٹھ کی مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ گیت انھیں بھی پسند ہیں۔۔۔ آخر ایک مرحلے پر جب ہم نے گیت کا ایک مصرع کچھ اس طرح پڑھا۔۔۔ ”یہ آرزو ہے کہ تیرے در پر!“۔۔۔ ”آرزو؟“ بے ہنگم منا پے میں مبتلا سینٹھ کے اندر سے آواز برآمد ہوئی۔ ”آرزو نہیں چلے گی کوئی صاحب! اشار کیجئے آشا۔۔۔۔۔ آرزو ہٹا دیجیے۔“ ہم منٹو کی ہدایت کے مطابق یہ کہنے ہی والے تھے

کہ بہت اچھا، ہنادیں گے مگر معاً منٹو تیزی سے بولے ”کیوں سیٹھ صاحب! آرزو کیوں ہوئے؟ آسا کا یہ مقام نہیں ہے۔ یہ آرزو کا مقام ہے۔ شاعری کی سمجھ نہ ہو تو اعتراض نہیں کیا جاتا۔ آرزو ہی رہے گا۔ یہ نہیں بدلا جاسکتا۔“ اس دوران میں کرشن چندر ہمیں اور ہم کرشن چندر کو حیرت سے دیکھتے رہے کہ دس منٹ پہلے کے ماسح منٹو کو یکا یک کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو چپک کا قصہ ہی تمام کر دے گا مگر تب منٹو سے شکست کھا کر سیٹھ بولا ”اچھا بابا! آرزو ہی چلنے دو۔ تم بولتا بہت اچھا ہے، نیچا بولا کرو۔“

☆ (2)۔ شلوار تو وہ ہے جس کے تجربے میں ہم گورز سندھ میر رسول بخش تالپور کے تعاون سے گزرے تھے۔ چند برس پہلے کی بات ہے، میر صاحب، فیض صاحب کے ساتھ ہمیں بھی اپنے حیدر آباد کے دولت کدے پر لے گئے اور ہمارا سامان ہوٹل میں پڑا رہ گیا۔ ہم کوٹ پتلون سوٹ میں ملبوس تھے اور دوسرے روز ہمیں یہی سوٹ پہن کر ایک تقریب میں حصہ لینا تھا۔ اس لیے ہم نے میر صاحب سے رات بھر کے لیے کوئی پاجامہ طلب کیا۔ پاجامہ میر صاحب نے عمر بھر نہیں پہنا۔ اس لیے وہ پاجامے کی بجائے شلوار اٹھا لائے۔ ہم نے جب اس شلوار کے ایک حصے میں اپنی ٹانگ داخل کی تو وہ داخل ہوتی چلی گئی۔ ہم نے اس کا پانچہ دریافت کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہنوز دلی دور است۔ پھر ہم نے سوچا کہ اگر یہ شلوار اتنی وسیع الرقبہ ہے تو کیوں نہ دونوں ٹانگیں شلوار کے ایک ہی پانچے میں ڈال دیں اور شلوار کا دوسرا حصہ اوڑھ کر سو جائیں مگر جب ہم دونوں ٹانگیں شلوار کے ایک حصے میں داخل کر چکے تو ابھی اس میں میلوں کی گنجائش تھی۔ چنانچہ ہم نے فیض صاحب سے عرض کیا کہ آپ بھی اس ایک پانچے میں آجائے مگر افسوس کہ انھوں نے ہماری یہ بات قہقہے میں اڑادی۔

وہ ایک ویسے ہی شلوار تھی، جسے دھونے کے لیے دھوبی کو بلوایا گیا۔ اس نے اسے اٹھا کر دیکھنا شروع کیا تو دس منٹ تک دیکھتا چلا گیا۔ جب شلوار ختم ہو گئی تو وہ اسے ایک طرف ڈال کر جانے لگا۔ پوچھا گیا، شلوار کو چھوڑ کر کہاں چلے؟ دھوبی نے جواب دیا ”جی آپ نے تو شلوار دھونے کے لیے بلوایا تھا، اور اب آپ مجھے ”تنبو“ دھونے کے لیے دے رہے ہیں جسے اگر پھیلا دیا جائے تو اس کے نیچے پوری بارات بیٹھ سکتی ہے۔“

☆ (3)۔ ”ہم نے بھی۔۔۔ آج سے برسوں پہلے ایک اہلکار کو دس روپے کی رشوت دی تھی کیوں کہ برسوں پہلے یہی ریٹ تھا۔ ہم اس زمانے میں ایک روزنامے کے مدیر تھے۔ روزناموں کے خلاف



ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمات دائر ہوتے ہی رہتے تھے۔ ہم بھی ایک ایسے ہی کیس کے سلسلے میں اپنے مینیجنگ ڈائریکٹر سمیت جو روزنامے کے پبلشر تھے، عدالت میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ ہمارے وکیل صاحب آج دوسرے مقدموں میں بہت مصروف ہیں، اس لیے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ عدالت، ہمارے والے کیس کو چند روز پر ملتوی کر دے۔ ہم اور ہمارے مینیجنگ ڈائریکٹر عدالت کے برآمدے میں اپنے وکیل کے منتظر کھڑے تھے، جب عدالت کے کمرے میں سے وکیل صاحب برآمد ہوئے اور فرمایا ”میں نے بات کر لی ہے، پرسوں کی تاریخ مل جائے گی۔ آپ یوں کیجیے، دس روپے کا ایک نوٹ ریڈر کو دے دیجیے اور بس۔۔۔ اچھا تو میں چلا۔“

مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب نے جیب میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ہمیں دیتے ہوئے بولے ”جائیے اور ریڈر کو یہ نوٹ دے آئیے تاکہ جلدی سے فارغ ہو کر واپس دفتر چلیں۔ بہت کام پڑا ہے۔“ ہم نے عرض کیا ”قسم لے لیجیے جو ہم نے کبھی کسی کو ایک اکٹنی کی بھی رشوت دی ہو۔ رشوت دینا تو ہمیں آتا ہی نہیں ہے۔ ہم تو اس فن سے نا بلد ہیں۔ گھبراہٹ کو چھپا نہیں سکیں گے اور دھڑلے جائیں گے۔ آپ مینیجنگ ڈائریکٹر کے علاوہ ماشاء اللہ اتنے بڑے زمیندار ہیں، کچھ تو تجربہ ہوا ہی ہوگا۔ آپ خود اندر جا کر رشوت دیجیے اور تاریخ لیجیے۔“

مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب نے ہماری بہت منتیں کیں کہ ہم بلا تراس گناہ کا ارتکاب کریں۔ میرے انکار پر کہا کہ ”میں بحیثیت مینیجنگ ڈائریکٹر اپنے اخبار کے ایڈیٹر کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اندر جا کر رشوت دے آئے۔“ میں نے جواب دیا ”میں ایک فرض شناس اور غیر متناہڈیٹر کی حیثیت سے آپ کا یہ حکم ماننے سے انکار کرتا ہوں۔“

آخر طے پایا کہ اگر ہم رشوت دیتے ہوئے پکڑے گئے تو ایم ڈی صاحب فوراً کمرہ عدالت میں آ کر اعلان کریں گے کہ رشوت دینے کی آدھی سزا کے حقدار وہ ہیں۔ چنانچہ دس کے نوٹ کو ہم نے منٹھی میں بند کیا اور کمرے میں داخل ہوئے اس وقت ہمیں اختلاج قلب بھی ہو رہا تھا اور یوں بھی لگا جیسے مسلسل زلزلہ آرہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس نوٹ کو ریڈر کی جیب میں کیسے منتقل کریں گے۔ یہی سوچتے ہوئے ہم ریڈر کے جنگلے کے قریب پہنچ گئے جو لکھنے میں مصروف تھا۔ ہم بات شروع کرنے کے لیے خشک گلے کوڑ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جنگلے میں سے ریڈر کا ہاتھ نکلا اور ہماری منٹھی میں سے دس کا نوٹ نوج کر چلتا ہوا۔ ہم ہکا بکا کھڑے رہ گئے کہ ارے! یہ کام تو بہت آسان نکلا۔“

پرسوں بارہ تاریخ کو۔“ آواز آئی۔ اور جس کو ہم شیر سمجھتے تھے، وہ چوہا نکلا۔ باہر آکر ہم نے مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب کو یہ کارروائی سنائی تو ہنستے ہنستے ہم دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ تب عدالت کے کمرے سے ایک چڑا سی آیا اور بولا ”صاحب پوچھ رہے ہیں، باہر کون بدتمیز لوگ قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان سے کہو یہ عدالت ہے، اپنے گھر جا کر ہنسیں۔“

(۷)۔ ”اب خشک پھلوں کا موسم آگیا ہے۔ یہ وہ پھل ہیں جنہیں بڑے بڑے معززین بھی بھری دھوتوں میں چپکے چپکے جیبوں، کھسکاتے رہتے ہیں اور گھر جاتے ہوئے مزے سے کھاتے ہیں۔ یہ وہی پھل ہیں جو مہمانوں کے سامنے رکھے تھے۔ میزبان نے دیکھا کہ مہمانوں کے ایک بچے نے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ سوانھوں نے کہا ”بیٹا اور کھاؤ۔“ بچہ بولا ”جی میرا پیٹ بھر گیا ہے۔“ میزبان نے کہا ”اچھا تو جیب میں ڈال لو۔“ اور بچے نے جواب دیا ”جی میری جیبیں بھی بھر گئی ہیں!“ چند روز پہلے ہم نے چلغوزوں کے زرخ پوچھے تو دکاندار نے ہوشربا زرخ بتائے۔ ہم حساب میں کمزور ہیں۔ سو عرض کیا ”چھٹا نکوں میں بتاؤ۔“ چھٹا نک کے زرخ سن کر ہم نے دست بستہ عرض کیا ”اچھا تو پھر ایک چلغوزہ قول دو۔“

☆ (5)۔ ”ہم کالج کی اسٹیج پر آغا حشر کے ڈرامے میں سہراب کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ ہمارے دشمن کے سردار کی بیٹی کا پارٹ ایک لڑکے کے سپرد تھا۔ سوگرو آفرید بننے کے لیے اس نے عورتوں کے مصنوعی بال سر پر سجا رکھے تھے۔ پھر یہی گرد آفرید مردانہ بہروپ میں سر پر مردانہ تاج پہن کر سہراب یعنی ہم سے بچھا آزما ہونے آئی۔ ہمارا کام یہ تھا کہ تلوار کے دو چار ہاتھ دکھا کر ہم مردانہ لباس والی گرد آفرید کو اڑنگے پر لا کر گرائیں گے تو اس کے سر پر سے مردانہ ٹوپی اتر جائے گی، اس کے زنا نہ بال اُس کے چار طرف لہرا جائیں گے اور ہم اس پر عاشق ہو جائیں گے، مگر اسٹیج کے دبدبے نے ہمیں بوکھلا رکھا تھا۔ ہم نے اسے اڑنگا مار کر اتنے زور کی پٹخنی دی کہ نہ صرف اس کے سر پر سے مردانہ ٹوپی اتر گئی بلکہ زنا نہ بال بھی اتر گئے اور نیچے سے ایک ہکا بکا کالج سٹوڈنٹ نکل آیا جو پکارا ”پانی“ اور پردہ منظر کے عین وسط میں گرا دیا گیا۔“

یہ تھیں احمد ندیم قاسمی کی مزاح نویسی اور شگفتہ نگاری کی چند جھلکیاں!

☆☆☆

## حواشی

### باب اول: سوانح حیات و تہذیب

- 01۔ تسنیم سلیم چغتاری۔ ”رم جہم“۔ ”مٹی کا سمندر“ (مرتب ضیا ساجد) مکتبہ انٹرنیشنل۔ لاہور۔ 1991ء ص 550
- 02۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ”احمد تیم قاسمی“۔ ”سرمایہ ادبیات“ اسلام آباد۔ خصوصی شمارہ۔ دسمبر 2006ء
- 03۔ منو بھائی۔ دیباچہ ”وادی سون بیکسر“۔ مصنف احمد غزالی۔ فیروز سنز لمیٹڈ۔ 1993ء ص 20
- 04۔ احمد تیم قاسمی۔ تمہید۔ 13، دسمبر 1946ء۔ ”جلال و جمال“۔ ”اساطیر“۔ لاہور۔ چونیوواں ایڈیشن 2000ء ص 9
- 05۔ ایضاً ص 10، 11
- 06۔ گلزار جاوید۔ ”احمد تیم قاسمی سے ایک انٹرویو“۔ ”سرمایہ عالمی اردو ادب“۔ دہلی۔ 1996ء ص 46
- 07۔ احمد تیم قاسمی۔ جلال و جمال“ ص 11
- 08۔ گلزار جاوید۔ ”انٹرویو“۔ عالمی اردو ادب۔ دہلی۔ 1996ء ص 47
- 09۔ سید احمد سعید ہدائی، مترجم ”ادبیات سلطان باہو“۔ العارفین پبلی کیشنز، جوہر آباد، ضلع خوشاب۔ 2001ء ص 1
- 10۔ ندیم اہل۔ ”انٹرویو“۔ ”مٹی کا سمندر“ ص 526
- 11۔ احمد شفیع۔ ”میراجبائی میر دوست“۔ ”ندیم نامہ“ (مرتب محمد طفیل، بشیر موجد) مجلس اباب فن۔ لاہور، ملتان، 1976ء ص 81
- 12۔ پیرزادہ محمد بخش، ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 8
- 13۔ ایضاً ص 9
- 14۔ ایضاً ص 16
- 15۔ ایضاً
- 16۔ احمد تیم قاسمی۔ ”انٹرویو“ گلزار جاوید۔ عالمی اردو ادب۔ دہلی ص 48، 49
- 17۔ محمد خالد اختر۔ ”ایک دوست کا موقع“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 125، 126
- 18۔ ایضاً
- 19۔ احمد تیم قاسمی
- 20۔ پیرزادہ محمد بخش۔ ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 17، 18
- 21۔ ایضاً ص 17، 18
- 22۔ احمد تیم قاسمی ”جلال و جمال“ ص 14

- 23۔ ایضاً ص 15
- 24۔ ایضاً
- 25۔ ایضاً
- 26۔ گلزار جاوید سائٹرویو۔ عالمی اردو ادب ص 49
- 27۔ ایضاً ص 50, 51
- 28۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”جلال و جمال“ ص 14, 15
- 29۔ گلزار جاوید سائٹرویو ص 51
- 30۔ پیرزادہ محمد بخش۔ ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 22, 23
- 31۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”جلال و جمال“ ص 17
- 32۔ ہاجرہ سرور۔ ”ندیم اور غم روزگار“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 60
- 33۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”جلال و جمال“ ص 17
- 34۔ پیرزادہ محمد بخش۔ ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 23
- 35۔ محمد خالد اختر۔ ”ایک دوست کا مرقع“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 133
- 36۔ جوش ملیح آبادی۔ ”ندیم ایک حقیقت پسند شاعر“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 168, 169
- 37۔ امیر حسین چمن سائٹرویو نومبر 1999۔ ”ملاقات و حکایات“۔ پرنٹ میڈیا پبلیشرز اسلام آباد۔ 2001 ص 128
- 38۔ پیرزادہ محمد بخش۔ ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ لاہور، ملتان ص 35, 36
- 39۔ ندیم اہل سائٹرویو۔ ”مٹی کا سمندر“ ص 529
- 40۔ پیرزادہ محمد بخش۔ ”شاہ“ ص 27
- 41۔ ندیم اہل سائٹرویو۔ ”مٹی کا سمندر“ ص 530
- 42۔ وسیم شیخ۔ ”ساگرہ جشن“۔ ”رسالہ عبارت“۔ حیدر آباد۔ ندیم ایڈیشن۔ 1997 ص 31
- ۔ صفدر ہمدانی۔ ”اسے نگاہِ وطن و سلامت رہے“۔ فنون 2013۔ شمارہ: 134، ص 25
- 43۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”چند یادیں“۔ ”عالمی اردو ادب“۔ دہلی ص 25, 26
- 44۔ گلزار جاوید سائٹرویو۔ ”عالمی اردو ادب“۔ دہلی ص 52
- 45۔ طالبات شعبہ اردو۔ مجلہ ”نخن“ 2004۔ شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ص 257-263
- 46۔ گفتگو:

- (1)۔ ﷺ۔ پیرزادہ محمد سلیم قاسمی صاحب۔ (ندیم صاحب کے بچپن، پیرزادہ محمد بخش کے صاحب زادے اور مولانا غلام مرشد صاحب کے نواسے)
- (2)۔ ﷺ۔ بیگم نور جہاں عباس قاسمی صاحبہ۔ (ندیم صاحب کی بھانجی۔ محترمہ سعیدہ بانو کی صاحبزادی اور ظہیر باہر کی بہن)
- (3)۔ ﷺ۔ نعمان ندیم قاسمی۔ (ندیم صاحب کا بیٹا)



## باب دوم: ندیم آئینے

- 01۔ ڈاکٹر مسرور احمد زئی۔ ”ندیم کی زندگی ایک نظر میں“۔ سرمایہ ”نئی عبارت“ حیدرآباد۔ 1997ء۔ ص 42
- 02۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”ایک انٹرویو“۔ گلزار جاوید، ”عالمی اردو ادب“۔ دہلی۔ 1996ء۔ ندیم نمبر۔ ص 48
- 03۔ جمیل یوسف۔ ”ندیم صاحب“۔ ”ندیم“ سرمایہ ”مونتاج“ لاہور شمارہ 2-1۔ 2007ء۔ ص 169
- 04۔ ڈاکٹر مسرور احمد زئی۔ ”پہلی بات“۔ سرمایہ ”عبارت“۔ مارچ 1997ء۔ ص 10
- 05۔ ڈاکٹر صابر آفاقی۔ ”قاسمی صاحب“۔ ”ندیم“۔ 2007ء۔ ص 387
- 06۔ افضل تو صیف۔ ”لاہور کا احمد ندیم قاسمی“۔ ”ندیم“۔ ص 374
- 07۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”چند یادیں“۔ عالمی اردو ادب۔ ندیم نمبر۔ ص 20-21
- 08۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”جلال و جمال“۔ پہلا مجموعہ کلام۔ تمہید، 1946ء۔ ”اساطیر“ لاہور۔ 2000ء۔ ص 12
- 09۔ پیر زادہ محمد بخش۔ ”شاہ“۔ ”ندیم نامہ“۔ مرتب محمد طفیل اور بشیر موجد۔ مجلس ادب اب فتن، لاہور ملتان۔ 1976ء۔ ص 7
- 10۔ احمد شفیع۔ ”میراجاتی، میرا دوست“۔ ”ندیم نامہ“۔ ملتان، لاہور۔ 1976ء۔ ص 77
- 11۔ ایضاً۔ ص 78
- 12۔ محمد خالد اختر۔ ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”ندیم“۔ ص 20
- 13۔ محمد خالد اختر۔ ”ایک دوست کا مرقع“۔ ”ندیم“۔ ملتان لاہور۔ ص 121
- 14۔ عبداللہ جاوید۔ ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”کچھ یادیں کچھ باتیں“۔ ”ندیم“۔ ص 92
- 15۔ نعمان ندیم قاسمی سے ایک گفتگو
- 16۔ مجتبیٰ حسین۔ ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”عظیم ندیم“۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ضیاء ساجد (مرتب)۔ مکتبہ اقریش۔ لاہور۔ 1991ء۔ ص 624
- 17۔ محمد سعید شیش۔ ”احمد ندیم قاسمی کی یاد میں“۔ ”ندیم“۔ ص 218
- 18۔ صلاح الدین حیدر۔ ”بیسویں صدی کا ایک قد آور شخص“۔ ”ندیم“۔ ص 178
- 19۔ ڈاکٹر مسرور احمد زئی۔ ”احمد شاہ، احمد ندیم قاسمی“۔ (نیا) ”ندیم نامہ“۔ ندیم یادگاری کتاب۔ ڈاکٹر اسلم فرخی۔ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی۔ 2006ء۔ ص 210-211
- 20۔ رؤف نیازی۔ ”تہرہ ”انور جمال“۔ ماہنامہ ”قومی زبان“۔ کراچی۔ مارچ 2008ء۔ ص 80
- 21۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”انٹرویو“۔ ساجد رؤف خان۔ ماہنامہ ”سیارہ ڈائجسٹ“۔ لاہور
- 22۔ محمد علی صدیقی۔ ”قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر“۔ عالمی اردو ادب، ندیم نمبر۔ ص 304
- 23۔ الطاف حسن قریشی۔ ”ایک عہد ساز شخصیت کے انمک نقوش“۔ ”ندیم“۔ ص 368
- 24۔ عطا علحق قاسمی۔ ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”ندیم“۔ ص 399
- 25۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”انٹرویو“۔ گلزار جاوید۔ عالمی اردو ادب، ندیم نمبر۔ ص 53
- 26۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”جلال و جمال“۔ ص 10



- 27۔ احمد غزالی: ”وادی سون سکسیر“۔ فیروز سنز لمیٹڈ۔ 1993ء ص
- 28۔ عبدالقادر حسن: ”برادر بزرگ قاضی صاحب“۔ ”مذہبِ قاضی“ ص 370
- 29۔ ہارون الرشید: ”بابا“۔ ”مذہبِ قاضی“ ص 293
- 30۔ احمد قاضی: ”چند یادیں“۔ عالمی اردو ادب۔ مذہبِ قاضی نمبر 22 ص
- 31۔ ماثوڈہ احمد عقیل روبی: ”مذہبِ قاضی“۔ نئی عبارت۔ مذہبِ قاضی نمبر 193 ص
- 32۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”مذہبِ قاضی“ ص 21
- 33۔ حدیجہ مستور: ”مذہبِ قاضی کی عشقیہ شاعری میں عورت کا رویہ“۔ مذہبِ قاضی نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 252
- 34۔ ہاجرہ مسرور: ”مذہبِ قاضی اور غم روزگار“۔ مذہبِ قاضی نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 41
- 35۔ پیر زادہ محمد بخش: ”شاہ“۔ مذہبِ قاضی نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 8
- 36۔ ہاجرہ مسرور: ”مذہبِ قاضی نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 41, 42
- 37۔ احمد قاضی: ”منتساب 1941“۔ ”گولے“۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور 2007ء۔ ص 5
- 38۔ پیر زادہ محمد بخش: ”شاہ“۔ مذہبِ قاضی نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 10
- 39۔ ہاجرہ مسرور: ”مذہبِ قاضی اور غم روزگار“۔ مذہبِ قاضی نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 43
- 40۔ فریدہ حفیظ: ”قاضی صاحب“۔ مٹی کا سمندر۔ ص 696
- 41۔ احمد قاضی: ”چند یادیں“۔ عالمی اردو ادب۔ ص 21
- 42۔ احمد قاضی: ”تمہید“۔ جلال و جمال۔ ص 12, 13, 14
- 43۔ احمد شفیع: ”مذہبِ قاضی نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 78
- 44۔ محمد خالد اختر: ”مذہبِ قاضی“۔ ص 20
- 45۔ محمد خالد اختر: ”مذہبِ قاضی نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 143
- 46۔ پروفیسر احتشام حسین: ”احمد قاضی“۔ ”کچھ یادیں“۔ عالمی اردو ادب۔ مذہبِ قاضی نمبر 367 ص
- 47۔ پروفیسر شریف کجانی: ”احمد قاضی“۔ عالمی اردو ادب۔ مذہبِ قاضی نمبر 378 ص
- 48۔ مجتبیٰ حسین: ”مٹی کا سمندر“۔ ص 625
- 49۔ محمد خالد اختر: ”مذہبِ قاضی“۔ ص 21
- 50۔ احسان دانش: ”تاثرات“۔ عالمی اردو ادب۔ ص 388
- 51۔ محمد علی صدیقی: ”عالمی اردو ادب“۔ ص 301
- 52۔ احمد قاضی: ”عالمی اردو ادب“۔ ص 50, 51, 52
- 53۔ احمد قاضی: ”جلال و جمال“۔ ص 16, 17
- 54۔ احمد قاضی: ”سائبرویو“۔ ”عالمی اردو ادب“۔ ص 52
- 55۔ ہاجرہ مسرور: ”مذہبِ قاضی نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 63, 65

- 56۔ احمد تیم تاقی سائرویو سندیئم اہل۔ ”مٹی کا سمندر“ ص 531, 532
- 57۔ انتظار حسین، ”ما قابل تلافی نقصان“۔ (نیا) ”سندیئم نامہ“۔ کراچی۔ ص 85
- 58۔ حمید اختر: ”زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے“۔ ”سندیئم“ ص 357
- 59۔ محمد علی صدیقی: عالمی اردو ادب سندیئم نمبر۔ ص 303
- 60۔ محمد خالد اختر: ”سندیئم“ ص 23, 24
- 61۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ ”عالمی اردو ادب“ ص 49
- 62۔ الطاف حسن قریشی: ”سندیئم“ ص 368
- 63۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”احمد تیم تاقی۔ سب اچھا کہیں جسے“۔ ”سرمائی ادبیات“۔ اسلام آباد۔ خاص شمارہ۔ 2002۔ ص 79
- 64۔ محمد کاظم: ”سندیئم“ ص 40
- 65۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ ”عالمی اردو ادب“ ص 50
- 66۔ احتشام حسین: ”عالمی اردو ادب“ ص 368
- 67۔ احمد تیم تاقی۔ ”چند یادیں“۔ ”عالمی اردو ادب“ ص 36
- 68۔ محمد اقبال، منصور احمد: ”سندیئم“ ص 774, 775
- 69۔ ڈاکٹر ناہید تاقی: ”سندیئم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ 2002۔ ص 12
- 70۔ ڈاکٹر ناہید تاقی: ”میرے بابا جی“۔ ”سندیئم نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 34
- 71۔ ڈاکٹر ناہید تاقی: سائرویو۔ افضل رحمان، سرمائی ”معاصر“ انٹرنیشنل سندیئم نمبر 2008۔ ص 300, 301
- 72۔ ایضاً
- 73۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ خالد سہیل۔ ماہنامہ ”بیاض“۔ لاہور سندیئم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 261
- 74۔ اکبر جمیدی: ”سندیئم عصر“۔ ”سندیئم“ ص 207
- 75۔ فیض احمد فیض: ”بے تکلف فنکار“۔ ”سندیئم نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 174, 176
- 76۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ اصغر عبداللہ۔ 1989۔ ”سندیئم“ ص 618
- 77۔ جمیل یوسف: ”سندیئم صاحب“۔ ”سندیئم“ ص 170
- 78۔ اکبر جمیدی: ”سندیئم عصر“۔ ”سندیئم“ ص 209
- 79۔ منصورہ احمد: ”میری رائے میں“۔ میرے ہم سفر احمد تیم تاقی۔ ”اساطیر“۔ لاہور۔ ص 12
- 80۔ مشفق خواجہ: ”سندیئم صاحب کے نام خط (22 مارچ 2001)“۔ سرمائی ”فنون“۔ شمارہ نمبر 124۔ اپریل 2005۔ ص 25
- 81۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ اصغر عبداللہ۔ ”سندیئم“ ص 619, 620
- 82۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ ”معاصر“۔ ”سندیئم“ نمبر۔ ص 326
- 83۔ احمد تیم تاقی سائرویو۔ ”فنون“۔ لاہور۔ شمارہ نمبر 124۔ ص

- 84۔ احمد ندیم قاسمی - اداریہ ”فنون“ - لاہور - شمارہ نمبر 114 - ص
- 85۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد: ”ان کا خلافتوں رہے گا“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 216
- 86۔ اسعد: ”کچھ یادیں کچھ باتیں“ - ”معاصر“ - ندیم نمبر - ص 51
- 87۔ امجد اسلام امجد: ”قاسمی صاحب“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 365
- 88۔ ڈاکٹر مجید عارف - ”احمد ندیم قاسمی - ایک ہمہ جہت شخصیت“ - ماہنامہ اخبارِ اردو - اگست 2008 - ص 38-40
- 89۔ محمد امجد: ”قاسمی صاحب - بحیثیت منتظم ادارہ“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 356
- 90۔ جوش ملیح آبادی: ”ندیم ایک حقیقت پسند شاعر“ - ندیم نامہ - ملتان لاہور - ص 169
- 91۔ ظفر اقبال: احمد ندیم قاسمی - ”مذہبِ ندیم“ - ص 374
- 92۔ رفعت مرتضیٰ: ”وقت کب سنتا ہے“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 184
- 93۔ شاہد احمد بلوی: ”ندیم - ہلالِ مطلعِ ادب“ - ندیم نامہ - لاہور ملتان - ص 186
- 94۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”سب اچھا کہیں جسے“ - ادبیات - خصوصی شمارہ - دسمبر 2006 - ص 83
- 95۔ کرامت بخاری: ”ایک ذاتی تاثر“ - ”نیاض“ - ”مذہبِ ندیم“ - نومبر 2006 - ص 220
- 96۔ محمد سعید شفیق - ”احمد ندیم قاسمی کی یادیں“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 219
- 97۔ جوش ملیح آبادی: عالمی اردو ادب - ندیم نمبر - 1996 - ص 394
- 98۔ صلاح الدین حیدر: ”بیسویں صدی کا ایک قد آور شخص“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 177
- 99۔ ڈاکٹر مسرور احمد زئی - ”احمد شاہ - احمد ندیم قاسمی“ - ”مذہبِ ندیم نامہ“ - (نیا) - کراچی - 2006 - ص 213
- 100۔ محمد کاظم: ”ایک تعلق کی یاد“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 37
- 101۔ مسعود اشعر: ”آخری ملاقات“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 50
- 102۔ ڈاکٹر خورشید رضوی - ”قاسمی صاحب“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 70
- 103۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد: ”احمد ندیم قاسمی“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 215
- 104۔ فیاض عزیز: ”سورج غروب ہوا“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 418
- 105۔ منصورہ احمد: ”میرے بابا“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 364
- 106۔ جمیل الدین عالی: ”آخری آدمی“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 361
- 107۔ ڈاکٹر خورشید رضوی - ”قاسمی صاحب“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 69
- 108۔ پروفیسر سلیم الرحمن - ”احمد ندیم قاسمی کا فلمی سفر“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 205
- 109۔ محمد احسن فاروقی: ”احمد ندیم قاسمی - ادیب و انسان“ - ”مذہبِ ندیم نامہ“ - ملتان لاہور - ص 194
- 110۔ رابعہ ندیم: انٹرویو - شہناز پروین - تحریر - فنکار ندیم نمبر سے - (نیا) - ”مذہبِ ندیم نامہ“ - کراچی - ص 71
- 111۔ ڈاکٹر ماہد قاسمی: ”میرے بابا جی“ - ”مذہبِ ندیم نامہ“ - ملتان لاہور - ص 35
- 112۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“ - ”مذہبِ ندیم“ - ص 19

- 113۔ محمد کاظم: ”ایک تعلق کی یاد میں“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 35
- 114۔ ڈاکٹر عبدالکریم: ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 215
- 115۔ ہارون الرشید: ”بابا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 291
- 116۔ علی تنہا: ”احمد ندیم قاسمی کی ادبی تربیت اور جنوبی پنجاب“۔ ”معاصر“ ندیم نمبر۔ 2008۔ ص 103
- 117۔ پروفیسر حسن عسکری: ”میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 391
- 118۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”پیش لفظ“۔ ”میرے ہم قدم“۔ احمد ندیم قاسمی 2007۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ ص 9
- 119۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”محبِ ندیم“۔ ”معاصر“ ندیم نمبر۔ 2008۔ ص 101
- 120۔ صلاح الدین حیدر: ”بیسویں صدی کا ایک قد آور شخص ندیم“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 179
- 121۔ ڈاکٹر صابر آفاقی: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 386
- 122۔ مستنصر حسین تارڑ: ”راکھ میں پھونکیں مارنے والا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 393
- 123۔ علی اصغر عباس: ”ہر گد کا پیڑ کٹ گیا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 442
- 124۔ محمد سعید شش: ”احمد ندیم قاسمی کی یاد میں“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 217
- 125۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ خالد سہیل۔ ”بیاض“ ندیم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 261
- 126۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی۔ ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ۔۔۔ ص 174-175
- 127۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”چند یادیں“ عالمی اردو ادب۔ ندیم نمبر۔ ص 21
- 128۔ منصورہ احمد۔ ”میرے بابا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 261
- 129۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”محبِ ندیم“۔ ”معاصر“ ندیم نمبر۔ 2008۔ ص 96
- 130۔ محمد کاظم: ”ایک تعلق کی یاد میں“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 39-40
- 131۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: ”وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے“۔ ”مذہبِ ندیم“ ملتان لاہور۔ ص 219
- 132۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”احمد ندیم قاسمی کا آدم نو“۔ ”مٹی کا سمندر“ ص 577-581
- 133۔ ظفر اقبال: ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 373
- 134۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ خالد سہیل۔ ”بیاض“۔ ندیم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 262
- 135۔ ہارون الرشید: ”بابا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 292-293
- 136۔ محمد امجد: ”قاسمی صاحب۔ بحیثیت منظم ادارہ“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 352
- 137۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ طالبات۔ مجلہ ”عشق“۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو۔ لاہور۔ 2004۔ ص 263
- 138۔ محمد علی صدیقی: ”قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر“۔ عالمی اردو ادب۔ ندیم نمبر۔ ص 304
- 139۔ احمد ندیم قاسمی۔ چند نکات اپنی 80 ویں سال گرہ پر۔ ”نئی عبارت“۔ ص 28-29
- 140۔ احمد ندیم قاسمی: ”تمہید“۔ ”جلال و جمال“۔ ص 33



- 141۔ احمد ندیم قاسمی: ”میرا نظریہ فن“۔ عالمی اردو ادب۔ ص 61-62
- 142۔ احمد ندیم قاسمی: ”میرا فن نظریہ“۔ دیباچہ ”جلال و جمال“۔ ص 29
- 143۔ احمد ندیم قاسمی: ”تخلیقی فنون کے بارے میں میرا نقطہ نظر“۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 267
- 144۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”ندیم کا نظریہ شعر و فن“۔ ”ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“۔ ص 61
- 145۔ اکبر جمیدی: ”ندیم عصر“۔ احمد ندیم قاسمی: ”مذہب ندیم“۔ ص 209
- 146۔ جمیل یوسف: ”ندیم صاحب“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 171
- 147۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: ”وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی ہے!“۔ عالمی اردو ادب۔ ندیم نمبر۔ ص 283
- 148۔ اکبر جمیدی: ”ندیم عصر“۔ احمد ندیم قاسمی: ”مذہب ندیم“۔ ص 209
- 149۔ عطاالحق قاسمی: ”ندیم صاحب“۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 711
- 150۔ وحید الحسن ہاشمی: ”اہل قلم کا خراج عقیدت“۔ مرتبہ رؤف ظفر۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 491
- 151۔ احمد ندیم قاسمی: ”انٹرویو“۔ گلزار جاوید۔ عالمی اردو ادب۔ ندیم نمبر۔ ص 56
- 152۔ احمد ندیم قاسمی: ”تخلیقی فنون کے بارے میں میرا نقطہ نظر“۔ نئی عبارت۔ ندیم نمبر۔ ص 264
- 153۔ احمد ندیم قاسمی: ”وہابیہ اہم کلیدی خطبے“۔ ”پس الفاظ“۔ ”اساطیر“۔ ص 18
- 154۔ احمد ندیم قاسمی: ایضاً
- 155۔ اکبر جمیدی: ”ندیم عصر“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 207
- 156۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”احمد ندیم قاسمی تخلیقی شخصیت“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 75
- 157۔ احمد ندیم قاسمی: ”پس الفاظ“۔ ”اساطیر“۔ ص 197
- 158۔ الطاف حسن قریشی: ”ایک عہد ساز شخصیت کے نام نہ نقوش“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 368
- 159۔ قیصر جمکین: ”ایک عالی دماغ تھا، نہ رہا“۔ ”معاصر“۔ ندیم نمبر۔ ص 148
- 160۔ نصیبہ حیات قاسمی: ”ندیم کی شاعری میں امید و جستجو“۔ ”بیاض“۔ ندیم نمبر 2006۔ ص 302
- 161۔ احمد ندیم قاسمی: ”میرا نظریہ فن“۔ ”ندیم نامہ“۔ ملتان، لاہور۔ 1976۔ ص 341
- 162۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”نظم“۔ ”دشت وفا کی پکار“۔ ”گل پاشی“۔ 1996۔ ”اساطیر“۔ لاہور۔ ص 181
- 163۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”ادبیات“۔ خصوصی شمارہ دسمبر 2006۔ ص 20
- 164۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”سوز و غم“۔ ”احمد ندیم قاسمی“۔ شاعر اور افسانہ نگار۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ 2007۔ ص 109
- 165۔ الطاف حسن قریشی: ”ایک عہد ساز شخصیت کے نام نہ نقوش“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 368
- 166۔ محسن احسان: ”محبوبوں کا دیوتا“۔ ”ادبیات“۔ خصوصی شمارہ۔ ص 71
- 167۔ عطاالحق قاسمی: ”سورت ڈوب گیا؟“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 398
- 168۔ ڈاکٹر ہارون الرشید قاسمی: ”اردو ادب کا سالانہ کارواں“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 421



- 169۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان۔ ”احمد ندیم قاسمی پشاور میں“۔ ”نئی عبارت“۔ ص 209
- 170۔ ہارون الرشید۔ ”کوہ کن“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 409
- 171۔ مقصود الہی شیخ: ”مذہب ندیم ایک پھول تھا“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 174
- 172۔ پیر زادہ محمد بخش: ”شاہ“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 24-25
- 173۔ اجمل دانش: ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 484
- 174۔ فکرت نسوی: ”مذہب ندیم“۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 723
- 175۔ احمد ندیم قاسمی: انٹرویو۔ گلزار جاوید۔ عالمی اردو ادب۔ مذہب ندیم نمبر۔ ص 53-54
- 176۔ عبداللہ جاوید: ”کچھ یادیں، کچھ باتیں“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 93-94
- 177۔ اکبر جمیدی: ”مذہب عصر“۔ احمد ندیم قاسمی: ”مذہب ندیم“۔ ص 2089
- 178۔ پروفیسر فتح محمد ملک ”تغصبات“۔ ص 103
- 179۔ صلاح الدین حیدر نیسویں صدی کا ایک قد آور شخص۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 180
- 180۔ پروفیسر خالد حسین خان: ”اردو ادب کا عظیم فن کار“۔ مفت روزہ ”ہماری زبان“۔ نئی دہلی۔ جنوری 2008۔ ص 26
- 181۔ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا: ”خراج عقیدت“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 491
- 182۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد: ”ان کا خلافتوں پر نہ ہو سکے گا“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 216
- 183۔ مسعود اشعر: ”آخری ملاقات“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 44
- 184۔ ڈاکٹر خورشید رضوی: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 70
- 185۔ غلیق انجم: ”احمد ندیم قاسمی۔ ہمہ گیر شخصیت“۔ مفت روزہ ”ہماری زبان“۔ نئی دہلی۔ ص 40
- 186۔ سید عظیم: ”احمد ندیم قاسمی کی ہجرت“۔ رحیم انجیل۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 234
- 187۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ اصغر عبداللہ۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 616
- 188۔ احمد ندیم قاسمی۔ ”تخلیقی فنون کے بارے میں میرا نقطہ نظر“۔ ”نئی عبارت“۔ ص 267
- 189۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ خالد سہیل۔ ”بیاض“۔ مذہب ندیم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 262
- 190۔ احمد ندیم قاسمی۔ انٹرویو۔ سید اہل۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 534
- 191۔ مجتبیٰ حسین: ”احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہب ندیم“۔ ص 365
- 192۔ جوش ملیح آبادی: ”ایک نامور“۔ مذہب ندیم نمبر۔ ”انکار“۔ 1975۔ ص 33
- 193۔ فراق گورکھپوری: ”مذہب قاسمی“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 170
- 194۔ حفیظ جالندھری: ”دو راز شاعر“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 172
- 195۔ سید عابد علی عابد: ”مذہب احترامِ ادبیت کا نقیب“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 184
- 196۔ محمد احسن فاروقی: ”مذہب ادیب و انساں“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 189
- 197۔ سید احتشام حسین: ”کچھ یادیں“۔ ”مذہب نامہ“۔ ملتان لاہور۔ ص 208

- 198۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: ”وہ کہ شاعر بھی ہے، انسان بھی ہے!“۔ ”مذہب نامہ“ ملتان لاہور۔ ص 315-322
- 199۔ اختر اورینو: ”احمد تیم قاسمی“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 227
- 200۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی: ”احمد تیم قاسمی کی شاعری“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 233-237
- 201۔ وقار عظیم: ”مذہب کے فسانے“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 286
- 202۔ اسلوب احمد انصاری: ”احمد تیم قاسمی اور اردو افسانہ“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 291-297
- 203۔ وقار انبالوی: ”قاسمی بطور مزاح نگار“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 321-322
- 204۔ ڈاکٹر انوار احمد: ”مذہب کی خاک رنگاری یا خودنوشت“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 89-93
- 205۔ احمد تیم قاسمی: ”چند یادیں“۔ ”عالمی اردو ادب“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 25-26
- 206۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 29-30
- 207۔ قیصر جمکین: ”ایک عالمی دماغ تھا، نہ رہا“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 148
- 208۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”احمد تیم قاسمی کی تخلیقی شخصیت“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 73
- 209۔ ڈاکٹر خورشید رضوی: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 172
- 210۔ اشفاق حسین: ”احمد تیم قاسمی: چند یادیں“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 234
- 211۔ اطہر رضوی: ”دریا سمندر سے چلا۔۔۔۔۔“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 249-253
- 212۔ منصورہ احمد: ”میرے بابا“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 260-265
- 213۔ مجتبیٰ حسین: ”احمد تیم قاسمی“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 364
- 214۔ آفتاب اقبال شمیم: ”احمد تیم قاسمی ایک تحریک“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 376-378
- 215۔ امجد اسلام امجد: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 395
- 216۔ عطا الحق قاسمی: ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 398
- 217۔ محمد اظہار الحق: ”یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 414-415
- 218۔ فیاض عزیز: ”سورج غروب ہوا“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 417
- 219۔ طاہر سرور میر: ”مرشد سے مرید کی ملاقات“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 467
- 220۔ احمد تیم قاسمی: ”چند نکات اپنی 80 ویں سالگرہ کے قریب کے حوالے سے“۔ ”نئی عبارت“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 28
- 221۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”انٹرویو، افضل رحمان“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 301
- 222۔ رابعہ تیم: ”انٹرویو۔ شہناز پروین سحر“۔ ”افکار“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 99
- 223۔ سید احتشام حسین: ”احمد تیم قاسمی: کچھ یادیں“۔ ”عالمی اردو ادب“۔ ”مذہب نامہ“، ملتان لاہور۔ ص 367
- 224۔ مولانا عبدالمجید سائیک: ”تعارف۔ شعلہ گل“۔ ”اساطیر“۔ لاہور
- 225۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”مذہب کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“۔ ”اساطیر“۔ لاہور۔ ص 85-98

- 226۔ منصورہ احمد: نظم ”سنو بابا“۔ ”فنون“ شمارہ
- 227۔ محمد خالد اختر: ”ایک دوست کا مرقع“۔ مدّیم نامہ۔ ملتان لاہور۔ ص 133
- 228۔ احمد مدّیم قاسمی: انٹرویو۔ سرار زیدی۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 564
- 229۔ ایوب خاور: ”کپاس کے پھول“۔ ”مدّیم“۔ ص 226
- 230۔ صلاح الدین حیدر: ”بیسویں صدی کا ایک قد آور شخص“۔ ”مدّیم“۔ ص 179
- 231۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد: ”ان کا خلافتوں پر نبو سکے گا“۔ ”مدّیم“۔ ص 215
- 232۔ طاہر سرور میر: ”مرشد سے مرید کی ملاقات“۔ ”مدّیم“۔ ص 466
- 233۔ حمید احمد ”ٹٹھی“: ”ہزاروں چاہنے والوں سے بھری ویران گلی“۔ ”مدّیم“۔ ص 429
- 234۔ اسلام عظمیٰ: ”وہ جو ہمیں جانتا تھا“۔ ”معاصر“۔ مدّیم نمبر۔ 2008۔ ص 167
- 235۔ صوفیہ پیداز ”سنگ زنی اور اعزاز کے ساتھ تدفین“۔ ”بیاض“۔ مدّیم نمبر۔ 2006۔ ص 308
- 236۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر: ”احمد مدّیم قاسمی سے تین سوال۔۔۔“۔ ”بیاض“۔ مدّیم نمبر۔ 2006۔ ص 284-281
- 237۔ احمد مدّیم قاسمی ”نوجوان نسل سے خطاب“۔ ”سرمایہ“ ادب سرائے۔ لاہور (انٹرنیشنل)۔ ستمبر 2007۔ ص 9-11
- 238۔ احمد مدّیم قاسمی: انٹرویو۔ خالد سہیل۔ ”بیاض“۔ مدّیم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 263
- 239۔ ڈاکٹر زاہد قاسمی: انٹرویو، افضل رحمان۔ ”معاصر“۔ مدّیم نمبر 2006۔ ص 302
- 240۔ احمد مدّیم قاسمی: ”تخلیقی فنون کے بارے میں میرا نقطہ نظر“۔ ”نئی عبارت“۔ مدّیم نمبر۔ ص 262
- 241۔ احمد مدّیم قاسمی: انٹرویو۔ خالد سہیل۔ ”بیاض“۔ مدّیم نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 262
- 242۔ احمد مدّیم قاسمی: ”خطبہ“۔ ”ادبیات“۔ خصوصی شمارہ۔ دسمبر 2006۔ ص 256
- 243۔ احمد مدّیم قاسمی: انٹرویو۔ سرار زیدی۔ ”مٹی کا سمندر“۔ ص 519
- 244۔ احمد مدّیم قاسمی: ”80 ویں سال گرہ“۔ ”نئی عبارت“۔ ص 28-29
- 245۔ احمد مدّیم قاسمی: انٹرویو، طلباء۔ ”ادب سرائے“۔ مدّیم شمارہ۔ ستمبر 2007۔ ص 16
- 246۔ احمد عقیل روہی: ”PROMETHEUS UNBOUND“۔ ”مدّیم صاحب“۔ ”نئی عبارت“۔ مدّیم نمبر۔ ص 195-196
- 247۔ مسعود اشعر: ”آخری ملاقات“۔ ”مدّیم“۔ ص 49
- 248۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”سب اچھا کہیں جسے“۔ ”ادبیات“۔ مدّیم نمبر۔ دسمبر 2006۔ ص 79
- 249۔ علی اصغر عباس: ”ہر گد کا پیڑ کٹ گیا“۔ ”مدّیم“۔ ص 442
- 250۔ حمید احمد ”ٹٹھی“: ”ہزاروں چاہنے والوں سے بھری ویران گلی“۔ ”مدّیم“۔ ص 429
- 251۔ مسعود مفتی: ”آخری ملاقات“۔ ”معاصر“۔ مدّیم نمبر۔ 2008۔ ص 60-61
- 252۔ شبنم شکیل: ”ہے کرر۔۔۔۔۔“۔ ”مدّیم“۔ ص 380

- 253۔ کشورناہید: ”طارق مسعود کی ادبی رپورٹ - اردو ادب کا ایک عہد ختم ہو گیا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 473
- 254۔ افضل تو صیغ: ”وہلا ہو رکا احمد ندیم قاسمی تھا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 386
- 255۔ عطا الحق قاسمی: ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 399
- 256۔ حسن ثار: ”سمندر اور صحرا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 406
- 257۔ محمد حیات قاسمی ایڈووکیٹ کا بیان
- 258۔ ہارون الرشید: ”کوہ کن“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 410
- 259۔ احمد ندیم قاسمی - انٹرویو
- 260۔ فتح محمد ملک: ”طارق مسعود کی ادبی رپورٹ“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 474
- 261۔ ڈاکٹر خورشید رضوی: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 66-69
- 262۔ ڈاکٹر خورشید رضوی: ”خراجِ تحسین“۔ ”معاصر“۔ مئی نمبر۔ 2008۔ ص 75
- 263۔ مسعود اشعر: ”آخری ملاقات“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 42-50
- 264۔ مقصود الہی شیخ: ”ندیم ایک پھول تھا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 173
- 265۔ فتح محمد ملک: ”کون کہتا ہے کہ موت آتی تو مر جاؤں گا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 78
- 266۔ شکیلہ رفیق: ”باور آ یا ہمیں دریا کا سمندر ہونا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 185
- 267۔ ڈاکٹر عبد الکریم خالد: ”ان کا خلا مدتوں پہر نہ ہو سکے گا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 213
- 268۔ ہارون الرشید: ”بابا“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 290
- 269۔ عرفان جاوید: ”آخری ملاقات“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 346-350
- 270۔ محمد امجد: ”قاسمی صاحب - بحیثیت منظم ادارہ“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 352-356
- 271۔ عطا الحق قاسمی: ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 399
- 272۔ ڈاکٹر کیول دھیر، ”ندیم قاسمی کے انتقال سے۔۔۔“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 384
- 273۔ سلمیٰ صدیقی: ”ایک تحریر“۔ ”ALL STAND UP. TEACHER IS IN THE COUT“
- 274۔ رضوانہ سیدی: ”ادب کا ندیم“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 487
- 275۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی، ”میرے سہیلی“۔ ”ادبیات“۔ خصوصی شمارہ دسمبر 2006۔ ص 139-140
- 276۔ محمد کاظم، ”ندیم - ایک تعلق کی یاد میں“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 41
- 277۔ ایوب خاور: ”کپاس کا پھول“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 224
- ڈاکٹر شاہین مفتی، ”نشانِ راہ“۔ ”ادبیات“۔ خصوصی شمارہ دسمبر 2006۔ ص 150
- ڈاکٹر ناہید قاسمی: ”میرے دوست - میرے سہیلی“۔ ”بیاض“۔ مئی نمبر۔ نومبر 2006۔ ص 296
- 278۔ نند کشور کرم: ”ندیم - ایک ہشت پہلو شخصیت“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 157
- 279۔ صلاح الدین حیدر: ”بیسویں صدی کا ایک قدر آور شخص“۔ ”مذہبِ ندیم“ ص 177



- 280۔ حمید اختر: ”زمین کھاگئی آسمان کیسے کیسے“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 357
- 281۔ جمیل الدین عالی: ”آخری آدمی“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 360
- 282۔ ظفر اقبال: ”احمد تہم قاضی“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 374
- 283۔ آفتاب اقبال شمیم: ”مذہبِ تہم۔ ایک تحریک، ایک تنظیم“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 378
- 284۔ امجد اسلام امجد: ”قاضی صاحب“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 396
- 285۔ ڈاکٹر محمود ناصر ملک: ”ابھی ابھی انھی کنوئیں میں“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 397
- 286۔ عطا الحق قاضی: ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 397
- 287۔ ہارون الرشید: ”کوہ کن“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 412
- 288۔ محمد اکمل الحق: ”یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ تہم“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 413
- 289۔ جاوید چوہدری: ”قاضی صاحب کے نام“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 421
- 290۔ بشریٰ اعجاز: ”احمد تہم قاضی کی یاد میں“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 436
- 291۔ خواجہ پرویز: ”روشنی کا مینار“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 431
- 292۔ غافر شہزاد: ”شجر سایہ دار“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 446
- 293۔ ناصر بشیر: ”قاضی کہانی“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 448
- 294۔ طارق مسعود: ”اردو ادب کا ایک عہد ختم ہوا“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 472
- 295۔ افضل تو صیف: ”وہلا ہو رکا احمد تہم قاضی تھا“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 376
- 296۔ علی تنہا: ”مذہبِ تہم کی ادبی تربیت اور جنوبی پنجاب“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 104
- 297۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”احمد تہم قاضی۔ تخلیقی شخصیت“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 177
- 298۔ قیصر جمیل: ”ایک مذہبِ تہم“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 86
- 299۔ طاہر اقبال: ”لفظوں کا کوزہ گر“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 285
- 300۔ طاہر سرور میر: ”مرشد سے مرید کی ملاقات“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 467
- 301۔ ایم آر شاہد: ”احمد تہم قاضی“۔ بیاض 2006 ص 224
- 302۔ منو بھائی: ”مجھے منو بھائی، احمد تہم قاضی نے بنایا“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 366
- 303۔ الطاف حسن قریشی: ”ایک عہد ساز شخصیت کے انمنسٹ نقوش“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 367
- 304۔ جاوید اختر چوہدری (یو۔ کے): ”اردو ادب کا ایک اساطیر کردار“۔ ”مذہبِ تہم“ ص 367
- جنوری 2008 ص 23
- 305۔ احمد تہم قاضی: ”حرف اول۔ ذاتی وضاحت“۔ ”فنون“ اگست 2004 ص 12
- 306۔ ”نفسیہ، نلیم ماموں“۔ ”پت جھڑ“ (افسانے ماہی) احمد تہم قاضی۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007 ص 136-144



### باب سوم: تنقیدیں

- 01۔ محمد خالد اختر: "ایک آدمی احمد شاہ نامی"۔ "مذہبِ تہم"۔ سہ ماہی مونیج۔ لاہور۔ 2007ء۔ ص 27
- 02۔ سید عابد علی عابد: "اپنی رائے"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 50
- 03۔ ڈاکٹر سلیم اختر: "احمد تہم قاسمی، تخلیقی شخصیت"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 73-77
- 04۔ پروفیسر عبداللہ جاوید: "کچھ یادیں، چند تاثرات"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 91
- 05۔ اشفاق حسین: "چند یادیں، چند تاثرات"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 230
- 06۔ اطہر رضوی: "دریا سمندر سے جاملا"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 249
- 07۔ پروفیسر قیصر نجفی: "ایک بڑا انسان، ایک بڑا تخلیق کار"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 270
- 08۔ مجتبیٰ حسین: "احمد تہم قاسمی"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 363-364
- 09۔ عبدالقادر حسن: "برادر بزرگ احمد تہم قاسمی"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 370
- 10۔ افضل تو صفی: "وہ لاہور کا احمد تہم قاسمی تھا"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 375
- 11۔ محمد اظہار الحق: "یہ فقط میرا تخلیق ہی نہیں ہے"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 413
- 12۔ جاوید اختر چوہدری: "قاسمی صاحب کے نام"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 419
- 13۔ ڈاکٹر ہارون الرشید قسیم: "ہم سے روٹھ گئے"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 424
- 14۔ بشری اعجاز: "یاد میں"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 436
- 15۔ رؤف ظفر: "احمد تہم قاسمی کو اہل قلم کا خراج عقیدت"۔ روزنامہ "جنگ" لاہور۔ 14 جولائی 2006ء
- 16۔ منشا عیاد: "احمد تہم قاسمی کے فسانے"۔ سرمایہ "ادبیات" اسلام آباد۔ خصوصی شمارہ۔ دسمبر 2006ء۔ ص 85
- 17۔ محمد حمید شاہد: "احمد تہم قاسمی، تخلیقی بنیادیں"۔ سرمایہ "ادبیات" اسلام آباد۔ خصوصی شمارہ۔ دسمبر 2006ء۔ ص 191
- 18۔ ڈاکٹر فضل کریم: "قاسمی صاحب کی سائنسی علوم میں دلچسپی"۔ سرمایہ "ادبیات" اسلام آباد۔ خصوصی شمارہ۔ دسمبر 2006ء۔ ص 206
- 19۔ انتظار حسین (ترجمہ آصف فرخی): "ما قابل تلافی نقصان"۔ (نیا) "مذہبِ تہم"۔ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی۔ 2006ء۔ ص 85
- 20۔ محمد ایوب وقف: "احمد تہم قاسمی، دائمی قدر و قیمت کے شاعر"۔ مفت روزہ "ہماری زبان"۔ نئی دہلی۔ جنوری 2008ء۔ ص 21
- 21۔ جاوید اختر چوہدری: "اردو ادب کا ایک اساطیری کردار احمد تہم قاسمی"۔ مفت روزہ "ہماری زبان"۔ نئی دہلی۔ جنوری 2008ء۔ ص 23
- 22۔ محمد خالد اختر: "ایک آدمی احمد شاہ نامی"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 29
- 23۔ محمد ارشاد: "احمد تہم قاسمی"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 56
- 24۔ پروفیسر فتح محمد ملک: "کون کہتا ہے کہ موت آئے گی تو مر جاؤں گا"۔ "مذہبِ تہم"۔ ص 78

- 25۔ جمیل ملک: ”مدتیم کی شاعری۔ فکر، فن، شخصیت“۔ نوید پبلیشرز راولپنڈی۔ 1972ء۔ ص 356
- 26۔ عبداللہ جاوید: ”کچھ یادیں، کچھ باتیں“۔ ”مدتیم“۔ ص 96-97
- 27۔ اطہر رضوی: ”دریا سمندر سے جا ملا“۔ ”مدتیم“۔ ص 250
- 28۔ انجم جاوید: ”احمد مدتیم قاسمی۔ لچند شاعر“۔ ”مدتیم“۔ ص 304
- 29۔ آفتاب اقبال شمیم: ”احمد مدتیم قاسمی۔ ایک تحریک، ایک تنظیم“۔ ”مدتیم“۔ ص 378
- 30۔ ناصر بشیر: ”قاسمی کہانی“۔ ”مدتیم“۔ ص 448
- 31۔ ڈاکٹر محمد آصف قادری: ”مزامتی رویوں کی تحقیق و تنقید“۔ ”مدتیم“۔ ص 318-335
- 32۔ اکرام بریلوی: ”احمد مدتیم قاسمی کی یاد میں“۔ ”سرمایہ“۔ انٹرنیشنل 2008ء۔ ص 260
- 33۔ شبیر احمد قادری: ”انسان دوست۔ احمد مدتیم قاسمی کی فکر کی نمایاں جہت“۔ ”سرمایہ“۔ انٹرنیشنل 2008ء۔ ص 192
- 34۔ طلعت اشارت: ”ایک دیا اور بجھا“۔ ”سرمایہ“۔ انٹرنیشنل 2008ء۔ ص 260
- 35۔ ڈاکٹر نازید قاسمی: ”مدتیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“۔ ”سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2002ء۔ ص 81-83
- 36۔ جلیل عالی: ”مدتیم کی شعری وارثات کی معنوی جہتیں“۔ ”ادبیات“۔ اسلام آباد۔ دسمبر 2006ء۔ ص 124
- 37۔ عزیز حامد فی: ”احمد مدتیم قاسمی کی شاعری“۔ (نیا) ”مدتیم نامہ“۔ وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی۔ 2002ء۔ ص 178-182
- 38۔ پروفیسر قیصر حفیظی: ”ایک بڑا انسان۔ ایک بڑا تخلیق کار“۔ ”مدتیم“۔ ص 270
- 39۔ کشمیری لال ذاکر: ”میرا آخری ساتھی۔ شمسایہ دار“۔ ”ہماری زبان“۔ نئی دہلی 2008ء۔ ص 5
- 40۔ احمد حمدانی: ”شاعر بالغ نظر“۔ ”احمد مدتیم قاسمی“۔ (نیا) ”مدتیم نامہ“۔ وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی۔ 2006ء۔ ص 188-209
- 41۔ افتخار عارف: ”زند لفظ“۔ (نیا) ”مدتیم نامہ“۔ وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی۔ 2006ء۔ ص 114-115
- 42۔ احمد مدتیم قاسمی: ”مرتب کی طرف سے“۔ ”منٹو کے خطوط کے نام“۔ کتاب نمار اوپنڈی۔ 1962ء۔ ص 5
- 43۔ سعادت حسن منٹو: ”آخر شیرانی کے نام خط“۔ ”منٹو کے خطوط“۔ کتاب نمار اوپنڈی۔ 1962ء۔ ص 9-10
- 44۔ سعادت حسن منٹو: ”مدتیم کے نام خط“۔ ”منٹو کے خطوط مدتیم کے نام“۔ کتاب نمار اوپنڈی۔ 1962ء۔ ص 11-12
- 45۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”مدتیم“۔ ص 21-29
- 46۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ: ”رائے“۔ ”مدتیم“۔ ص 72
- 47۔ حیات نظامی: ”مدتیم ارض و سما کا شاعر“۔ ”مدتیم“۔ ص 90
- 48۔ عبداللہ جاوید: ”احمد مدتیم قاسمی کچھ یادیں“۔ ”مدتیم“۔ ص 98
- 49۔ پروفیسر سجاد شہ: ”مدتیم کے افسانوں کا جائزہ اور تجزیاتی مطالعہ“۔ ”مدتیم“۔ ص 113-117
- 50۔ پروفیسر قیصر حفیظی: ”ایک بڑا انسان۔ ایک بڑا تخلیق کار“۔ ”مدتیم“۔ ص 275
- 51۔ افضل تو صیف: ”وہ لاہور کا احمد مدتیم قاسمی تھا“۔ ”مدتیم“۔ ص 376

- 52۔ آفتاب اقبال شمیم: ”احمد تیم قاسمی - ایک تحریک، ایک تنظیم“۔ ”مذہب تیم“ ص 377
- 53۔ زاہدہ حنا: ”شہر ادب میں سنا“۔ ”مذہب تیم“ ص 403
- 54۔ بشری اعجاز: ”احمد تیم قاسمی کی یاد میں“۔ ”مذہب تیم“ ص 436
- 55۔ پروفیسر نعیم مسعود: ”جب تیرا حکم ملا!“۔ ”مذہب تیم“ ص 478
- 56۔ گوینلاگل: ”صہبہ تیم“۔ ”مذہب تیم“ ص 489
- 57۔ طاہرہ اقبال: ”لفظوں کا کوزہ گر“۔ ”مذہب تیم“ ص 282
- 58۔ فوزیہ اختر: ”احمد تیم قاسمی کی افسانہ نگاری“۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008 ص 288
- 59۔ الطاف فاطمہ: ”احمد تیم قاسمی“۔ سرمای ”ادبیات“ اسلام آباد (خصوصی شمارہ)۔ دسمبر 2006 ص 70
- 60۔ ڈاکٹر سعادت سعید: ”حقیقت نگاری یا جدلیاتی نثر“۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008 ص 84
- 61۔ انتظار حسین (ترجمہ: آصف فرخی): ”نا قابل تلافی نقصان“۔ (نیا) ”مذہب تیم نامہ“ کراچی۔ 2006 ص 85
- 62۔ سید وقار عظیم: ”مذہب تیم کے افسانے سنانا کے بعد“۔ ”مذہب تیم نامہ“ (محمد طفیل اور شیر موجد) لاہور 1972 ص 277-290
- 63۔ ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری: ”احمد تیم قاسمی اور اردو افسانہ“۔ ”مذہب تیم نامہ“ (محمد طفیل اور ب شیر موجد) لاہور 1976 ص 292-317
- 64۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”اردو افسانہ نگاری میں مذہب تیم کا مقام“۔ سرمای ”ادبیات“ اسلام آباد (خصوصی شمارہ)۔ دسمبر 2006 ص 28
- 65۔ ڈاکٹر گلگیر الرحمن: ”احمد تیم قاسمی - ایک لہجہ“۔ ”اساطیر“ لاہور۔ 2003 ص 9-12
- 66۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ”قومی شعور کے داعی احمد تیم قاسمی“۔ (نیا) ”مذہب تیم نامہ“ کراچی۔ 2006 ص 116
- 67۔ مسعود اشعر: ”آخری ملاقات“۔ ”مذہب تیم“ ص 45
- 68۔ حیات نظامی: ”مذہب تیم ارض و سما کا شاعر“۔ ”مذہب تیم“ ص 90
- 69۔ اطہر رضوی: ”دریا سمندر سے جا ملا“۔ ”مذہب تیم“ ص 251
- 70۔ ڈاکٹر صابر آفاقی: ”قاسمی صاحب“۔ بہ حوالہ روزنامہ ”جموں کشمیر“ مظفر آباد، جولائی 2006۔ ”مذہب تیم“ ص 387
- 71۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم: ”ہم سے روٹھ گئے“۔ ”مذہب تیم“ ص 423
- 72۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”احمد تیم قاسمی - شاعر اور افسانہ نگار“۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 2007 ص 39-97-109
- 73۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”اردو افسانہ نگاری میں مذہب تیم کا مقام“۔ سرمای ”ادبیات“ اسلام آباد۔ (خصوصی شمارہ)۔ دسمبر 2006 ص 30
- 74۔ ڈاکٹر محمد آصف قادری: ”احمد تیم قاسمی کی شاعری میں مزاحمتی رویہ“۔ ”مذہب تیم“ ص 335
- 75۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ”بے مثال احمد تیم قاسمی“۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008 ص 47
- 76۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”مذہب تیم“ ص 29-30

- 77۔ ایوب خاور: ”کپاس کا پھول“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 226
- 78۔ مجتبیٰ حسین: ”احمد تہم قاسمی“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 364
- 79۔ افتخار مجاز: ”یہ تھے قاسمی صاحب!“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 424
- 80۔ ظفر اقبال: ”مذہبِ تہم صاحب“۔ سرمایہ ”معاصر“ انٹرنیشنل، 2008۔ ص 70
- 81۔ علی تنہا: ”ادبی تربیت۔ اور جنوبی پنجاب“۔ سرمایہ ”معاصر“ انٹرنیشنل، 2008۔ ص 106
- 82۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی: ”قاسمی صاحب“۔ سرمایہ ”معاصر“ انٹرنیشنل، 2008۔ ص 82
- 83۔ انتظار حسین: ”نا قابلِ تلافی نقصان“۔ (نیا) ”مذہبِ تہم نامہ“۔ کراچی۔ 2006۔ ص 85
- 84۔ ڈاکٹر عبدالغفار کوکب: ”افکارِ مذہبِ تہم نمبر سے ماخوذ۔۔ زندگی شخصیت اور فن کا جائزہ“۔ ماہنامہ ماہ نو“ لاہور۔ جولائی 2007۔ ص 14-18
- 85۔ نصر اللہ خان: ”قاسمی صاحب کی کالم نگاری“۔ ”ماہنامہ ”افکار“ کراچی۔ مذہبِ تہم نمبر۔ ص 454-455
- 86۔ وقار انبالوی: ”قاسمی۔ بطور مزاح نگار“۔ ”مذہبِ تہم نامہ“۔ لاہور ملتان۔ 1976۔ ص 320-323
- 87۔ ظفر مجی الدین: ”اردو کالم نگاری کے مردِ بزرگ“۔ (نیا) ”مذہبِ تہم نامہ“۔ کراچی۔ 2006۔ ص 217
- 88۔ احمد تہم قاسمی: ”میری صحافتی زندگی کا خاکہ“۔ سرمایہ ”عبارت“ حیدرآباد۔ 1997۔ ص 272
- 89۔ خاور نقوی: ”رائے“۔ سرمایہ ”فتون“ لاہور۔ دسمبر 1996۔ ص 312
- 90۔ حیات نظامی: ”مذہبِ تہم، ارض و سما کا شاعر“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 90
- 91۔ الطاف حسین قریشی: ”ایک عہد ساز شخصیت کے انمنٹ نقوش“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 368
- 92۔ اشفاق احمد: ”نعت نگار احمد تہم قاسمی“۔ ”مٹی کا سمندر“ (مرتب ضیاء ساجد)۔ دسمبر 1991۔ ص 545
- 93۔ یسین قمر: ”درمچکا جب آئے تو صدا دیتا ہے“۔ ماہنامہ ”نیاض“ لاہور۔ نومبر 2006۔ ص 152
- 94۔ خاور نقوی: ”پورے قد سے کھڑا ہوں“۔ سرمایہ ”ادبیات“ اسلام آباد (خصوصی شمارہ) دسمبر 2006۔ ص 174
- 95۔ احمد تہم قاسمی: ”پس الفاظ“۔ ”اساطیر“ لاہور 2003۔ ص 10-11
- 96۔ محمد ارشاد: ”احمد تہم قاسمی“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 55
- 97۔ ڈاکٹر کلیل الرحمن: ”احمد تہم قاسمی اور غالب“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 59-61
- 98۔ ڈاکٹر سلیم اختر: ”حریت فکر کا داعی۔ احمد تہم قاسمی“۔ سرمایہ ”معاصر“ لاہور 2008۔ ص 62
- 99۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”اپنی مٹی کی خوشبو“۔ احمد تہم قاسمی۔ شاعر اور افسانہ نگار“۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ 2007۔ ص 32
- 100۔ احمد تہم قاسمی: ”ہم سفر“۔ ”اساطیر“ لاہور 2002۔ ص 8-9
- 101۔ عامر سہیل: ”احمد تہم قاسمی کی۔ میرے ہم سفر“۔ ”مذہبِ تہم“۔ ص 285-288
- 102۔ منصورہ احمد: ”میری رائے میں۔۔ میرے ہم سفر“۔ ”اساطیر“ لاہور۔ 2002۔ ص 11



- 103۔ ڈاکٹر ماہد قاسمی: ”پیش لفظ۔ میرے ہم قدم“۔ احمد تیم قاسمی۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007ء۔ ص 7-10
- 104۔ ڈاکٹر انوار احمد: ”احمد تیم قاسمی کی خاکہ نگاری یا خودنوشت کے اوراق“۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل 2008ء۔ ص 89-93
- 105۔ احمد تیم قاسمی: انٹرویو۔ گلزار جاوید۔ ”عالمی اردو ادب“۔ 1996ء۔ ص 52
- 106۔ احمد تیم قاسمی: ”سجاد ورنیازی“۔ ”میرے ہم سفر“۔ ”اساطیر“ لاہور 2002ء۔ ص 203-204
- 107۔ احمد تیم قاسمی: ”چند یادیں“۔ ”علم اردو ادب“۔ دہلی۔ 1996ء۔ ص 25-26
- 108۔ اسلام شاہ: ”احمد تیم قاسمی“ (ریڈیو کا تعزیتی پروگرام)۔ ”مذہب تیم“۔ ص 427
- 109۔ پروفیسر سلیم الرحمن: ”احمد تیم قاسمی کا فلم سفر“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 200
- 110۔ ڈاکٹر ماہد قاسمی: ”احمد تیم قاسمی کا سکرین پلے برائے آغا گل“۔ سرمای ”سورج“ لاہور۔ جون 2008ء۔ ص 105-204
- 111۔ ڈاکٹر حسن وقار گل: سوانحی خاکہ۔ احمد تیم قاسمی ایک نظر میں“۔ (نیا) ”مذہب تیم نامہ“۔ کراچی۔ 2006ء۔ ص 49
- 112۔ محمد خالد اختر: ”ایک آدمی، احمد شاہ نامی“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 23
- 113۔ اولیس نصیر: ”روشنی کا مینار“۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008ء۔ ص 182
- 114۔ سمیل احمد۔ ”شوہر“۔ ”روزنامہ ایکسپریس“۔ 12 جولائی 2006ء
- 115۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی: ”خطوط احمد تیم قاسمی“۔ ادارہ ادب و تنقید۔ لاہور۔ 1995ء۔ ص 9
- 116۔ ڈاکٹر شمس الرحمن: ”قاسمی صاحب“۔ (نیا) ”مذہب تیم نامہ“۔ کراچی۔ 2006ء۔ ص 81
- 117۔ خورشید ربانی: ”آدھی ملاقات“ (مرتب خطوط)۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ 2007ء۔ 7-9
- 118۔ پروفیسر فتح محمد ملک: ”مکاتیب تیم۔ آدھی ملاقات“۔ ماہنامہ ”اخبار اردو“ اسلام آباد۔ مئی 2008ء۔ ص 47
- 119۔ خواجہ عبدالرحمن طارق: ”احمد تیم قاسمی بنام مشفق خواجہ“۔ سرمای ”سورج“ لاہور۔ جون 2008ء۔ ص 33
- 120۔ ڈاکٹر ماہد قاسمی: ”گفت گو“ (افضال رحمان)۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008ء۔ ص 303
- 121۔ ڈاکٹر ماہد قاسمی: ”گفت گو“ (علی اصغر عباس)۔ سرمای ”معاصر“ انٹرنیشنل۔ 2008ء۔ ص 308
- 122۔ آفتاب اقبال شمیم: ”مذہب تیم۔ ایک تحریک، ایک تنظیم“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 378
- 123۔ محمد کاظم: ”ایک تعلق کی یاد میں“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 32
- 124۔ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا: ”رائے“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 491
- 125۔ افضل تو صیف: ”وہ لاہور کا احمد تیم قاسمی تھا“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 375
- 126۔ شبنم شکیل: ”ہے مگر رلب ساقی پہ“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 379
- 127۔ حیات نظامی: ”مذہب تیم ارض و سما کا شاعر“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 88-90
- 128۔ عبداللہ جاوید: ”کچھ یادیں“۔ ”مذہب تیم“۔ ص 92



- 129۔ ڈاکٹر صابر آفاقی: ”قاسمی صاحب“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 387
- 130۔ پروفیسر حسن عسکری: ”میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 391
- 131۔ اصغر ندیم سید: ”خراج عقیدت“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 494
- 132۔ صلاح الدین حیدر: ”بیسویں صدی کا ایک قد آور شخص۔ ندیم“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 180
- 133۔ اکبر جمیدی: ”ندیم عصر۔ احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 207
- 134۔ محمد سعید شیش: ”احمد ندیم قاسمی کی یاد میں“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 217
- 135۔ رفعت مرتضیٰ: ”وقت کب سنتا ہے“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 183
- 136۔ امجد اسلام امجد: ”احمد ندیم قاسمی، لچنڈ شاعر“۔ مضمون، انجم جاوید۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 302
- 137۔ عطا الحق قاسمی: ”سورج ڈوب گیا؟“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 400
- 138۔ عارف شفیق: ”ممتاز شاعر: احمد ندیم قاسمی“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 432
- 139۔ سعید پرویز: ”کون کہتا ہے کہ موت آتی تو مر جاؤں گا“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 474
- 140۔ جمیل الدین عالی: ”آخری آدمی“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 360
- 141۔ طاہرہ اقبال: ”تاثرات“۔ ”سرمائی ادبیات“ اسلام آباد۔ (خصوصی شمارہ) دسمبر 2006۔ ص 179
- 142۔ محمد ایوب واقف: ”دائمی قدر و قیمت کا شاعر۔ احمد ندیم قاسمی“۔ ”نفت روزہ“ ہماری زبان“ نئی دہلی۔ جنوری 2008۔ ص 21
- 143۔ علی اصغر عباس: ”قاسمی صاحب“۔ ”ماہنامہ ماہ نو“۔ لاہور جولائی 2007۔ ص 25
- 144۔ مسعود اشعر: ”ندیم صاحب“۔ ”ماہنامہ افکار“ کراچی۔ ”ندیم نمبر“۔ جنوری 1945۔ ص 160
- 145۔ ڈاکٹر ابرار احمد: ”احمد ندیم قاسمی۔ ایک مستقل مزاج مدیر“۔ ”سرمائی ادبیات“ اسلام آباد۔ (خصوصی شمارہ) دسمبر 2006۔ ص 156-157
- 146۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی: ”قاسمی صاحب“۔ (نیا) ”ندیم نامہ“۔ کراچی۔ 2006۔ ص 81
- 147۔ انتظار حسین: ”ناقابلِ تلافی نقصان“۔ (نیا) ”ندیم نامہ“۔ کراچی۔ 2006۔ ص 85
- 148۔ پروفیسر قیصر حفیظ: ”ایک بڑا انسان۔ ایک بڑا تخلیق کار“۔ ”مذہبِ ندیم“۔ ص 275

## کتابیات

- 01۔ احمد غزالی۔۔۔۔۔ ”وادی سون بیکسر“۔۔۔۔۔ فیروز سنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ 1993
- 02۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”بھڑکنیں“ (قطعات)۔۔۔۔۔ دارالاشاعت۔ پنجاب۔ لاہور۔ 1941
- 03۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”رم جہم“ (قطعات و رباعیات)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 04۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”جلال و جمال“ (مجموعہ کلام)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 05۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”تھعلہ نگل“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 06۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”شب و فا“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 07۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”محیط“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 08۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”دوام“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 09۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”لوح خاک“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 10۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”ہیٹھ“ (شاعری)۔۔۔۔۔ اساطیر۔ لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 11۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”ارض و سما“ (شاعری)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ پہلا ایڈیشن۔ 2006
- 12۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”انوار جمال“ (حمد، نعت، سلام)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 13۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”چوپال“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ نیا ایڈیشن۔ 2007
- 14۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”گولے“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 15۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”طلوع و غروب“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 16۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”سیلاب و گرداب“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 17۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”آئینہ“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 18۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”آبلے“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 19۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”آس پاس“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 20۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”درو دیوار“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 21۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”سناٹا“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 22۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”بازار حیات“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 23۔ احمد نعیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”ہرگ جتا“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007

- 24۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”گھر سے گھر تک“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 25۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”کپاس کا پھول“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 26۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”نیلا پتھر“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 27۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”کوہ پیا“ (افسانے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 28۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”پت جھڑ“ (افسانے، ناولٹ، آخری مجموعہ)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 29۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”منمنو کے خطوط مدیم کے نام“۔۔۔۔۔ ”کتاب نما“ راولپنڈی۔ 1994
- 30۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”ادب اور تعلیم کے رشتے“۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 31۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”پس الفاظ“ (تنقید)۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور۔ 2003
- 32۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”تہذیب و فن“ (تنقید)۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور۔ نیا ایڈیشن
- 33۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”معنی کی تلاش“ (تنقید)۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور۔ 2002
- 34۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”میرے ہم سفر“ (سوانحی خاکے)۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور
- 35۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”میرے ہم قدم“ (سوانحی خاکے)۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ 2007
- 36۔ احمد تیم قاسمی۔۔۔۔۔ ”کیسریا کیاری“ (فکاهی کالم)۔۔۔۔۔ شفیق پبلی کیشنز لاہور۔ 1999
- 37۔ (ڈاکٹر) اسلم فرخی۔۔۔۔۔ ”(نیا) مدیم نامہ“۔۔۔۔۔ وفاقی اردو یونیورسٹی۔ کراچی۔ 2006
- 38۔ امیر حسین چمن۔۔۔۔۔ ”ملاقات و حکایات“ (انٹرویو)۔۔۔۔۔ پرنٹ میڈیا پبلی کیشنز۔ راولپنڈی۔ 2001
- 39۔ (پروفیسر) جمیل ملک۔۔۔۔۔ ”مدیم کی شاعری“ (تنقید و تجزیہ) نوید پبلی کیشنز۔ راولپنڈی۔ 1976
- 40۔ خورشید ربانی۔۔۔۔۔ ”آدھی ملاقات“ (مرتب خطوط)۔۔۔۔۔ پورب اکادمی اسلام آباد۔ 2007
- 41۔ سید احمد مدنی۔۔۔۔۔ ”ادبیات سلطان باہو“ (تراجم) العارفین پبلی کیشنز، جوہر آباد، خوشاب۔ 2001
- 42۔ شہزاد ظہیر۔۔۔۔۔ ”علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ“۔۔۔۔۔ منظر پبلی کیشنز۔ کراچی۔ 1990
- 43۔ ضیاء اساجد۔۔۔۔۔ (مرتب) ”مٹی کا سمندر“۔۔۔۔۔ مکتبہ انقریش۔ لاہور۔ 1991
- 44۔ (ڈاکٹر) عبادت بریلوی۔۔۔۔۔ ”خطوط احمد تیم قاسمی“۔۔۔۔۔ اردو ادب و تنقید لاہور۔ 1995
- 45۔ (ڈاکٹر) عبدالسلام خورشید۔۔۔۔۔ ”کاروان صحافت“۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ 1964
- 46۔ (پروفیسر) فتح محمد ملک۔۔۔۔۔ ”احمد تیم قاسمی۔ شاعر اور افسانہ نگار“۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ 1991
- 47۔ (پروفیسر) فتح محمد ملک۔۔۔۔۔ ”تخصیبات“۔۔۔۔۔ مکتبہ فنون۔ لاہور۔ 1973
- 48۔ فیض احمد فیض۔۔۔۔۔ ”میزان“۔۔۔۔۔ ناشرین۔ لاہور۔ 1962
- 49۔ محمد طفیل، بشیر موجد۔۔۔۔۔ (مرتب) ”مدیم نامہ“۔۔۔۔۔ مجلس ارباب فن۔ ملتان لاہور۔ 1976
- 50۔ منصورہ آفاق، منصورہ احمد۔۔۔۔۔ ”گل پاشی“۔۔۔۔۔ اساطیر لاہور۔ 1996
- 51۔ (ڈاکٹر) ناہید قاسمی۔۔۔۔۔ جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری“۔۔۔۔۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔ 2003

- 52۔ (ڈاکٹر) ناہید قاسمی۔۔۔۔۔ ”مدتیم غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ“۔۔۔۔۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ 2002
- 53۔ (ڈاکٹر) ناہید قاسمی۔۔۔۔۔ ”صبح صدر رنگ مدتیم“۔۔۔۔۔ (مضامین) سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ 2016

## رسائل:

- 01۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”آگہی“۔۔۔۔۔ کراچی۔ جون 1993
- 02۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”ادب سرائے“۔۔۔۔۔ لاہور۔ ستمبر 2007
- 03۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”ادبیات“۔۔۔۔۔ اسلام آباد۔ ”مخصوصی شمارہ“۔ دسمبر 2006
- 04۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”ادبیات“۔۔۔۔۔ اسلام آباد۔ جولائی 2007
- 05۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”افکار“۔۔۔۔۔ کراچی۔ ”مدتیم نمبر“۔ جنوری 1975
- 06۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”اخبار اردو“۔۔۔۔۔ اسلام آباد۔ مئی 2008
- 07۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”بیاض“۔۔۔۔۔ لاہور
- 08۔ (مجلد)۔۔۔۔۔ ”نثر“۔۔۔۔۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔ 2004
- 09۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”سورج“۔۔۔۔۔ لاہور۔ جون 2008
- 10۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“۔۔۔۔۔ لاہور
- 11۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”عالمی اردو ادب“۔۔۔۔۔ دہلی۔ ”مدتیم نمبر“۔ 1997
- 12۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”فنون“۔۔۔۔۔ لاہور (126 شمارے)۔ 1963 تا 2006
- 13۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”قومی زبان“۔۔۔۔۔ کراچی۔ مارچ 2008
- 14۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”ماہ نو“۔۔۔۔۔ لاہور۔ فروری 1987
- 15۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”ماہ نو“۔۔۔۔۔ لاہور۔ جولائی 2007
- 16۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”معاصر“۔۔۔۔۔ لاہور (انٹرنیشنل)۔ ”مدتیم نمبر“۔ 2008
- 17۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”مومنات“۔۔۔۔۔ لاہور۔ ”مدتیم نمبر“۔ شمارہ 1-2۔ 2007
- 18۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”نقوش“۔۔۔۔۔ لاہور۔ بہت سے شمارے
- 19۔ (سرماہی)۔۔۔۔۔ ”نئی عبارت“۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔ مدتیم ایڈیشن۔ 1996
- 20۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”نئی قدریں“۔۔۔۔۔ حیدرآباد۔ شمارہ 5-6۔ 1979
- 21۔ (فہرست روزہ)۔۔۔۔۔ ”ہماری زبان“۔۔۔۔۔ نئی دہلی۔ جنوری 2008
- 22۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”ہمدرد نو نبال“۔۔۔۔۔ کراچی۔ 1997
- 23۔ (ماہنامہ)۔۔۔۔۔ ”مدحت“۔۔۔۔۔ لاہور۔ 2015

☆☆☆

## اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات

(پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی دیگر کتب)

نمبر شمار	نام کتاب	صفحہ	سال اشاعت	قیمت مجلد غیر مجلد	رقعہ
1	مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	1991	120 روپے	-
2	سراغ صدیقی شخصیت اور فن	پایس ادیب	1996	120 روپے	مجم
3	شاہ حسین شخصیت اور فن	ڈاکٹر راشد متین رمونرقوی	1998	95 روپے	-
4	قتیل شغالی شخصیت اور فن	استیدار ڈاکٹر راشد متین	1998	95 روپے	-
5	اشفاق احمد شخصیت اور فن	استیدار محمد حمید شاہد	1998	95 روپے	-
6	لن انثار شخصیت اور فن	استیدار امجد ظہیل	1998	95 روپے	-
7	تخلیر کاظمی شخصیت اور فن	استیدار ڈاکٹر راشد متین	1998	95 روپے	-
8	سرسید احمد خان شخصیت اور فن	جمیل ایسٹ	1998	220 روپے	210 روپے
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2008	220 روپے	210 روپے
9	رشید اختر ندوی شخصیت اور فن	زہد نوحہ ڈاکٹر راشد متین	1999	95 روپے	-
10	نکیم محمد سعید شخصیت اور فن	صادق حسین طارق	1999	40 روپے	-
11	انتمیاض شخصیت اور فن	ڈاکٹر کوہر نوشاہی	1999	40 روپے	-
12	حنیفہ جانہ حری شخصیت اور فن	عزیز ملک	2000	40 روپے	-
13	باقی صدیقی شخصیت اور فن	پروفیسر نجمی صدیقی	2000	40 روپے	-
13a	شاہر ادنا پوری حیات و فن	ڈاکٹر ثار انبی	2004	130 روپے	110 روپے
13b	سلطان باہا حیات و فن	شفیع قتیل	2004	110 روپے	90 روپے
13c	غوث محال خان خلک حیات و فن	خدیجہ فیروز الدین ڈاکٹر اقبال نسیم خلک	2005	270 روپے	350 روپے
14	ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن	رفیق سندیلوی	2006	130 روپے	125 روپے
15	میراجی شخصیت اور فن	ڈاکٹر رشید امجد	2006	140 روپے	135 روپے
16	ایلس بخاری شخصیت اور فن	عبدالحمید اعظمی	2006	145 روپے	140 روپے
17	محمد خالد اختر شخصیت اور فن	اشفاق احمد برک	2006	150 روپے	145 روپے
18	ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن	ڈاکٹر کوہر نوشاہی	2006	115 روپے	110 روپے



19	شریف کجا ہی شخصیت اور فن	زہد حسن	2006	140 روپے	130 روپے	متم
20	میر گل خان نسیم شخصیت اور فن	واحد بخش بڑا دار	2006	150 روپے	140 روپے	
21	فیض احمد فیض شخصیت اور فن	اشفاق حسین	2006	210 روپے	200 روپے	متم
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2008	210 روپے	200 روپے	متم
22	شیخ ایاز شخصیت اور فن	ڈاکٹر فگار بکرو	2006	140 روپے	135 روپے	متم
23	ابوالفضل صدیقی شخصیت اور فن	نذر الرحمن صدیقی	2006	100 روپے	90 روپے	
24	یوسف ظفر شخصیت اور فن	ڈاکٹر صدیق حسین رابع	2006	140 روپے	135 روپے	
25	کاکا بقی صنوبر شخصیت اور فن	حنیف ظہیر	2006	145 روپے	130 روپے	متم
26	مرزا گلچن بیگ شخصیت اور فن	نسیم مرزا	2006	115 روپے	110 روپے	
27	سویجو کیان چندانی شخصیت اور فن	سید مظہر جمیل	2006	200 روپے	190 روپے	متم
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2010	200 روپے	190 روپے	
28	انتظار حسین شخصیت اور فن	ڈاکٹر آصف قریشی	2006	145 روپے	130 روپے	متم
29	منیر نیازی شخصیت اور فن	امجد ظہیر	2006	115 روپے	110 روپے	متم
30	بتال ایاز شخصیت اور فن	منصور علی دیرجو	2006	120 روپے	110 روپے	
31	عبداللہ جان بتال لکھی شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہد حمیری	2006	110 روپے	100 روپے	
32	شوکت صدیقی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انوار احمد	2006	100 روپے	90 روپے	
33	سید بانگی شخصیت اور فن	پروفیسر صبا شتیاری	2006	100 روپے	90 روپے	
34	شہد احمد دہلوی شخصیت اور فن	نانق بیگم قریشی	2006	180 روپے	175 روپے	
35	لوہنغری شخصیت اور فن	شہد حسن	2007	120 روپے	115 روپے	متم
36	آمل ملک شخصیت اور فن	عبداللہ جان عالم	2007	200 روپے	190 روپے	متم
37	سید ارشد شاہ شخصیت اور فن	حمید اللہ بانگی	2007	130 روپے	120 روپے	متم
38	احمد راجی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مایہ شاہد	2007	160 روپے	150 روپے	متم
39	پروفیسر شاکر شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلطان بخش	2007	145 روپے	135 روپے	متم
40	محمد حسن عسکری شخصیت اور فن	عزیزہ انیس الحسن	2007	155 روپے	140 روپے	
41	جانباز رحمتی شخصیت اور فن	حمید اللہ ملتغانی	2007	175 روپے	165 روپے	متم
42	ڈاکٹر جمیل جالبی شخصیت اور فن	عبدالعزیز ساحر	2007	160 روپے	150 روپے	متم
43	رہمان بابا شخصیت اور فن	ڈاکٹر پروفیسر محبوب چیمکھی	2007	185 روپے	175 روپے	
44	عطا شاہ شخصیت اور فن	آمنش مرلو	2007	165 روپے	155 روپے	



72	مجید امجد شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	2008	170 روپے	160 روپے	
73	بانو قدسیہ شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2008	300 روپے	290 روپے	متم
74	نہم۔ راشد شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2008	220 روپے	210 روپے	متم
75	مشاق احمد یحییٰ شخصیت اور فن	طارق حبیب	2008	260 روپے	250 روپے	متم
76	رضاء الدینی شخصیت اور فن	ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار	2008	240 روپے	230 روپے	
77	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر شخصیت اور فن	محمد بنید اکرم	2008	210 روپے	200 روپے	
78	تمیل الدین عالی شخصیت اور فن	نہیم رضا اقبال	2008	210 روپے	200 روپے	
79	زینون بانو شخصیت اور فن	لاسن یوہری	2008	230 روپے	220 روپے	
80	علامہ اقبال شخصیت اور فن	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	2008	320 روپے	300 روپے	متم
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2018	400 روپے	380 روپے	
	ایضاً (سندھی ترجمہ)	مترجم منظور علی دسریر	2010	450 روپے	430 روپے	
	ایضاً (پشتو ترجمہ)	مترجم امجد رفیق	2010	450 روپے	400 روپے	
81	فرزبان شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2008	150 روپے	140 روپے	متم
	اشعار و نظم	ایضاً	2009	180 روپے	170 روپے	
82	کشور بید شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین ملتی	2008	150 روپے	140 روپے	متم
83	مخدوم طالب المولیٰ شخصیت اور فن	سید احمد علی شاہ	2008	190 روپے	180 روپے	متم
84	عبداللہ صہین شخصیت اور فن	محمد عاصم بٹ	2008	160 روپے	140 روپے	متم
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2016	280 روپے	250 روپے	
85	احمد شمیم شخصیت اور فن	منیر وحید	2008	220 روپے	210 روپے	
86	ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر شخصیت اور فن	شبلم کلیل	2008	-	-	متم
87	احمد تیم قاسمی شخصیت اور فن	ڈاکٹر تابید قاسمی	2009	390 روپے	380 روپے	
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2018	440 روپے	420 روپے	
88	حبیب جالب شخصیت اور فن	سعید پرویز	2009	280 روپے	270 روپے	متم
	ایضاً (اشعار و نظم)	ایضاً	2010	280 روپے	270 روپے	
89	افتخار عارف شخصیت اور فن	ڈاکٹر عبدالعزیز سار	2009	275	250 روپے	
90	محمد عثمان ڈنڈائی شخصیت اور فن	آفاق صدیقی	2009	160 روپے	150 روپے	
91	انیس ماسی شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین ملتی	2009	250 روپے	230 روپے	متم
92	علامہ نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر حفیظ شاہین	2009	220 روپے	210 روپے	

93	استاد دامن شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2009	190 روپے	180 روپے
94	اقبال ساحر شخصیت اور فن	ڈاکٹر جواد جعفری	2010	240 روپے	235 روپے
95	خیر النساء جعفری شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنویر جو نیو	2010	230 روپے	220 روپے
96	عطارد الحق قاضی شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	2010	320 روپے	310 روپے
97	سید آل رضا شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید محمد تقوی	2010	290 روپے	280 روپے
98	عرش صدیقی شخصیت اور فن	نہیم نظر فقا ر	2010	220 روپے	210 روپے
99	جباب امتیاز علی خان شخصیت اور فن	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	2010	240 روپے	230 روپے
100	خدیجہ مستورا شخصیت اور فن	نانی نہیم فقا ر	2010	210 روپے	200 روپے
101	ڈاکٹر اسلم انصاری شخصیت اور فن	محمد فقا ر شفیق	2010	210 روپے	200 روپے
102	ڈاکٹر انور سدید شخصیت اور فن	پروفیسر سجاد نقوی	2010	400 روپے	390 روپے
103	صہب اختر شخصیت اور فن	ڈاکٹر قمر آمین طاہرہ	2010	250 روپے	240 روپے
104	غلام ثقلین نقوی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	310 روپے	300 روپے
105	مولوی غلام رسول عالی پوری شخصیت اور فن	صاحبزادہ مسعود احمد	2010	450 روپے	400 روپے
106	سلیم احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر عطا راہم عزمی	2010	225 روپے	200 روپے
107	امیر طیل شخصیت اور فن	پروفیسر کے ایس باگپال	2010	180 روپے	ختم
108	فتنایا د شخصیت اور فن	اسلمہ رات الدین	2010	350 روپے	340 روپے
109	ڈاکٹر رشید امجد شخصیت اور فن	ڈاکٹر شفیق انجم	2010	210 روپے	200 روپے
110	پروفیسر غلام نبیلانی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	260 روپے	250 روپے
111	آمنش پریہ شخصیت اور فن	راجہ فکیل انجم	2010	180 روپے	170 روپے
112	مجنوں کھور کچوری شخصیت اور فن	بیال نقوی	2010	190 روپے	180 روپے
113	شیخ سر عبدالقادر شخصیت اور فن	ڈاکٹر قمر آمین طاہرہ	2012	260 روپے	250 روپے
114	شیر اداس شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2012	270 روپے	260 روپے
115	فرخندہ لوڈھی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2012	310 روپے	300 روپے
116	صوفی شاہ عثمانیت شہید شخصیت اور فن	منظور علی دیرجو	2012	210 روپے	200 روپے
117	بلجہ شاہ شخصیت اور فن	حمید اللہ بانجی	2012	260 روپے	250 روپے
118	ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین ملقی	2015	370 روپے	350 روپے
119	عزیز احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر اعجاز ضیف	2015	240 روپے	220 روپے
120	مولانا طاف حسین حالی شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید عطاء احمد رضوی	2015	330 روپے	320 روپے

121	سید نصیر شاہ شخصیت اور فن	ڈاکٹر اسد مصطفیٰ	2016	370 روپے	350 روپے
122	احمد بشیر شخصیت اور فن	محمد عظیم چور	2016	260 روپے	240 روپے
123	سید ظہیر حفیظی شخصیت اور فن	ڈاکٹر عرفان اللہ ملک	2017	280 روپے	260 روپے
124	حسرت مہربانی شخصیت اور فن	خورشید ربانی	2017	250 روپے	230 روپے
125	قابل لائبریری شخصیت اور فن	خالد مصطفیٰ	2017	180 روپے	160 روپے
126	ولی محمد طوفان شخصیت اور فن	ڈاکٹر حنیف ظہیر	2017	230 روپے	200 روپے
127	خالد حسین شخصیت اور فن	بی بی امینہ	2017	230 روپے	210 روپے
128	سید وقار عظیم شخصیت اور فن	اسمغندہ جمیل	2017	220 روپے	200 روپے
129	امین صفی شخصیت اور فن	محمد فیصل	2017	250 روپے	220 روپے
130	حفیظ ہوشیار پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر قمر و امین طاہرہ	2017	250 روپے	220 روپے
131	انجم ربانی شخصیت اور فن	کریم زبیب نقوی	2017	220 روپے	200 روپے
132	سلیم راز شخصیت اور فن	روشن بیگم زکی	2018	220 روپے	200 روپے
133	سلیم کوثر شخصیت اور فن	ارشاد نعیم	2018	320 روپے	300 روپے

☆☆☆

کتب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

**میر نواز سولگی**

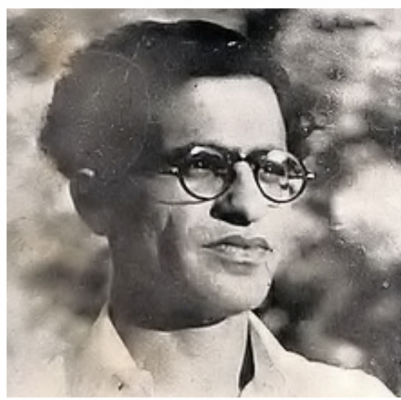
اسٹنٹ ڈائریکٹر (سیلز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ)

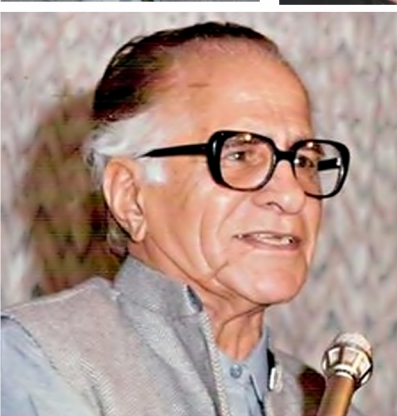
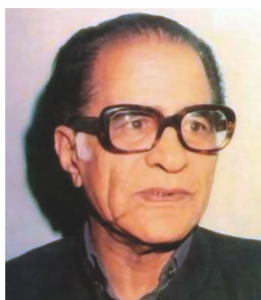
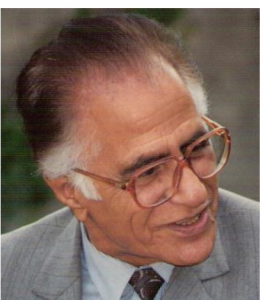
اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ سیکٹر 8/1، اسلام آباد۔

فون: 051-9269711



احمد ندیم قاسمی تصاویر کے آئینے میں









برادر بزرگ بیرونی زاد محمد بخش، احمد ندیم قاسمی



احمد ندیم قاسمی اپنی بیگم راہدندیم کے ساتھ



ظہیر بابر، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی



ظہیر بابر، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر لالہ رش، خدیجہ مستور، آگے پرویز بابر اور کرمان بابر کھڑے ہیں



احمد ندیم قاسمی اپنی بیٹیوں ناہیدہ ندیم اور نشا ندیم کے ساتھ



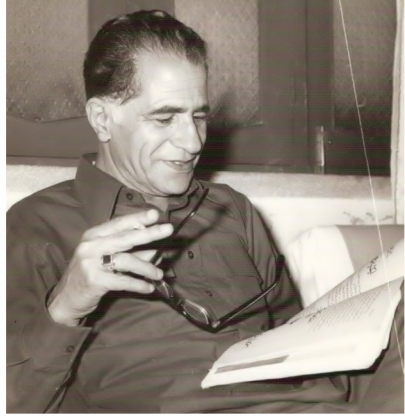
احمد ندیم قاسمی اپنی بیٹی ڈاکٹر ناہیدہ قاسمی کے ساتھ ایک تقریب میں



احمد ندیم قاسمی اپنے نواسے نیر حیات قاسمی کے ساتھ گھیلنے ہوئے



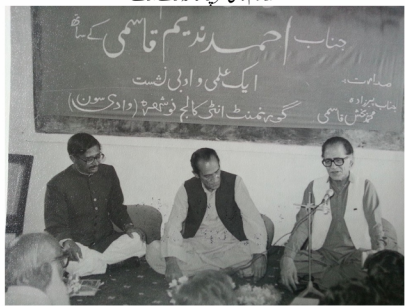
احمد ندیم قاسمی گھر میں لکھتے ہوئے



احمد ندیم قاسمی گھر پر مطالعہ کرتے ہوئے



کراچی میں بابائے اردو عبدالقاسم کی صدارت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں احمد ندیم قاسمی تقریر کرتے ہوئے



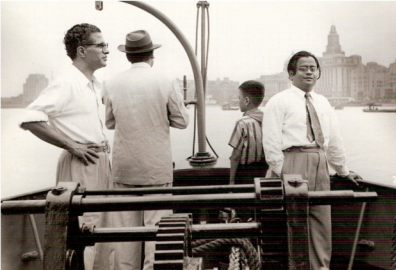
ادبی سونے سکر ٹوشہرہ کے کالج میں تقریب کے دوران احمد ندیم قاسمی، میرزا دو چرخ بخش اور پرنسپل احمد سعید ہمدانی



”ادکار“ کے ”نہم نمبر“ کی افتتاحی تقریب میں



مشاعرے میں امجد اسلام امجد، احمد ندیم قاسمی کے ساتھ



دورہ چین کے دوران کشتی میں سیر کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اور وفد کے ارکان



مشاعرے میں علیرقیش، احمد ندیم قاسمی





(دائیں سے بائیں) احمد ندیم قاسمی، جمید اختر، فیض احمد فیض، سبط حسن



(دائیں سے بائیں) تنزیل مظفر بخاری، محمد خالد اختر، احمد ندیم قاسمی، محمد کاظم، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر یونس جاوید



(دائیں سے بائیں) محمد طفیل، سید مصطفیٰ جعفری، ابن انشاء، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی اور دیگر





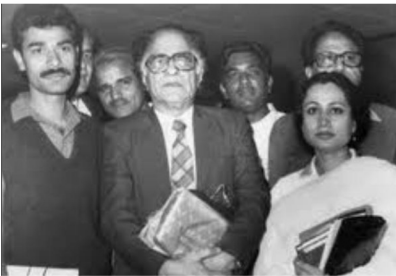
انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام منعقدہ یوم غالب 1950 کے موقع پر (بچے بیٹھے ہوئے دائیں سے) صدر ریمبر، ابراہیم علیس، احمد رای، جاوید قمر، (کریوں پر دائیں سے) سید انور، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، (کھڑے ہوئے دائیں سے) عارف جلالی، عارف عبدالستین، ظہور نظر



حفیظ جانیدھری، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی



انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، عطا الحق قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر



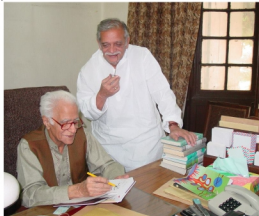
پروین شاہکار اور دیگر احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ



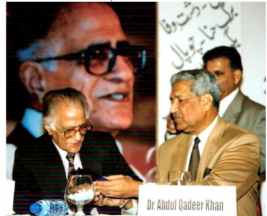
احمد اسلام، احمد ندیم قاسمی، عطا الحق قاسمی



انتظار حسین، منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی



گلزار، احمد ندیم قاسمی کے ساتھ مجلس ترقی ادب کے دفتر میں



ڈاکٹر عبدالقدیر خان، احمد ندیم قاسمی کو ایوارڈ دیتے ہوئے



لاہور پبلک لائبریری پر یادگاری پودا لگاتے ہوئے



احمد ندیم قاسمی دوستوں کے ہمراہ



”دشت وفا“ پر ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد لاہور ایئر پورٹ پر استقبال



رخشود نوید، اے جی جوش، خالد احمد، احمد ندیم قاسمی



منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر صفی صدف، پرویز مہدی، آصف شفیع



احمد ندیم قاسمی اور فیصل احمد فیض



احمد اسلام احمد، شہزاد احمد، احمد ندیم قاسمی، قیس شافعی، عطا الحق قاسمی، ---



--- قیس شافعی، احمد ندیم قاسمی

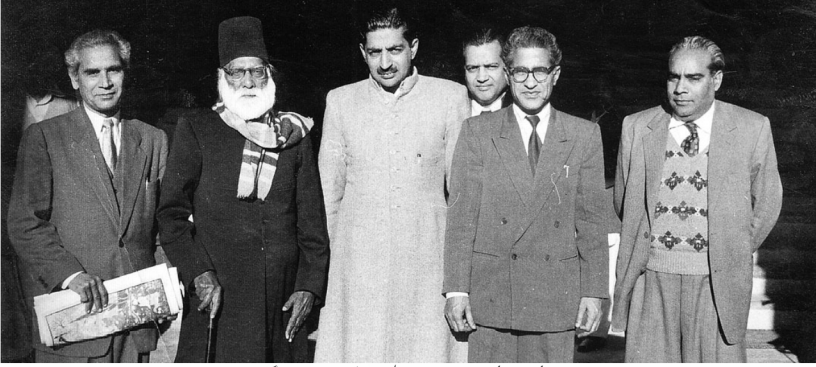


خالد اختر، منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی



شاد زمان کوثر، شفیع سلیمی، احمد ندیم قاسمی، نجم الحسن رضوی، صفیر جعفری





(بائیں سے دائیں) سبط حسن، مولوی عبدالحق، مظہر علی، احمد ندیم قاسمی اور دیگر



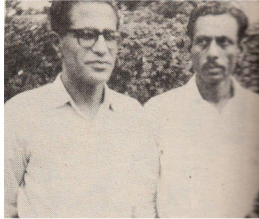
محمد کاظم، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، محمد خالد اختر اور دیگر



روسی ادیب، مصوفی تقسم، احمد ندیم قاسمی، فیصل شفا، خدیجہ مستور



الطاف گوہر، احمد ندیم قاسمی



ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی (دو حاکمیں)



احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز



یوسف حسن، ہیر ظفر اللہ خان، حلیم قریشی، ڈاکٹر محمد قاسم بکھیو اور ڈاکٹر ناہیدہ قاسمی، احمد ندیم قاسمی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں منعقدہ تقریب میں



ڈاکٹر ناہید قاسمی ادب و تحقیق کا معروف نام ہیں۔ آپ نامور شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی بیٹی ہونے کے ساتھ خود بھی ادب کی دنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی وادی سون سکیسر ضلع خوشاب کے گاؤں انگہ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی۔ میٹرک سے ایم۔ اے تک لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ مشہور شاعر ناصر کاظمی پر لکھا۔ باغبانپورہ کالج، اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج سمن آباد میں علمی و تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ گورنمنٹ کالج سمن آباد سے بطور سربراہ شعبہ ریٹائر ہوئیں۔ معروف ادبی مجلہ فنون جس کی ادارت تقریباً 50 سال تک احمد ندیم قاسمی صاحب نے سنبھالی اب ڈاکٹر ناہید قاسمی یہ ذمہ داری احسن انداز سے سنبھال رہی ہیں۔ آپ کی متنوع موضوعات پر کئی کتابیں شائع ہو کر تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ندیم شناسی اور ناصر کاظمی کے حوالے سے آپ کو مستند حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی کی مختلف تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن، ناصر کاظمی: شخصیت اور فن، بنجر دل سیراب کرو، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری، ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ، انوار جمال، احمد ندیم قاسمی منتخب افسانے، احمد ندیم قاسمی منتخب غزلیں اور دیگر شامل ہیں۔

ISBN: 978-969-472-316-7

